اور چنار جلتے رہے
اے حمید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اور چنار جلتے رہے

اے حمید

سنگِ میل پبلی کیشنز ○ لاہور

بادل ۔ گہرے سرمئی بادل !

پہاڑی ڈھلانوں پر پھیلے چیڑھ کے درختوں کو اپنی دھند میں لپیٹتے ہوئے ٹھنڈے بادل ۔ میری بس کوہ مری کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی ۔ میں کوہ مری سے دن ہوتے چلا تھا ۔ راستے میں ایک جگہ بس خراب ہو گئی ۔ کافی دیر وہاں انتظار کرنا پڑا ۔ میری منزل کوہالہ تھی ۔ کوہالہ پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی ۔ دریائے جہلم پہاڑوں کی آغوش میں بڑی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا ۔ دیکھتے دیکھتے آسمان ابر آلود ہو گیا ۔ اکتوبر کی یہ پہاڑی شام بڑی سرد تھی ۔ بس نے ایک پہاڑی کا موڑ کاٹا تو کچھ فاصلے پر مجھے کوہالہ کا تاریخی پل نظر پڑا ۔ میں اسی پل کو دیکھنے کوہالہ جا رہا تھا ۔ یہ وہی پل تھا جس پر ستمبر پینسٹھ کی جنگ میں دشمن کے بمبار جہازوں نے اندھا دھند بم برسائے مگر ایک بھی بم پل پر نہ گر سکا ۔ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے آسمان سے سبز پوش فرشتوں کو اترتے دیکھا تھا ۔ یہ سبز پوش کوہالہ پل پر گرائے جانے والے بموں کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ کر دور دریا میں پھینک دیتے تھے ۔ آج کے خلائی سائنس کے دور میں اس قسم کی افسانوی باتوں پر اعتبار کرنا بہت مشکل ہے ۔ مگر بعض لوگوں نے اخباروں میں بیان دیئے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے آسمان سے سبز پوش فرشتوں کو اترتے اور دشمن کے بمبار طیاروں سے گرتے بموں کو دبوچتے اور دریا میں پھینکتے دیکھا ہے ۔ ایک عرصہ سے میرے دل میں یہ خواہش مچل رہی تھی کہ خود کوہالہ چل کر ان لوگوں سے انٹرویو کیا جائے اور اس افسانے کی حقیقت معلوم کی جائے ۔ جنگ ستمبر کے بعد میں ایک طویل مدت کے لئے ملک سے باہر چلا گیا ۔ مگر سبز پوشوں کا افسانوی کردار مجھ سے الگ نہ ہو سکا ۔ اب واپس آیا تو وقت نکال کر اس تحقیقی سفر پر روانہ ہو گیا ۔ شام کی پہاڑی ابر آلود سرمئی فضا میں بس کوہالہ کے قریب پہنچ گئی تھی ۔ دریا ہماری بائیں جانب تھا ۔

کوہالہ کا پل اب میری نظروں کے سامنے تھا۔ بس چائے کی دکانوں کے پاس جا کر رک گئی۔

اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ اور سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے رین کوٹ یعنی برساتی کا ہڈ سر کے اوپر کر لیا اور کوہالہ کے پہاڑوں کی سردی اور بوندا باندی میں چیڑھ کے درختوں میں جاتی ایک پگ ڈنڈی کی طرف بڑھا۔ یہاں میرے ایک دوست نے فاریسٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک چھوٹے سے ریسٹ ہاؤس میں میری رہائش کا بندوبست کر دیا ہوا تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس چیڑھ کے درختوں کے درمیان ایک ٹیریس پر بنا ہوا تھا۔ چوکیدار میری راہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھا۔ "صاحب آپ لاہور سے آئے ہیں؟"

میں نے اسے اپنا نام بھی بتایا۔ وہ بولا۔

"صاحب! میں تو صبح سے کئی بسیں دیکھ چکا ہوں۔ آپ کو تو دس بجے آنا تھا"۔

میں نے بوڑھے چوکیدار کو بتایا کہ راستے میں بس خراب ہو گئی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کی حالت کافی شکستہ تھی۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ بوڑھے چوکیدار نے آتشدان میں آگ جلا رکھی تھی۔ میں نے رین کوٹ اتار کر آتشدان کے پاس بچھے ہوئے پلنگ پر ڈال دیا اور کرسی آتشدان کے قریب کر لی۔ چوکیدار کہنے لگا۔

"میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتا ہوں صاحب"۔

چوکیدار کے جانے کے بعد میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ لگتا تھا کہ وہاں بہت کم افسران آکر ٹھہرتے ہیں۔ کوہالہ کوئی ایسی مشہور صحت افزا جگہ بھی نہیں تھی۔ دیواروں کا پلستر کئی جگہوں سے اکھڑا ہوا تھا۔ کارنس کے اوپر قائداعظم کی فریم کی ہوئی تصویر لگی تھی۔ کونے میں چھوٹی میز پر پانی سے بھرا ہوا جگ اور شیشے کا گلاس رکھا تھا۔ پلنگ پر بستر ضرور صاف ستھرا تھا۔ بھاری لحاف پر سفید غلاف چڑھا ہوا تھا۔ آتشدان میں اتنی آگ نہیں جل رہی تھی کہ جس سے سارے کمرے کی ٹھنڈ ختم ہو جاتی۔ بس آتشدان کے قریب ہی گرمائش تھی۔

پلنگ کی پائینتی کی جانب باتھ روم کا دروازہ تھا۔ میں نے اٹھ کر باتھ روم کو دیکھا

مناسب ہی تھا۔ اندر ٹین کا ٹب پانی سے لبالب بھرا تھا۔ اس کو دیکھ کر ہی مجھے سردی لگنے لگی۔ صرف ایک کھڑکی تھی وہاں۔ میں نے اسے کھولا۔ دوسری طرف پہاڑ کی ڈھلان تھی جس پر چیڑھ کے درخت بارش میں بھیگ رہے تھے۔ پہاڑ کی یہ ڈھلان نیچے چھوٹی پکی سڑک تک چلی گئی تھی جس کے آگے دریائے جہلم شروع رات کے اندھیرے اور بادلوں کی دھند میں تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ اس رات کوہالہ کا پل دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ سرد ہوا اندر آنے لگی تھی۔ میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور آتشدان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ چوکیدار چائے بنا کر لے آیا۔

"صاحب! چینی میں نے نہیں ڈالی۔ الگ لے آیا ہوں۔ میں آپ کے لئے مرغی بھون رہا ہوں۔ آپ کہیں تو میں چاول بھی بنا دوں۔ ویسے میں روٹیاں بڑی اچھی بناتا ہوں"۔

وہ انگلی سے عینک کو درست کرتے ہوئے مسکرانے لگا۔ میں نے کہا۔ "آپ کا نام کیا ہے بابا؟"

اس نے اپنا نام رمضان بتایا۔ میں نے کہا۔

"رمضان بابا! آپ نے جو بنایا ہے وہی کھالوں گا آپ تکلف نہ کریں۔ میں کوئی سرکاری افسر نہیں ہوں۔ ایک اخبار میں کام کرتا ہوں۔ بس یہاں سیر کرنے نکل آیا ہوں"۔

رمضان ہنس کر کہنے لگا۔

"صاحب! سیر کا موسم تو مئی جون میں ہوتا ہے۔ ویسے گرمیوں میں لوگ تو یہاں سے اوپر کوہ مری یا نتھیا گلی چلے جاتے ہیں، وہاں موسم ٹھنڈا ہوتا ہے"۔

میں نے چائے میں چینی ہلاتے ہوئے رمضان سے سوال کیا۔

"رمضان بابا! تم یہاں کب سے ہو؟"

اس نے بتایا کہ وہ پیدا ہی اس علاقے میں ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"سن پینسٹھ کی جنگ میں بھی تم یہیں تھے کیا؟"

وہ آتش دان کے پاس بیٹھ گیا۔

"اللہ اکبر! صاحب پینسٹھ کی جنگ کا تو مجھے ایک ہی افسوس ہے
کہ میں اس جنگ میں شامل نہیں تھا۔ میرے دو بھتیجے چودہ پنجاب رجمنٹ میں ہیں۔
کاش میں بھی غازیوں کے ساتھ کافروں کا مقابلہ کرتا"۔

میں نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور سگریٹ سلگا لیا۔ اب میں نے اس سے وہ
سوال کیا جس کے جواب کی تلاش میں میں لاہور سے یہاں آیا تھا۔

"بابا! دشمن نے کوہالہ پل پر بڑے بم گرائے تھے۔ سنا ہے ایک بھی بم پل پر نہیں
گرا۔ لوگ کہتے ہیں آسمان سے سبزپوش اتر کر آئے تھے جو بموں کو دبوچ کر دریا میں
پھینک دیتے تھے"۔

بوڑھے چوکیدار کے جھریوں بھرے چہرے پر ایک نورانی چمک ابھر آئی۔ عینک
کے پیچھے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہاں جی! آسمان سے سبزپوش نیچے آئے تھے۔ وہ فرشتے تھے جو اللہ میاں نے بھیجے
تھے۔ میرے سامنے دشمن کا ایک جہاز آیا اس نے پل پر چار بم گرائے۔ آسمان سے
چار سبزپوش آئے انہوں نے بموں کو باری باری اپنے سفید ہاتھوں میں اٹھایا اور دور
دریا میں پھینک دیا"۔

میں نے پوچھا۔

"کیا تم نے اپنی آنکھوں سے سبزپوش فرشتوں کو دیکھا تھا؟"

"کیوں نہیں جی" چوکیدار پر جوش لہجے میں بولا۔ "میں نے
اپنی آنکھوں سے سبزپوشوں کو دیکھا۔ بس سر سے لے کر پاؤں
تک سبز لبادے میں ڈھکے ہوئے تھے۔ ان کی شکل نظر نہیں آتی
تھی۔ ایک روشنی سی ان کے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ دشمن
پل پر بم پھینکتا اور وہ بم راستے میں دبوچ لیتے۔ پھر دریا میں گرا
دیتے۔ صاحب جی! یہ ایمان کا کرشمہ تھا۔ اللہ نے ہمارے
غازی بہادروں کی مدد کی۔ دشمن گھبرا کر ایسا بھاگا کہ پھر ادھر کا
رخ نہ کیا۔ دیکھ لیں کوہالہ پل اللہ کے فضل سے سلامت ہے"۔

چوکیدار رمضان نے مجھے سبزپوشوں کے بارے میں مزید بہت کچھ بتایا اور یہ بھی کہا کہ

یہاں کے بچے بچے نے سبزپوشوں کو دیکھا تھا۔ آپ کسی سے بات کر کے دیکھ لیں وہ
اس کی گواہی دے گا ——— میں خاموشی سے سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

آتشدان میں آگ مدھم ہونے لگی تھی۔ چوکیدار کھانا تیار کرنے کے لئے گیا۔ میں
نے کپڑے تبدیل کئے اور آتشدان کے پاس آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ میں نے
آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ چھت پر بارش کے قطروں کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔
بارش تیز نہیں تھی۔ موٹے موٹے قطرے بوندا باندی کی شکل میں گر رہے تھے۔
میں نے شہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اور تعلیم بھی وہ جسے انگریز ہمارے لئے چھوڑ گیا
تھا۔ اس تعلیم نے میرے عقیدے کو کمزور کر دیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ
آسمان سے فرشتے بھی اتر سکتے ہیں۔ ویسے میرا خدا اور اس کے پاک رسولؐ پر ایمان
تھا۔ فرشتوں پر بھی مجھے کوئی شک نہیں تھا لیکن یہ بات میرا شہری فضاؤں میں پروان
چڑھا ہوا ذہن قبول کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ فرشتے سبزپوش بن کر آسمان سے اتر کر
دشمن کے بموں کو ناکارہ کرتے تھے۔

چوکیدار رمضان نے مرغی بڑی اچھی بنائی تھی۔ ساتھ روٹیاں تھیں۔ کھانا کھا کر
میں نے ایک بار پھر چائے بنوا کر پی۔ چوکیدار رمضان نے پوچھا۔ "صاحب! صبح بیڈ
ٹی کس وقت لاؤں"۔

میں نے کہا۔

"میں بیڈ ٹی نہیں پیا کرتا۔ تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ اگر میں
سویا رہا تو تم آٹھ نو بجے مجھے جگا دینا"۔

"آتش دان میں اور لکڑیاں ڈال دوں صاحب جی"۔

چوکیدار نے پوچھا۔ میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ میں رات کو آگ جلا کر سونے کا عادی نہیں
ہوں۔ اب تم جا کر آرام کرو"۔

چوکیدار رمضان سلام کر کے چلا گیا۔ میں کچھ دیر آرام کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھتا
رہا۔ بارش رک گئی تھی اور چھت پر درختوں میں رکے ہوئے پانی کے قطرے
تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گر رہے تھے۔ آتشدان میں آگ بہت مدھم پڑ چکی

تھی ۔ باہر گہری خاموشی چھائی تھی ۔ میں کتاب بند کر کے اٹھا ۔ کھڑکی کھول کر باہر دیکھا ۔ سرد ہوا میرے ماتھے کو چھوتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی ۔ چیڑھ کے درختوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔ بارش رک گئی تھی ۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور بتی بجھا کر لحاف میں گھس گیا ۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی ۔ شاید اس کی وجہ چائے تھی ۔ مجھے رات کو چائے پینے کی عادت نہیں ہے ۔ وہاں سردی کی وجہ سے کھانے کے بعد ایک کپ پی لیا تھا ۔ اب نیند غائب تھی ۔ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا ۔ میں نے یہی طے کیا تھا کہ کل کوہالہ کے مختلف لوگوں سے ملوں گا اور سبز پوشوں کے بارے میں ان کے انٹرویو قلمبند کر کے اگلے دن واپس لاہور چلا جاؤں گا ۔ مجھے یقین تھا کہ سبھی لوگ سبز پوشوں کے بارے میں وہی کچھ بتائیں گے جو چوکیدار رمضان مجھے بتا چکا تھا ۔ ایک آدمی بھی یہ نہیں کہے گا کہ اس نے کسی سبز پوش کو آسمان سے اترتے نہیں دیکھا ۔ سبھی وہی بیان دیں گے جو چوکیدار رمضان نے دیا ہے ۔ مجھے اپنے اخبار کے میگزین ایڈیشن کے لئے یہ فیچر ہر حال میں لکھنا تھا ۔ ٹھیک ہے ۔ ان لوگوں کے بیانات قلمبند کر کے سرخیاں نکال کر چھاپ دوں گا ۔ یہی سوچتے سوچتے مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی ۔ کمرے کی فضا آتشدان کی دھیمی آنچ سے بڑی پر سکون ہو گئی ۔ ہلکی ہلکی گرمائش تھی ۔ مجھے نیند آ گئی ۔

کچھ خبر نہیں کہ کب تک سویا رہا ۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی ۔ ایک زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز سے میری آنکھ کھلی تھی ۔ پہلے میں سمجھا کہ شاید میں نے کوئی خواب دیکھا ہے ۔ مگر خواب مجھے یاد نہیں آ رہا تھا ۔ کمرے میں اندھیرا تھا ۔ باہر سناٹا طاری تھا ۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے گڑگڑاہٹ کی آواز باقاعدہ سنی تھی اور اس آواز کی وجہ سے ہی میری آنکھ کھلی تھی ۔ ابھی میں اس کیفیت میں تھا کہ اچانک وہی آواز پھر سنائی دی ۔ ایسے لگا جیسے کوئی شے زبردست کڑاکے کے ساتھ ریسٹ ہاؤس کے اوپر سے گزر گئی ہے ۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا ۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ دوسری بار پھر وہی کڑاکا ریسٹ ہاؤس کے اوپر سے ہو کر نکل گیا ۔ مجھے یہ سوچنے میں دیر نہ لگی کہ یہ کوئی بمبار یا لڑاکا ہوائی جہاز تھا ۔ اگر یہ اپنی ایئر فورس کا جہاز تھا تو اسے

شہری آبادی کے اوپر اتنی نیچی پرواز کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ کہیں جنگ تو شروع نہیں ہو گئی ؟

اس خیال کے آتے ہی میں نے لحاف جلدی سے پرے پھینکا ۔ لپک کر کھڑکی کے پاس آیا ۔ کھڑکی کو کھول کر باہر دیکھا ۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا ۔ نیلی چاندنی میں چیڑھ کے درخت صاف نظر آ رہے تھے ۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں ۔ آسمان پر کوئی جہاز نہیں تھا ۔ اتنے میں وہی گڑگڑاہٹ پھر ابھری اور جیسے بمبار طیارہ زناٹے کے ساتھ میرے اوپر سے نکل گیا ۔ میری آنکھیں چاندنی میں نہائے ہوئے شفاف آسمان پر جمی تھیں ۔ وہاں مجھے کوئی طیارہ دکھائی نہ دیا ۔ یا اللہ یہ کیا طلسم ہے؟ پھر ایک ساتھ آگے پیچھے دو کڑاکوں کی آواز بلند ہوئی ۔ سارا جنگل پہاڑ گونج اٹھے ۔ مگر آسمان خالی تھا ۔ وہاں کوئی طیارہ نظر نہیں آ رہا تھا ۔ میں نے جلدی سے رین کوٹ پہنا ۔ گلے میں مفلر لپیٹا اور کمرے سے باہر نکل آیا ۔ ساری فضا طیاروں کی گڑگڑاہٹوں سے اور زناٹوں سے گونج رہی تھی مگر آسمان بالکل خالی تھا ۔ میں حیران تھا کہ کوہالہ کی بستی کے لوگ بیدار کیوں نہیں ہوئے ۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے سوائے میرے کسی کو ان طیاروں کی آواز سنائی نہیں دے رہی ۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا ۔ میں دوڑ کر چوکیدار رمضان کی کوٹھڑی کی طرف گیا ۔ اس کا دروازہ بند تھا ۔ میں زور زور سے دروازے کو پیٹنے لگا ۔ طیاروں کی گڑگڑاہٹ اسی طرح گونج رہی تھی ۔ میں چوکیدار کو آوازیں دینے لگا ۔

" رمضان بابا ! اٹھو ۔ جلدی اٹھو ۔ باہر نکلو ۔ "

مگر کوٹھڑی میں سے کوئی جواب نہ آیا ۔ جیسے چوکیدار بے ہوش پڑا ہو ۔ ایک تیز زناٹے کی آواز میرے سر کے اوپر سے ہو کر آگے نکل گئی ۔ یہ بمبار یا فائیٹر طیارے کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی ۔ میں نے جلدی سے منہ اوپر کر کے دیکھا ۔ آسمان خالی تھا ۔ بالکل خالی تھا ۔ چاند چمک رہا تھا ۔ زناٹے کی آواز دور جا کر فضا میں تحلیل ہو گئی ۔ میری نگاہیں نیچے چھوٹی سی پکی سڑک کے پار کوہالہ پل کی طرف اٹھ گئیں ۔ دریا کا پانی ایک دھندلی سفید چادر کی طرح نظر آ رہا تھا ۔ کوہالہ پل اسی طرح بے حس و حرکت تھا ۔ اچانک ساری فضا دن کی طرح روشن ہو گئی ۔ میں جلدی سے

درخت کے پیچھے ہو گیا۔ ضرور دشمن نے روشنی کرنے والا گولہ پھینکا ہے اور اب وہ
اس کی روشنی میں ٹارگٹ دیکھ کر اس پر بم گرائے گا۔ اور ٹارگٹ کوہالہ کا پل ہی ہو
سکتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ جنگ شروع ہو گئی ہے۔ باہر دشمن کے طیارے پل کو
تباہ کرنے کے لئے کمانڈو اٹیک کر رہے ہیں۔ روشنی سمٹنے لگی۔ میں سہمی ہوئی
نظروں سے آسمان کو تک رہا تھا۔ مگر یہ روشنی کا گولہ نہیں تھا۔ میں نے جنگ کے
دوران روشنی کے گولے فضاء میں پھٹ کر روشنی کرتے دیکھے تھے۔ وہ آسمان پر پھٹ
کر روشن ہو جاتے اور پھر فانوس کی طرح جلتے اور روشنی کرتے ہوئے آہستہ آہستہ
نیچے زمین کے قریب آکر بجھ جاتے تھے۔ مگر یہاں مجھے کوئی فانوس آسمان سے نیچے
زمین پر آتے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ڈر گیا کہ ضرور کوہالہ کے علاقہ پر جن بھوتوں
نے حملہ کر دیا ہے اور سب لوگوں کو سوتے میں بے ہوش اور بے حس کر دیا ہے۔
کیونکہ اتنے دھماکوں کے باوجود کہیں سے کسی آدمی کی آواز نہ آئی تھی۔ کوئی بھی
بیدار نہ ہوا تھا۔ میں نے اتنے زور سے دروازہ پیٹا مگر چوکیدار رمضان نے کوئی
جواب نہیں دیا تھا۔ روشنی سمٹ رہی تھی۔ پھر اس روشنی میں مجھے ایک سبز رنگ کا
انسانی ہیولا سا دکھائی دیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے میں ابھی بے ہوش ہو
جاؤں گا۔ یہ سبز ہیولا آہستہ آہستہ ہوا میں تیرتا ہوا میری طرف آنے لگا۔

میں نے ریسٹ ہاؤس والے کمرے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن زمین نے
جیسے میرے پاؤں اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ لئے۔ سبز روشنی کا ہیولا قریب سے قریب
تر ہو رہا تھا۔ اب اس کی سبز روشنی میں میرا سارا جسم نہا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی
زمین نے جیسے میرے پاؤں آزاد کر دیئے۔ میرے دل کی دھڑکن معمول پر آ گئی۔ مجھ
پر ایک ایسی پر سکون کیفیت طاری ہو گئی کہ اس کی لذت کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں
ہوا تھا۔ مجھے اپنے وجود، اپنے ارد گرد کے ماحول اور اپنی زندگی کی قسم قسم کی
پریشانیوں سے جیسے نجات مل گئی تھی۔ میں اپنے آپ کو ریشم کے گالے سے بھی زیادہ
لطیف محسوس کر رہا تھا۔ سبز ہیولا مجھ سے چار قدم کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ یہ
انسانی ہیولا تھا مگر اس کا چہرہ سبز نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ نقاب میں سے سبز روشنی کی
لطیف نورانی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ ایک عجیب سرمدی سی مہک چاروں طرف پھیل

گئی تھی۔ سبز ہیولا زمین سے ایک فٹ بلند تھا۔ وہ بالکل ساکت ہو کر میرے سامنے
کھڑا تھا۔ میں اس کی نورانی کرنوں میں نہا گیا تھا۔ مجھے ذرا سا بھی خوف محسوس نہیں
ہو رہا تھا۔ سردی کا احساس ہی جاتا رہا تھا۔

پھر ایک انتہائی لطیف، نرم اور شفیق آواز میرے کانوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

"کیا تمہیں اب بھی شک ہے کہ آسمانوں سے سبز پوش اتر سکتے
ہیں؟"

خوف نام کی کوئی شے اب میرے دل میں نہیں تھی۔ اس کی بجائے ایک مسرور
اور سرمدی سکون نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا آپ ہی وہ سبز پوش ہیں جو پینسٹھ کی جنگ میں کوہالہ پل کو
دشمن کی بمباری سے بچانے کے لئے زمین پر اترے تھے؟"

سبز پوش نے اپنی نورانی آواز میں جواب دیا۔

"پینسٹھ کی جنگ میں میں اور میرے ساتھی سبز پوش ہی زمین پر
آئے تھے۔ مگر ہم دشمن کے گرتے بموں کو اپنے ہاتھوں میں
دبوچنے کے لئے نہیں آئے تھے۔ ہم تو یہ دیکھنے آئے تھے کہ لا
الہ الا اللہ کا ورد کرتے ہوئے گوشت پوست کا آدمی ایک پہاڑ
سے ٹکرا کر اسے کیسے ریزہ ریزہ کرتا ہے۔ ہم یہ مشاہدہ کرنے
آئے تھے کہ حلقہ یاراں میں ابریشم کی طرح مرد مومن رزم حق
و باطل میں فولاد کی دیوار کیسے بنتا ہے۔ ہم پاک فوج کے ان
شیروں، غازیوں، شہیدوں، مجاہدوں کا دیدار کرنے آئے تھے
جن کے چہرے میدان جنگ میں پھٹتے گولوں کے بارود نے سیاہ کر
رکھے تھے، جن کی پیشانیاں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت
کے نور سے سورج کی طرح چمک رہی تھیں۔ جو اپنے پیچھے
اپنے بیوی بچوں بھائی بہنوں کو چھوڑ کر آئے تھے۔ لیکن اس
وقت نہ انہیں اپنی بیویوں کی محبت یاد آ رہی تھی نہ اپنے بچوں
کے مستقبل کا خیال تھا۔ وہ اسلام کے نام پر بنائے ہوئے وطن

پاکستان کی بقا و سلامتی، قرآن کی حرمت اور خدا اور اس کے رسولؐ کے ناموس کی خاطر اپنے سے کئی گنا طاقتور دشمن سے ٹکرا گئے۔ نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے ایک بٹالین دشمن کے پورے بریگیڈ کو نیست و نابود کر دیا۔ ایک ٹینک دشمن کے چھ چھ ٹینکوں سے ٹکرا گیا۔ ایک بریگیڈ نے پورے ڈویژن کا منہ پھیر دیا۔ کوہالہ پل پر دشمن کے بم پاک فضائیہ کے ان ہوا بازوں نے ٹھیک نشانے پر نہیں لگنے دیئے جن کے طیارے خونخوار شاہینوں کی طرح گرجتے، دھاڑتے دشمن کے طیاروں کے پیچھے لگے تھے اور ان پر جھپٹ رہے تھے، پلٹ رہے تھے۔ پلٹ رہے تھے جھپٹ رہے تھے۔ دشمن بوکھلا گیا تھا اور اپنے بم پل کی بجائے دریا میں گرا کر بھاگ رہا تھا"۔

میں نے کہا۔

"میں نے پاک فوج کے غازیوں شہیدوں کی جراءت و دلیری کے ایمان افروز واقعات رسالوں اخباروں میں پڑھے تھے۔ آپ بجا فرما رہے ہیں"۔

سبز پوش نے کہا۔

"تم نے ان واقعات کو پڑھا ہے۔ مگر میں نے انہیں دیکھا ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں نے ایک فوجی کو راکٹ لانچر سے دشمن کے ٹینکوں کو یکے بعد دیگرے تباہ کرتے دیکھا ہے۔ اور جب اس کے پاس راکٹ ختم ہو گئے اور دشمن کا ٹینک اسے روندنے کے لئے آگے بڑھا تو پاک فوج کے اس شیر نے لانچر ایک طرف پھینکا۔ گرنیڈ نکال کر دشمن کے ٹینک کی طرف دوڑا۔ سیفٹی پن کھینچ کر گرنیڈ ٹینک کے نیچے پھینکا۔ ایک ہی وقت میں ٹینک کی مشین گن کا برسٹ اس شیر غازی کو شہید کر گیا اور خود ٹینک بھی ایک دھماکے سے پھٹ کر شعلوں میں بدل گیا ---- میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں عقل کو دنگ کر دینے والی بہادری اور جذبہ ایمانی کے بے مثال کارناموں کو ایک پھر تمہیں دکھاتا ہوں۔ کیا تم اپنے غازیوں اور شہیدوں کو معرکہ حق و

باطل میں ٹینکوں سے ٹکراتے، پاکستان اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر اپنی جانیں قربان کرتے دیکھنا پسند کرو گے؟ میں تمہیں ان غازیوں کی زیارت کرواؤں گا جو صرف اس لئے شہید ہو گئے کہ اس ملک میں اسلام کا پرچم بلند رہے۔ اس کی مسجدوں سے اذانوں کی آواز آتی رہے۔ اس کی مسجدوں کے فرش پر مسلمانوں کے سجدوں کے نشان چمکتے رہیں۔ وہ تمہاری طرح بہت پڑھے لکھے نہیں تھے۔ بہت سوں کو تو اپنا نام بھی ٹھیک طرح سے لکھنا نہیں آتا تھا مگر ان کے دلوں میں قرآن کا نور جگمگا رہا تھا اور انہوں نے تمہارے مستقبل پر اپنا حال قربان کر دیا۔ کیا تم اپنی آنکھوں سے ان صف شکن مجاہدوں اور دشمن کے دس دس ٹینکوں کو تباہ کر کے خود اپنے ٹینک میں جل کر بھسم ہو جانے والے پاک فوج کے شہیدوں سے ملو گے؟"

مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میں اس وقت کہاں کھڑا ہوں۔ سبز پوش کی روح پرور آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔

"مجھ سے ڈرو نہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ان لوگوں کے پاس لئے چلتا ہوں جن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے موت بھی گھبراتی ہے۔ پھر تمہارا سارا ڈر خوف دور ہو جائے گا۔ تمہیں میرے ساتھ جاتے ہوئے کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ یہ وہ گھڑی ہے جب وقت تھم گیا ہے۔ جو شے جہاں ہے وہیں ساکت ہو گئی ہے اور جب تم اس ایمان افروز سفر سے واپس آؤ گے تو ہر شے ویسی کی ویسی ہو گی۔ ایک پل بھی نہیں گزرا ہو گا۔ ایک پتا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا ہو گا۔ گھڑی کی سوئی ایک سیکنڈ بھی آگے نہیں گئی ہو گی۔

میرے ساتھ آؤ۔ تم سبز پوشوں کی تلاش ہی میں یہاں آئے تھے۔ میں تمہیں ان شہیدوں سے ملواتا ہوں جن کی زیارت کا

شوق سبز پوشوں کو آسمان سے زمین پر کھینچ لایا تھا۔

سبز پوش کوہالہ پل کی طرف چل پڑا۔ میں بے اختیار اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کوئی آسمانی طاقت مجھے اس کے پیچھے کھینچے لئے جا رہی تھی۔۔ کوہالہ کی ساری وادی، دریا، چیڑھ کے درخت چاندنی میں نہا رہے تھے۔ ہم کوہالہ پل پر آ گئے۔ چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ پل کے نیچے دریائے جہلم کی بے قرار لہریں تیزی سے بہتی چلی جا رہی تھیں۔ لہریں ہمارے پیچھے کو میدانوں کی طرف جا رہی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پل آگے کی طرف جا رہا ہے۔ سبز پوش نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے جسم میں ایک لطیف سی حرارت دوڑ گئی اور میری آنکھوں کے آگے جیسے بادلوں کی گہری گھنی دھند چھا گئی۔ مجھے اپنا آپ فضا میں بلند ہو کر تیرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر دھند چھٹنے لگی اور میرے پاؤں اپنے آپ سخت زمین پر آن لگے۔ میں نے دیکھا۔ آسمان پر چاند کہیں نہیں تھا۔ رات اندھیری اور تاریک تھی۔ ٹھٹھرے ہوئے تارے چمکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا تھا۔ سبز پوش میرے ساتھ تھا۔ نیچے گہری کھڈیں اور چٹانی پر پیچ راستے تھے۔ شمال کی جانب دور پہاڑیوں کی برف پوش چوٹیاں دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔

سبز پوش کی آواز آئی۔

"تم سن ۱۹۶۵ء میں آ گئے ہو۔ ان پہاڑیوں کی دوسری طرف مقبوضہ کشمیر کی وادی ہے۔ جہاں کشمیری مسلمان ظالم حکمرانوں کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے بے بہا قربانیاں دے رہے ہیں۔ تم اس وقت اس جگہ کھڑے ہو، جہاں سے ۶۵ء کی جنگ میں پنجاب رجمنٹ کی ایک کمانڈو پارٹی کو مقبوضہ کشمیر میں ایک اہم مشن پر بھیجا گیا تھا۔ میں تمہیں پنجاب رجمنٹ کا نام نہیں بتاؤں گا۔ میں تمہیں ان سرفروش کمانڈوں کے نام بھی نہیں بتاؤں گا۔ میں اس مشن کا کوڈ نام بھی نہیں لوں گا۔ ان کے رینک بھی نہیں بتاؤں گا۔ باقی تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے ایک بار پھر سے ہوتے دیکھو گے۔ تم پاک

فوج کے جیالے کمانڈوز کو مقبوضہ کشمیر میں دشمن کے مورچوں کے پیچھے موت کے منہ میں اپنے ٹارگٹ تک پہنچتے دیکھو گے۔ یاد رکھو۔ کمانڈو جب اپنے مشن پر جاتا ہے تو اس کی واپسی یقینی نہیں ہوتی۔ اسے سر پر کفن باندھنے کی بھی مہلت نہیں دی جاتی۔ وہ ایک گمنام مجاہد ہوتا ہے۔ وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمن کے علاقے میں گھس جاتا ہے۔ اسے واپس آنے کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ اس کی نگاہیں، اس کا دماغ اپنے ٹارگٹ پر ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ نہ کسی بہن کا بھائی ہوتا ہے نہ کسی بچے کا باپ نہ کسی بیوی کا شوہر نہ کسی ماں کا لاڈلا بیٹا۔ وہ صرف ایک غازی ہوتا ہے جو خدا اور اس کے رسولؐ اور اللہ کی کتاب قرآن کی حرمت کے لئے جہاد کر رہا ہوتا ہے۔ اسے نہ اپنی جان کی پروا ہوتی ہے نہ دشمن کی جان کو کوئی اہمیت دیتا ہے"۔

میں ہمہ تن گوش تھا۔ سبز پوش نے جیسے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ مجھے اس کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اسکا سارا جسم سبز لباس میں ڈھکا ہوا تھا جس میں سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

سبز پوش نے کہا۔

"کافر جب مسلمانوں پر ظلم کر رہا ہو تو جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ یہ مجاہد غازی تھے۔ یہ جہاد میں شریک تھے۔ ان کی زبان پر نبی پاک کا کلمہ تھا۔ سینے میں قرآن کی امانت تھی۔ یہ پاک فوج کے کمانڈو تھے۔ اللہ کے شیر تھے۔ فوج محاذ جنگ پر آمنے سامنے لڑتی ہے۔ کمانڈو جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمن کے مورچوں کے پیچھے موت کے پیٹ میں نکل جاتا ہے اور کئی کئی بریگیڈوں سے زیادہ تباہی مچا دیتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے اپنے جسم کے بھی پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ وہ قوم سے کوئی انعام، کوئی تمغہ طلب نہیں کرتا۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ دشمن کو پہچانو۔ کافر پر نگاہ رکھو۔ وہ تمہارا دشمن ہے۔

قرآن کا دشمن ہے"۔

میری بائیں جانب دور پہاڑیوں کے دامن میں روشنی چمکی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کوئی توپ چلی ہو۔ سبز پوش نے کہا۔

"میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔ یہ آواز دشمن کی توپ کی آواز تھی۔ ابھی تم اپنی توپوں کی گھن گرج بھی سنو گے۔ تم نے آج تک کتابوں اور رسالوں کے صفحوں پر فرضی توپیں چلتی دیکھی ہیں۔ کاغذ کی مشین گنوں سے فائرنگ ہوتے دیکھی ہے۔ تمہارے اخباروں نے ہماری نئی نسل کو جو کچھ دیا ہے اور دے رہے ہیں وہ تم بھی جانتے ہو۔ تم نے کاغذ پر گولیاں چلتی دیکھی ہیں۔ میں تمہیں رسالے کے صفحوں میں سے نکال کر اصلی گولہ بارود کے دھماکوں میں لے جا رہا ہوں۔ تم اپنی آنکھوں سے مشین گنوں سے آگ اگلتی، ٹینکوں سے گولے نکلتے، گڑگڑاہٹوں کے ساتھ توپوں کو گرجتے اور بموں کو دھماکوں سے پھٹتے دیکھو گے۔ تم نے کاغذ کے آدمیوں کے سینوں سے گولیاں پار ہوتے دیکھی ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ جب تھری ناٹ تھری کی گولی سینے میں لگتی ہے تو سینے میں تو ایک سوراخ ہوتا ہے مگر دوسری طرف سے پھیپھڑوں اور پسلیوں کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں جا کر اپنے اخبار میں لکھنا اور نئی نسل کے نوجوانوں کو بتانا کہ زندہ گوشت پوست کے آدمی خدا اور رسولؐ کے نام پر کیسے فولادی ٹینک بن کر دشمن کے ٹینک سے ٹکرا جاتے ہیں"۔

اتنے میں رات کی تاریک فضا میں ہوائی جہاز کی آواز سنائی دی۔ میں نے تاروں بھرے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ مجھے وہاں کچھ نظر نہ آیا۔ سبز پوش نے کہا۔

"یہ اپنے ایک چار انجنوں والے ہوائی جہاز کی آواز ہے۔ اس میں پاک فوج کے کمانڈو جانباز سوار ہیں جن کو دشمن کے علاقے میں گرایا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم سب کچھ اپنی آنکھوں

سے دیکھو۔ میں تمہیں اس ہوائی جہاز کے اندر لے جا رہا ہوں۔ تم سب کو دیکھو گے مگر تمہیں نہ کوئی دیکھ سکے گا نہ تمہاری موجودگی ہی محسوس کر سکے گا۔ میں تمہارے ساتھ بھی ہوں گا نہیں بھی ہوں گا۔ تم مجھے اب دیکھ نہیں سکو گے۔ کبھی کبھی میری آواز ضرور سن سکو گے۔ میرا ہاتھ تھام لو"۔

میں نے سبز پوش کا نورانی ہاتھ تھام لیا۔ میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں۔ جب کھلیں تو میں نے اپنے آپ کو ایک ہوائی جہاز کے اندر پایا۔ جہاز میں کوئی سیٹیں نہیں تھیں۔ چھ سات کمانڈو جانباز جن کے چہرے فولاد کی طرح ساکت تھے جہاز کے درمیان میں ایک قطار کی صورت میں کھڑے تھے۔ ہر کمانڈو کی پشت پر پیراشوٹ کا بنڈل بندھا تھا۔ اس پیراشوٹ کے بنڈل کے ساتھ بندھی ہوئی رسی ایک ہک کی شکل میں اوپر تار سے پروئی ہوئی تھی۔ جہاز کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ سرد ہوا کے تھپیڑے اندر آ رہے تھے۔ انسٹرکٹر کھلے دروازے کے ساتھ کھڑا نیچے دیکھ رہا تھا۔ پھر جہاز کی رنگین بتی جل اٹھی۔ انسٹرکٹر نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ پہلا کمانڈو آگے بڑھا اور اس نے ہوائی جہاز کے دروازے میں سے جو ایک شگاف کی طرح کھلا تھا نیچے چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد دوسرے تیسرے پھر سارے کمانڈو جانباز نیچے کود گئے۔ ان کے ساتھ ہی جیسے میں بھی نیچے کود گیا تھا۔ مگر مجھے ہوا کے تھپیڑے محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے نیچے دیکھا۔ سب کمانڈوز جانبازوں کے پیراشوٹ کھل گئے تھے۔ اندھیری رات میں زمین تیزی سے اوپر آ رہی تھی۔

تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سارے کمانڈو لینڈ کر گئے۔ میں نے دیکھا کہ اپنی ٹریننگ کے مطابق انہوں نے اپنے جسم کو پیچھے کر رکھا تھا اور وہ ایڑیوں کی بجائے اپنے پنجوں پر اترے تھے۔ زمین پر اترتے ہی انہوں نے تیزی سے اپنے آپ کو پیراشوٹ کی رسیوں سے آزاد کیا۔ پیراشوٹوں کو سمیٹا اور انہیں ایک گڑھے میں ڈال کر اوپر اتنی تیزی سے مٹی پتھر ڈالے کہ دیکھتے ہی دیکھتے گڑھے کا وہاں نام و نشان تک نہ تھا۔ دشمن کے علاقے میں اترتے ہی پیراشوٹ کو چھپانا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اگر دشمن کو پیراشوٹ کا پتہ چل جائے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہاں کمانڈو اترے ہیں اور وہ چوکس ہو جاتا ہے۔ میں

بھی ان کمانڈو جانبازوں کے ساتھ تھا۔ مگر وہ نہ تو مجھے دیکھ سکتے تھے اور نہ میری آواز سن سکتے تھے۔ گویا میں ایک خاموش تماشائی تھا جو سن پینسٹھ کے گزرے ہوئے عظیم جنگی کارناموں کو ایک بار پھر گزرتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک حیرت انگیز بات بھی ہوئی۔ وہ یہ کہ مجھ پر ان ساتوں کے ساتوں کمانڈو جانبازوں کے نام' ان کی یونٹوں کے نام' ان کے رینک اور ان کے ماضی اپنے آپ ظاہر ہو گئے۔ مگر میں یہاں نہ تو ان کی یونٹوں کے نام لکھوں گا نہ ان کے اصلی نام اور عہدے ہی لکھوں گا۔ میں ان سب کے فرضی نام بیان کرتا جاؤں گا۔ جیسے کسی کرامت کے ذریعے مجھ پر فوجی ٹیکنالوجی کے تمام اسرار و رموز کا انکشاف ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان جانبازوں کو کتنی سخت کمانڈو ٹریننگ دی گئی تھی اور انہیں کیسے کیسے اذیت ناک مراحل سے گزارا گیا تھا کہ ان میں عقاب کی نگاہ کی تیزی اور چیتے کی جھپٹ پیدا کر دی گئی تھی۔ وہ کئی کئی دن تک بھوکے پیاسے رہ کر صرف درختوں کے پتے چوس کر مینڈک کھا کر گزارہ کر سکتے تھے۔ پاک وطن کے دفاع اور دشمن کے ٹھکانوں کو تباہ کرنے کے لئے انہیں فولاد بنا دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک کمانڈو کا نام علی رضا تھا۔ علی رضا کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھرپور جوان تھا۔ اس کمانڈو مشن پر روانہ ہونے سے پہلے اس کا انسٹرکٹر اس کے پاس آیا تھا۔ وہ صوبیدار تھا۔ اس نے علی رضا کو سلیوٹ کر کے کہا تھا۔

"سر! ہمارا رینک چھوٹا ہے۔ ہم ٹریننگ کے دوران آپ سے اونچا بولا۔ سخت سست بھی کہا۔ وہ ضروری تھا۔ پھر بھی آپ اسے دل میں نہ رکھیں۔ آپ شہید ہونے جا رہے ہیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ جاتا' پر کمانڈنگ آفیسر نے کہا تم بوڑھا ہو گیا ہے۔ سر! آخری بات کہہ رہا ہوں۔ ٹارگٹ تباہ کرنے سے پہلے شہید نہ ہونا۔"

علی رضا کو اپنے انسٹرکٹر صوبیدار کی یہ بات یاد تھی۔ میں ان سب جانبازوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ ان کا لباس کیسا تھا۔ سب کے پاس گرینیڈ تھے۔ مشین گنیں اور لائٹ گنیں تھیں۔ علی رضا کے پاس ریوالور بھی تھا۔ کمانڈو چاقو بھی ان کے پاس تھے۔ ڈائنامیٹ کی سٹیکس

تھیں۔ وہ ایک جگہ اندھیرے میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ انہیں اپنے گائیڈ کا انتظار تھا' جسے ان کے آنے کی پہلے خبر مل چکی تھی۔ سرگوشیوں میں کچھ باتیں کرنے کے بعد سارے کمانڈو تیزی سے ادھر ادھر درختوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ چند ہی لمحوں کے بعد ایک کشمیری دیہاتی لباس میں وہاں نمودار ہوا۔ اس نے ایک لفظ زبان سے بولا' جسے سن کر سب سے پہلے کمانڈو علی رضا اس کے پاس آیا۔ اس سے کوڈ میں کچھ الفاظ کا تبادلہ کیا۔ پھر منہ سے کسی پرندے کی سیٹی ایسی آواز نکالی۔ دوسرے کمانڈو بھی درختوں سے نکل کر وہاں آ گئے۔

گائیڈ نے کوئی بات نہ کی اور اشارے سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ ساتوں کمانڈو بکھر کر چلنے لگے۔ علی رضا کشمیری گائیڈ کے ساتھ تھا۔ یہ گائیڈ اس سے پہلے ایک کمانڈو پارٹی کو وہاں سے نکال چکا تھا۔ وہ کشمیری مجاہد تھا اور کشمیر کی مزاحمتی تحریک سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ درختوں' جھاڑیوں میں سے گزرتے رات کے اندھیرے میں چلے جا رہے تھے۔ وہ اس طرح سے پاؤں اٹھا رہے تھے کہ ان کے قدموں کی آہٹ کی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ انہیں اس بات کی خاص طور پر ٹریننگ دی گئی تھی۔ وہ ایک ٹیلے کے پیچھے سے گزر کر چھوٹی سی پہاڑی پگ ڈنڈی پر آ گئے۔ یہاں سے پتھر کا راستہ نیچے ایک مکان کے صحن میں جاتا تھا۔ صحن تاریک تھا۔ کشمیری گائیڈ نے اشارہ کیا۔ کمانڈو پارٹی آگے پیچھے سیڑھیاں اتر کر مکان کے صحن میں دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ علی رضا اور کشمیری گائیڈ آگے گئے۔ چھوٹے سے برآمدے میں کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ گائیڈ نے دروازے پر تین بار آہستہ سے دستک دی۔ دروازہ کھلا' اندر سے ایک دوسرا کشمیری گائیڈ باہر نکلا۔ اس نے کشمیری زبان میں پہلے گائیڈ سے کوئی بات کی اور پھر کمانڈو پارٹی اس کمرے میں گھس گئی۔ یہ ایک دیہاتی قسم کا چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے کونے میں ایک ساوار پڑا تھا۔ زمین پر لگی ہوئی موم بتی روشن تھی۔ اس موم بتی کی روشنی میں علی رضا نے جیب سے چھوٹا سا نقشہ نکال کر دیکھا۔ پھر ایک جگہ انگلی رکھ دی اور اپنے ساتھیوں سے سرگوشی میں کہا۔

"پہلا ٹارگٹ دشمن کا یہ ایمونیشن ڈمپ ہے۔ یہاں سے ہم تین ٹکڑیوں میں بٹیں گے۔ دو ٹکڑیاں دو دو کی اور ایک تین کی ہوگی۔"

میرے ساتھ رب نواز جائے گا"۔

میں بھی اسی کوٹھڑی نما کمرے میں تھا۔ اور سب کچھ دیکھ رہا تھا' سن رہا تھا۔ مگر وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہاں سے یہ جانباز پروگرام کے مطابق تین ٹکڑیوں میں بٹ گئے ۔ ایک گائیڈ دو پارٹیوں کو لے کر وہاں سے چل دیا۔ اب وہاں ایک کشمیری گائیڈ' کمانڈو علی رضا اور اس کا ساتھی کمانڈو رب نواز رہ گئے تھے۔ علی رضا نے نقشے کو ایک بار پھر دیکھا اور اپنے کشمیری گائیڈ سے پوچھا۔

"وہاں دشمن کی فورس کتنی ہے؟"

کشمیری گائیڈ بھی علی رضا کے پاس ہی زمین پر بیٹھا تھا۔ اس نے کہا۔

"پورا ایک بریگیڈ ہے۔ مگر پھیلا ہوا ہے۔ اس پل کی دونوں جانب ہیوی مشین گنوں کی پوسٹیں ہیں۔ یہ ساتویں انڈین رجمنٹ ہے"۔

"پل کے نیچے نالے میں پانی بہتا ہے کیا؟"۔ علی رضا نے پوچھا۔

گائیڈ نے جواب میں بتایا کہ پہاڑی نالہ بہہ رہا ہے اور اس میں پانی کمر کمر تک ہی ہے مگر وہ تیز بہت ہے۔

سر! اس مشن پر سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا ہو گا۔ کیونکہ اس سے پہلے ہمارے چھ سات مجاہد پل کو تباہ کرنے کی کوشش میں شہید ہو چکے ہیں۔ ان میں آپ کے دو کمانڈو بھی تھے"۔

علی رضا نے نقشہ لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا اور کہا۔

"غفار! ہم بھی شہید ہونے کے لئے آئے ہیں' مگر دشمن کا پل اڑانے سے پہلے شہید نہیں ہوں گے"۔

پاس ہی بیٹھے دوسرے کمانڈو جانباز رب نواز نے آہستہ سے انشاء اللہ کہا۔ علی رضا اپنے گائیڈ سے انڈین فوج کی پوزیشنوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔ گائیڈ نے کہا۔

"سر! اب انڈین فوج نے پل پر سیکورٹی بڑی سخت کر دی ہے۔ پہاڑی پر انڈین فوج کی پکٹیں اور پوسٹیں ہیں۔ کبھی کبھی ہیلی کاپٹر

بھی چکر لگاتا ہے اور پل پر سرچ لائیٹ پھینکتا ہوا گزر جاتا ہے"۔

کمانڈو رب نواز نے پوچھا۔

"بارودی سرنگوں کی کیا پوزیشن ہے؟"

گائیڈ نے جواب دیا۔

"بارودی سرنگیں کئی جگہوں پر بچھی ہوئی ہیں' مگر مجھے ان کا علم نہیں ہے"۔

رب نواز اور علی رضا کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ گائیڈ کہنے لگا۔

"اب آپ یہیں سو جائیں۔ رات کو سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ آپ کا مشن زیادہ پیچیدہ ہے۔ میں صبح آپ کا ناشتہ لے کر آؤں گا۔ سونے سے پہلے موم بتی بجھا دیں۔ میں چلتا ہوں"۔

گائیڈ کے جانے کے بعد علی رضا نے دیکھا کونے میں دو تین پرانے لحاف پڑے تھے۔ اس نے رب نواز سے کہا۔

"ایک لحاف میں گھس کر سو جاؤ۔ میں تمہیں دو بجے جگا دوں گا"۔

رب نواز وہیں لحاف کھول کر اس میں گھس گیا۔ علی رضا نے موم بتی بجھا دی۔ ان کے پاس ایک لائیٹ مشین گن اور ایک سٹین گن تھی جو انہوں نے وہیں دیوار کے پاس رکھ دی تھیں۔ گرنیڈ اور ڈائنامیٹ کی سٹیکیں بھی ایک تھیلے میں بند وہیں پڑی تھیں۔ چاقو اور ریوالور علی رضا کی جیب میں تھا۔ اس نے کمبل میں اپنے آپ کو لپیٹا اور اس پہاڑی مکان کے برآمدے میں نکل کر ایک طرف اندھیرے میں درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اندھیرے میں اس کی عقابی آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح جائزہ لے رہی تھیں۔ ٹیلے کی ڈھلان پر چیڑھ کے درختوں کی قطاریں اوپر تک چلی گئی تھیں۔ سردی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ اس مشن کے لئے خاص طور پر ایسا موسم چنا گیا تھا۔ ہوا بند تھی۔ اندھیرے میں سوائے درختوں کے بےپناہ ہیولوں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آسمان پر ستارے بھی ساکت تھے۔ دو بجے تک علی رضا اپنی جگہ پر بیٹھا پہرہ دیتا رہا۔ اس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ پھر اٹھا اور کوٹھڑی میں آ کر رب نواز کو جگا دیا۔ رب نواز کلمہ شریف پڑھتا ہوا اٹھا اور کمانڈو چاقو کھول کر باہر اندھیرے میں پہرے پر بیٹھ گیا۔

علی رضا لحاف اوڑھ کر سو گیا۔ جب مشرق آسمان پر پو پھٹنے لگی اور چیڑھ کے درخت رات کے اندھیرے میں سے دکھائی دینے لگے تو رب نواز اٹھ کر کوٹھڑی میں آ گیا۔ علی رضا کی اپنے آپ آنکھ کھل گئی۔ بند دروازے میں سے صبح کی پہلی گلابی روشنی اندر جھانکنے لگی تو رب نواز اٹھا۔ دروازے کی درز میں سے باہر ایک نگاہ ڈالی اور واپس علی رضا کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"غفار ابھی تک نہیں آیا۔ کہیں وہ ڈبل گیم تو نہیں کھیل رہا؟"

علی رضا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا

"آزمایا ہوا آدمی ہے"۔

غفار گائیڈ دن نکل چکا تھا جب آیا۔ اتنی دیر میں رب نواز اور علی رضا کونے میں رکھے پانی کے مٹکے سے منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو چکے تھے۔ کشمیری گائیڈ اپنے ساتھ ایک گدھا بھی لایا تھا، جس پر سوکھی لکڑیاں لدی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں رومال میں بندھا ہوا ناشتہ تھا اور بغل میں ایک گٹھڑی تھی۔ ناشتے میں وہ کشمیری سبز چائے کی دیگچی، روٹیاں اور اچار لایا تھا۔ رب نواز اور علی رضا سمجھ گئے تھے کہ وہ گدھے پر لکڑیاں کس لئے لاد کر لایا ہے۔

انہوں نے پیٹ بھر کر ناشتہ کیا۔ گائیڈ نے گٹھڑی کھول کر اس میں سے دیہاتی لباس کے دو جوڑے نکال کر دیئے اور کہا۔

"یہاں سے تمہیں کشمیری دیہاتیوں کے لباس میں آگے سفر کرنا ہے۔ انہیں پہن لو اور اسلحہ کا تھیلا مجھے دے دو"۔

کشمیری گائیڈ اسلحہ کا تھیلا اور سٹین گن اور لائیٹ گن باہر لے گیا۔ گدھا برآمدے میں کھڑا تھا۔ اس نے گدھے کے اوپر سے آدھی سوکھی لکڑیاں اتار کر وہاں اسلحہ کا تھیلا اور دونوں گنیں پرانی چادر میں لپیٹ کر چھپا دیں اور اوپر سوکھی لکڑیاں ڈال دیں۔ اب اسلحہ کا تھیلا وغیرہ باہر سے بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ اتنی دیر میں رب نواز اور علی رضا نے کشمیری دیہاتیوں ایسا لباس پہن لیا تھا۔ ان کے کرتے ڈھیلے ڈھالے تھے جن کو کشمیری زبان میں فرن کہتے ہیں۔ سروں پر انہوں نے کشمیری ہاتووں والی میلی سی ٹوپیاں پہن لی تھیں۔ وہ بالکل کشمیری دیہاتی لگنے لگے تھے۔ گائیڈ نے گدھے کی باگ اپنے ہاتھوں میں

سنبھالتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"ٹارگٹ یہاں سے سڑک کے راستے سات میل کے فاصلے پر ہے۔ مگر ہم کھڈ نالوں اور ٹیلوں کے درمیان سے گذر کر جائیں گے۔ اس طرح سے ہم شام ہونے سے پہلے پہلے محفوظ کمین گاہ تک پہنچ جائیں گے"۔

رب نواز اور علی رضا عقابی نظروں سے دن کی روشنی میں اوپر چیڑھ کے درختوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ گائیڈ بولا۔

"تم لوگ کشمیری نہیں جانتے۔ کوئی راستے میں ملے تو بات مت کرنا۔ میں خود بات کروں گا۔ ویسے راستے میں کسی کے ملنے کی امید نہیں ہے۔ ہم ویران راستوں سے ہو کر جائیں گے"۔

گائیڈ نے گدھے کو آگے چلایا۔ تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر اوپر پگ ڈنڈی پر آ گئے جو درختوں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ہلکی ہلکی سرد ہوا چل رہی تھی۔ رب نواز اور علی رضا دونوں کمانڈو جانبازوں نے کندھوں پر بوسیدہ کمبل ڈال رکھے تھے اور وہ گدھے کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ گائیڈ گدھے کی باگ تھامے آگے آگے چل رہا تھا۔ کسی درخت پر سے کبھی کبھی کسی پرندے کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ تینوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ پہاڑی راستہ کچھ دور تک ہموار تھا۔ پھر پگ ڈنڈی نیچے ڈھلان میں اترتی تھی۔ یہاں ایک طرف ایک اونچے پہاڑ کی ڈھلان نیچے گہری کھڈ میں چلی گئی تھی۔ دوسری طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلے دور بلند پہاڑوں تک چلے گئے تھے۔ ڈھلان سے اترنے کے بعد وہ ایک کھڈ میں آ گئے، جہاں خشک برساتی نالے میں چھوٹے بڑے بے شمار پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ نالے کے ساتھ ساتھ ایک تنگ ڈنڈی تھی۔ وہ اس پر چلنے لگے۔ کافی دیر تک اس تنگ کھڈ میں سفر کرنے کے بعد ایک بار پھر چڑھائی آ گئی۔ یہاں جنگلی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ ابھی تک انہیں راستے میں کوئی دیہاتی نہیں ملا تھا۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے گدھا اڑ گیا۔ بڑی مشکل سے اسے اوپر چڑھایا۔ اب وہ ایک چھوٹے سے ہموار قطعے میں تھے۔ یہاں سے اترے تو ایک سنگلاخ پہاڑی راستہ شروع ہو گیا۔ اسی طرح وہ دو گھنٹے سفر کرنے کے بعد چنار کے

ایک گھنے درخت کے پاس آ کر رک گئے۔ گائیڈ نے نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نیچے گاؤں ہے۔ یہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے۔ ہمیں اس سے بچ کر جانا ہے اس جگہ کچھ دیر آرام کر لیتے ہیں"۔

علی رضا اور رب نواز نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان کی آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ پیشانیوں پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ وہ پاک فوج کے کمانڈو تھے۔ تھکان کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ اتنی دور دوڑ لگا کر بھی آ سکتے تھے۔ علی رضا نے چنار کے درخت کی اوٹ میں سے دوسری طرف نیچان میں دیکھا۔ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے مکانوں کی چھتوں پر کہیں کوئی پرانا لحاف اور کہیں لال مرچیں سکھانے کے لئے بکھیر دی گئی تھیں۔ وہ چنار کے درخت تلے بیٹھ گئے۔ علی رضا نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی اور اپنی کمر کے ساتھ لپٹے ہوئے کپڑے میں چھوٹا سا تہہ کیا ہوا نقشہ نکال کر غور سے دیکھا۔ پھر ایک جگہ انگلی رکھ کر بولا۔

"رب نواز! ہم اس جگہ پر ہیں اس وقت"۔

کشمیری گائیڈ سگریٹ جلا کر اس کے کش لگا رہا تھا۔ ایک بار وہ اٹھ کر پیچھے گیا اور نیچے گاؤں کی طرف جھانک کر دیکھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اوپر کوئی نہیں آ رہا تو علی رضا اور رب نواز کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"صاحب تم لوگ سگریٹ نہیں پیتے؟"

پھر خود ہی ہنس کر کہنے لگا۔

"مجھے معلوم ہے کمانڈو سگریٹ سے پرہیز کرتے ہیں کیونکہ اس سے کھانسی آ جانے کا خطرہ ہوتا ہے"۔

علی رضا نے نقشہ تہہ کر کے کمر کے ساتھ چھپا کر رکھ لیا اور گائیڈ سے مخاطب ہو کر کہنے بولا۔

"غفار! تم ہمیں جہاں لے جا رہے ہوں وہاں اور کون کون ہو گا؟"

گائیڈ نے دامن سے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"وہاں سوائے تم دونوں کے اور کوئی نہیں ہو گا۔ وہ پہاڑی نالے

کی چٹانوں میں ایک خفیہ جگہ ہے جہاں اس سے پہلے میں نے دو کمانڈو پارٹیوں کو چھپایا تھا"۔

علی رضا کو اطمینان ہو گیا۔ وہ کسی گھر میں چھپنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ پانچ منٹ کے بعد علی رضا اٹھ کھڑا ہوا۔

"غفار! ہمیں اب چلنا چاہئے"۔

اور وہ ایک بار پھر اپنے ٹارگٹ کی طرف چل پڑے۔ دوپہر کو ایک جنگلی چشمے پر پہنچ کر انہوں نے منہ ہاتھ دھویا۔ گدھے پر سے لکڑیوں کا گٹھا اتار کر اسلحہ وغیرہ چیک کیا۔ گدھے کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ رومال میں سے غفار نے روٹیاں نکال لیں۔

انہوں نے خالی روٹیاں اچار کے ساتھ کھائیں۔ چشمے پر منہ ہاتھ دھو کر پانی پیا اور آگے روانہ ہو گئے۔

اس وقت آسمان پر بادل جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ غفار نے ان بادلوں کو دیکھا اور بولا۔

"رات کو بارش ہو گی"۔

علی رضا اور رب نواز خاموشی سے ایک دوسرے کے آگے پیچھے پہاڑی راستے پر چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ آہستہ آہستہ انہیں راستے میں ہی سورج غروب ہو گیا۔ مگر بادلوں کے پیچھے ابھی روشنی باقی تھی۔ آسمان بادلوں سے ضرور بھر گیا تھا مگر نہ بجلی چمک رہی تھی نہ بارش ہی شروع ہوئی تھی۔ وہ سفر کرتے ہوئے پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹی سی وادی میں آ گئے تھے جہاں چنار اور بادام کے درخت جگہ جگہ اگے تھے۔ بیچ میں کھیت بھی تھے۔ غفار ایک جگہ بادام کے درختوں میں رک گیا اور انہیں بھی رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ پریشان سا تھا۔ علی رضا نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"کیا بات ہے؟"

غفار کی آنکھیں سامنے والے رخ کے درختوں کی طرف لگی تھیں۔

"کوئی ادھر آ رہا ہے"۔

رب نواز بولا۔

"ہم دوسری طرف چھپ جاتے ہیں"۔

غفار نے جلدی سے کہا۔

"نہیں نہیں۔ اب چھپنا مت۔ اس نے تمہیں دیکھ لیا ہے"۔

اب علی رضا اور رب نواز نے بھی دیکھا کہ ایک پگڑی والا آدمی سامنے درختوں میں سے نکل کر ان کی طرف چلا آ رہا ہے۔ غفار گدھے پر لدی ہوئی لکڑیوں کے گٹھے کو یوں ہی ٹھیک کرنے لگا۔ بولا۔

"تم بیٹھ جاؤ اور یوں ظاہر کرو جیسے تھک گئے ہو۔ یہ ہمارے گاؤں کا ہندو ہے اور انڈین فوج کا مخبر ہے"۔

مخبر کے نام پر علی رضا نے چونک کر پہلے غفار گائیڈ کو اور پھر قریب آتے ہندو کو دیکھا۔ اس نے زعفرانی رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر مگر ڈیل ڈول کا مضبوط آدمی تھا۔ علی رضا اور رب نواز قریبی جھاڑیوں کے پاس بیٹھ گئے اور فرن کے دامن سے منہ پونچھنے لگے۔ ہندو مخبر قریب آ گیا تھا' بولا۔

"غفارے! ارے بھائی یہ لکڑیاں بیچنے کے لئے ہیں کیا؟"

علی رضا نے دیکھا کہ اس ہندو کی آنکھیں غفار گائیڈ کی بجائے ان دونوں پر جمی تھیں۔

غفار گائیڈ نے کہا۔

"نہیں لالہ یہ تو میں گھر میں جلانے کے لئے لایا ہوں"۔

یہ آدمی کون ہیں غفارے۔ پہلے انہیں نہیں دیکھا"۔

ہندو مخبر نے علی رضا اور رب نواز کی طرف مسلسل دیکھتے ہوئے پوچھا۔ گائیڈ نے گٹھے میں سے ایک لکڑی کو کھینچ کر دوبارہ اپنی جگہ پر جماتے ہوئے کہا۔

"لالہ! ساتھ والے گاؤں کے آدمی ہیں۔ آگے چری کوٹ جا رہے ہیں۔ بولے بھوک لگی ہے' میں نے کہا چلو گھر میں جو روکھی سوکھی ہے کھا لیں"۔

"اچھا اچھا۔ تم بڑے بھلے آدمی ہو غفارے۔ اچھا بھائی رام رام!"

یہ کہہ کر ہندو مخبر آگے بڑھ گیا۔ مگر اس نے پلٹ کر علی رضا اور رب نواز کو ایک

بار پھر دیکھا۔ غفار نے آہستہ سے کہا۔

"اس کو شک ہو گیا ہے"۔

علی رضا اپنی گردن پر کپڑا پھیر رہا تھا۔ بولا

"اس کو زندہ نہیں رہنا چاہئے"۔

غفار نے پلٹ کر کہا۔

"لاش کہاں چھپائیں گے؟"

علی رضا کی آنکھیں ہندو مخبر کا پیچھا کر رہی تھیں' جو اب چنار کے درختوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ وہ یہ کہہ کر اٹھا۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں اس کو ٹھکانے لگا کر آتا ہوں"۔

رب نواز اس کے ساتھ جانے کے لئے اٹھا تو علی رضا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے وہیں بیٹھے رہنے کو کہا اور بجلی کی طرح درختوں کی بائیں جانب والی ڈھلان میں اتر کر غائب ہو گیا۔ ہندو مخبر نے غفار کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ اسے علی رضا اور رب نواز پر پورا شبہ ہو گیا تھا کہ یہ پاکستانی کمانڈو ہیں۔ چنانچہ اس نے آگے جا کر اپنا راستہ بدل لیا اور اس ٹیلے کی طرف ہو گیا جس کے دامن میں انڈین فوج کی پکٹ تھی۔ وہ ان دونوں پاکستانی کمانڈو جانبازوں کی اطلاع انڈین فوج کو پہنچانا چاہتا تھا۔ علی رضا نے بھی اسے اپنا راستہ بدل کر ٹیلے کی طرف گھومتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جھاڑیوں اور درختوں کے پیچھے اس چیتے کی طرح تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا جس نے اپنے شکار کو دیکھ لیا ہو۔ اس مخبر کے زندہ بچ نکلنے کا مطلب یہ تھا کہ نہ صرف وہ دونوں گرفتار ہو جاتے بلکہ ان کا مشن بھی ناکام ہو جاتا اور غفار کا سارا کنبہ بھارتی فوجیوں کے ظلم و ستم کی زد میں آ جاتا۔

علی رضا ایک جانباز کمانڈو کی طرح بے آواز قدموں سے چلتا ہوا لپک کر ہندو مخبر کے آگے نکل آیا۔ ہندو مخبر کو اسی طرف آنا تھا۔ علی رضا نے اپنا کمانڈو چاقو نکال کر سیدھے ہاتھ کی گرفت میں مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ وہ ایک جھاڑی کے پیچھے سانس روکے بے حس و حرکت پنجوں کے بل بیٹھا اس ڈھلانی راستے کو تک رہا تھا جہاں سے اتر کر مخبر کو آگے جانا تھا۔ آخر وہ مخبر علی رضا کو نظر آ گیا۔ چاقو کے دستے پر اس کی گرفت مزید جم گئی۔ اس کے دونوں مضبوط بازوؤں کے پٹھوں میں فولاد کی سختی آ گئی۔ جونہی ہندو مخبر اس کے

قریب سے گزرا اور ایک قدم آگے ہوا علی رضا نے اچھل کر اس کی گردن میں بایاں بازو ڈال کر دائیں ہاتھ سے اس کی گردن پر چاقو پھیر دیا۔ ساتھ ہی اسے اپنے سے پرے دھکیل دیا۔ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ میں ہو گیا۔ علی رضا کو اپنے وار کے کاری ہونے کا اسقدر یقین تھا کہ اس نے دوبارہ مخبر پر وار کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ وہیں بیٹھ کر خون آلود چاقو کو گھاس سے صاف کرنے لگا۔

ہندو مخبر کی لاش جھاڑیوں کے پاس تڑپ رہی تھی۔ اس کی گردن آدھی سے زیادہ کٹ چکی تھی اور خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ جب لاش کے جسم کا سارا خون بہہ گیا تو علی رضا اٹھا۔ لاش کے دونوں پاؤں کو پکڑا اور گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا۔ پہاڑوں پر جگہ جگہ گڑھے ہوتے ہیں۔ وہاں بھی ایک گڑھا بنا ہوا تھا۔ علی رضا نے اس کی لاش کو گڑھے میں پھینکا۔ اوپر پتھر اور چاقو سے مٹی کے بڑے بڑے ٹکڑے کھود کر ڈالے۔ اس کے اوپر درختوں کی سوکھی لکڑیاں اور خشک پتے بکھیر کر دوبارہ پتھروں کی ایک تہہ جما دی۔ پھر دونوں پاؤں سے اچھی طرح کود کود کر لاش کو دبا دیا۔ وہ لاش کو یونہی بھی چھوڑ سکتا تھا۔ مگر یہ مخبر اپنے گائیڈ کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کی لاش مل جانے پر گاؤں میں پکڑ دھکڑ ہو سکتی تھی۔ علی رضا غفار کے گاؤں کے غریب مسلمان کشمیریوں کو نئی مصیبت سے بچانا چاہتا تھا۔

اس کے بعد وہ اس جگہ آیا، جہاں لاش کا خون گھاس پر جم گیا ہوا تھا۔ اس خون کو بھی اس نے لمبے چاقو سے زمین کھود کر مٹی اور گھاس میں گڈ مڈ کر دیا اور وہاں بھی ادھر ادھر سے پتھر لا کر ڈال دیئے۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی وہ چڑھائی چڑھ کر رب نواز اور اپنے گائیڈ کے پاس آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی رب نواز سمجھ گیا کہ دشمن کو ٹھکانے لگا دیا گیا ہے۔ غفار گائیڈ کو پریشانی ضرور تھی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

علی رضا نے اثبات میں سر ہلایا۔ غفار اور پریشان ہو کر بولا۔

"لاش کہاں ہے؟ پولیس ہم سب گاؤں والوں کو پکڑ کر لے جائے گی"۔

تب علی رضا نے اسے بتایا کہ لاش کو گڑھے میں دبا دیا گیا ہے اور باہر خون کا ایک

دھبا بھی کہیں نہیں رہنے دیا گیا۔ گائیڈ بولا۔

"اب یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں"۔

اس کے ساتھ ہی اس نے گدھے کو آگے بڑھا دیا۔ علی رضا اور رب نواز بھی ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ وہ تیز تیز چل رہے تھے۔ جلد ہی وہ اس علاقے سے نکل کر نچان میں آ گئے۔ گائیڈ غفار کا گاؤں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ غفار مخبر کے قتل سے ابھی تک کچھ پریشان تھا۔ کہنے لگا:

"تمہیں چٹانوں والی کمین گاہ میں چھپا کر مجھے واپس گاؤں آنا ہو گا ۔میں گاؤں میں نہ ہوا تو پولیس مجھ پر شک کرے گی کہ مخبر کے قتل میں میرا ہاتھ ہے"۔

رب نواز نے کہا۔

"ٹارگٹ تک ہمیں کون گائیڈ کرے گا؟"

غفار بولا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں صبح ہوتے ہی واپس آ جاؤں گا"۔

پہاڑی راستہ دشوار گزار ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی باقاعدہ پگ ڈنڈی وہاں نہیں تھی۔ انہیں جھاڑیوں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ کئی جگہوں پر جھاڑیوں کو چاقو سے کاٹ کر راستہ بنانا پڑا۔ دن ڈوبنے تک وہ چٹانی علاقے میں آ گئے۔ یہاں ٹیلے بھی تھے اور سرمئی رنگ کی بے آب و گیاہ چٹانیں بھی زمین سے سر نکالے کھڑی تھیں۔ ایک جگہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ انہیں ایک ایک کر کے گزرنا پڑا۔

آخر وہ چٹانی خفیہ کمین گاہ آ گئی، جہاں رب نواز اور علی رضا کو چھپنا تھا۔ یہ ایک تنگ و تاریک چھوٹی سی قدرتی سرنگ تھی، جو ایک چٹان کے اندر بنی ہوئی تھی۔ دونوں جانبازوں نے اسلحہ کا تھیلا اور گنیں سرنگ میں ایک طرف چھپا دیں۔ گائیڈ کہنے لگا۔

"میں شام ہونے سے پہلے پہلے اپنے گاؤں پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ لالہ کی تلاش شروع ہو گئی ہو گی۔ گاؤں میں کوئی شخص شام کو گھر نہ آئے تو سارے گاؤں کو پتہ چل جاتا ہے۔

لالہ انڈین فوج کا مخبر تھا۔ پولیس فوراً آ جائے گی۔ تم یہاں رات

گزارو۔ میں صبح آ جاؤں گا"۔

گائیڈ گدھے کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ رب نواز نے علی رضا کو کہا۔

"پولیس نے غفار کو پکڑ لیا تو کہیں یہ بک تو نہ دے گا؟"

علی رضا چپ تھا۔ سرنگ میں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ نیچے ایک پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا جس کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ علی رضا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے آج تک کسی کشمیری گائیڈ نے ہمیں دھوکہ نہیں دیا۔ وہ بھارتی فوج کے ٹارچر سے شہید ہو گئے مگر زبان نہیں کھولی"۔

سورج غروب ہونے کے بعد اس پہاڑی جنگل میں اندھیرے کی دھند اترنے لگی۔ علی رضا بولا۔

"میں نالے پر منہ ہاتھ دھو آؤں۔ تم چوکس رہنا"۔

علی رضا سرنگ میں سے نکل کر چاروں طرف دیکھتا جھاڑیوں کے پیچھے سے گزرتا نیچے پہاڑی نالے پر آ گیا۔ رب نواز اوپر سرنگ کے دہانے پر ایک طرف ہو کر بیٹھا درختوں کے زمین پر اترتے اندھیرے میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لائیٹ مشین گن تھی۔ علی رضا کے بعد رب نواز نے بھی پہاڑی نالے کے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور واپس سرنگ میں آ گیا۔

رات ہو گئی۔ درختوں پر بولتے پرندے چپ ہو گئے۔ علی رضا نے دو چار بڑے پتھر اندر لا کر اس کی اوٹ بنائی اور اس کے پیچھے موم بتی روشن کر دی اور جیب سے نقشہ نکال کر دیکھنے لگا۔

رب نواز بولا۔

"ہماری دوسری پارٹی ٹارگٹ پر پہنچ گئی ہو گی"۔

علی رضا موم بتی کی روشنی میں نقشے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہم ایک رات لیٹ ہو جائیں گے۔ مگر اس مخبر کو ٹھکانے لگانا بھی ضروری تھا"۔

رب نواز بولا

"ہم اپنے ٹارگٹ سے ابھی کافی دور ہیں۔ گائیڈ صبح آ جائے تو ہم شام تک اپنے ٹارگٹ تک پہنچ سکتے ہیں"۔

"شاید وہ آ جائے"۔

علی رضا نے نقشہ تہہ کر کے جیب میں رکھا اور موم بتی بجھا دی۔ وہ سرنگ سے باہر آ گئے۔ باہر آسمان پر بادل غائب ہو چکے تھے۔ اور ستاروں کی دھیمی دھیمی سرمئی سی روشنی پھیلی تھی۔ غفار گائیڈ روٹی والا رومال ان کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ رومال میں ابھی چھ سات روٹیاں باقی تھیں۔ ساتھ اچار بھی تھا۔ انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اچار کے ساتھ روٹی کھائی۔ علی رضا نے کہا:

"تم سو جاؤ۔ بارہ بجے تک میں پہرہ دوں گا"۔

رب نواز سرنگ کے اندر جا کر سو گیا۔ علی رضا سٹین گن لئے سرنگ کے دہانے پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں باہر درختوں اور چٹانوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پہاڑی جنگل میں سوائے نالے میں پانی کے بہنے کی آواز کے دوسری کوئی آواز نہیں تھی۔ اس وقت اسے تیز چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ مگر چائے کے بغیر بھی وہ جاگتا رہا۔ اس کی اسے ٹریننگ دی گئی تھی۔

ٹھیک بارہ بجے رات اس نے رب نواز کو جگا دیا اور خود گہری نیند سو گیا۔ رات گزر گئی۔ سورج کی سنہری کرنیں جنگل میں پھیلنے لگیں۔ ساتھ ہی درختوں پر پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا۔ اب انہیں گائیڈ کا شدید انتظار تھا۔ دن کے دس بجے غفار گائیڈ آ گیا۔ وہ گدھے کے ساتھ آیا تھا۔ گدھے پر نئی خشک لکڑیوں کا گٹھا لدا ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ دس بارہ تنوری روٹیاں بھی لایا تھا۔ آتے ہی بولا۔

"ہندو مخبر کے گم ہونے کی سب کو خبر ہو گئی ہے۔ شام کو بھارتی فوج کے کچھ سپاہی آئے تھے۔ میں اپنے گھر پر ہی تھا۔ انہوں نے مجھ سے بھی پوچھ گچھ کی، مگر میں نے کہا کہ مجھے تو لالہ آج ملا ہی

نہیں ۔ اب یہاں سے نکل چلو۔ میرا شام تک ہر حالت میں واپس
گاؤں پہنچنا ضروری ہے"۔

سرنگ سے نکل کر ان کا پہاڑی علاقے میں سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ دوپہر تک وہ مسلسل چلتے رہے۔ راستے میں انہوں نے کئی پہاڑی ندی نالے پار کئے۔ دوپہر کو ایک جگہ بیٹھ کر انہوں نے تھوڑا بہت کھایا۔ بمشکل پانچ منٹ آرام کیا اور پھر آگے چل پڑے۔

مقبوضہ کشمیر کا یہ بڑا گنجان اور دشوار گزار پہاڑی علاقہ تھا۔ ایک طرح سے وہ پہاڑیوں کے اوپر چل رہے تھے۔ کشمیر کی وادی وہاں سے شمال مغرب کی طرف تھی۔ ان پہاڑیوں میں انڈین فوج نے جگہ جگہ اپنی پوسٹیں قائم کر رکھی تھیں اور ان کی فوج سارے علاقے میں بکھری ہوئی تھی۔ ان فوجوں کو چھوٹے چھوٹے پہاڑی ندی نالوں کے پل آپس میں ملاتے تھے۔ ان پہاڑی پلوں کی بڑی اہمیت تھی۔ میدانی علاقے میں اگر ایک پل کو اڑا دیا جائے تو اس کی جگہ عارضی پل کھڑا کر دیا جاتا ہے کیونکہ میدانی علاقے میں پل کا ساز و سامان آسانی سے پہنچ جاتا ہے' مگر پہاڑی علاقے میں ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ اگر پہاڑی علاقے میں کوئی پل تباہ کر دیا جائے تو فوج کا زمینی رابطہ ایک دوسرے سے کٹ جاتا ہے اور وہاں فوری طور پر دوسرے پل کی تعمیر کا سامان بھی آسانی سے نہیں لایا جا سکتا۔ ان پلوں میں ایک ایسا پل بھی تھا جس کی حیثیت مقبوضہ کشمیر میں موجود انڈین فوج کی شہ رگ کی تھی۔ یہ کوئی زیادہ لمبا چوڑا پل نہیں تھا۔ مگر یہ پل دو پہاڑیوں کے درمیان ایک نالے کے اوپر بنا ہوا تھا۔ انڈین فوج کا سارا ساز و سامان اور ٹینک اور چھوٹی توپ گاڑیاں اسی پل کے اوپر سے گزرتی تھیں۔ وادی کشمیر کی فوجوں کو گولہ بارود کی سپلائی بھی اس پل کے ذریعے ہوتی تھیں۔ اس پل کے ٹوٹ جانے کا مطلب یہ تھا کہ ایک طویل مدت کے لئے مقبوضہ کشمیر کی وادی میں جموں کی طرف سے آنے والی بھارتی فوج کی سپلائی رک جاتی۔

یہ دونوں پاک فوج کے جوان اس پل کو تباہ کرنے آئے تھے۔ اس وقت وہ ایک طرح سے دشمن کے پیٹ میں چل پھر رہے تھے۔ ان کی دوسری پارٹی دوسرے مشن پر مصروف عمل تھی۔ ان میں سے کسی کو واپس زندہ پہنچنے کی امید نہیں تھی۔ وہ اس امید کو ساتھ لے کر چلے بھی نہیں تھے۔ دوسرے ملکوں کی فوج کے کمانڈو جب کسی مشن پر جاتے ہیں تو انہیں یہ حق دے دیا جاتا ہے کہ اگر ٹارگٹ کو اڑانا ناممکن نظر آتا ہو اور اس میں جان کا بھی

خطرہ ہو تو وہ واپس آ جائیں۔ مگر پاک فوج کے کمانڈو اپنا دودھ بخشوا کر مشن پر جاتے ہیں۔ وہ اسلام اور قرآن کی حفاظت کی خاطر دشمن کے مورچوں کے پیچھے نکل آتے ہیں اور اپنی جان پر کھیل کر شہادت کا رتبہ پاتے ہیں' مگر دشمن کے ٹارگٹ کو بھی تباہ کر دیتے ہیں۔ ٹارگٹ تباہ کئے بغیر زندہ واپس آنے کا ان کے ذہن میں کوئی تصور نہیں ہوتا۔

علی رضا اور رب نواز بھی پاک فوج کے جیالے کمانڈو جانباز تھے اور وہ موت کے گریبان میں ہاتھ ڈالے دشمن کے علاقے میں اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جب سورج غروب ہو گیا تو گائیڈ رک گیا۔ بولا

" تھوڑی دیر میں ہم ٹارگٹ کے علاقے میں داخل ہو جائیں گے۔
اب آپس میں کوئی بات چیت نہیں ہو گی۔ لکڑی کے گٹھے میں سے
اسلحے کا تھیلا نکال لو۔ مجھے گدھے کو اسی جگہ چھوڑنا ہو گا"۔

لکڑیوں کے گٹھے میں سے لائیٹ مشین گن اور سٹین گن اور اسلحے کا تھیلا نکال لیا گیا۔ گائیڈ نے گدھے کو ذرا نیچے لے جا کر اخروٹ کے ایک درخت کے ساتھ باندھ کر اس کے آگے جھاڑیوں کی شاخیں کاٹ کر ڈال دیں۔ پھر اوپر آ گیا۔ دونوں جانبازوں کو ساتھ لے کر پہاڑی کی دوسری جانب نیچے اترنے لگا۔ آگے ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ اس میں بڑے بڑے پتھر پڑے تھے۔ پانی ان سے ٹکرا کر گزر رہا تھا۔ نالے کے پیچھے لکڑی کی دیواروں والا ایک چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا جس کی چھت ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ اوپر اخروٹ کے ایک گھنے درخت کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ یہاں ایک عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گائیڈ انہیں کیبن کے اندر لے آیا۔ کیبن کے اندر سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر چھت تک چلا گیا تھا۔ آدھے سے زیادہ جگہ ان لکڑیوں نے گھیر رکھی تھی۔ گائیڈ نے لکڑی کا بوسیدہ دروازہ بند کر دیا۔ کیبن کی دیوار میں اوپر ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس میں سے شام کی دھندلی دھندلی روشنی کیبن کے اندھیرے کو چاک کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

گائیڈ نے روٹیوں والا رومال فرش پر رکھ دیا۔ وہ لکڑیوں کے انبار کے پاس بیٹھ گئے۔

علی رضا نے آہستہ سے پوچھا۔

"پل یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

گائیڈ کہنے لگا۔

"نیچے پہاڑی رستے میں دو فرلانگ تک جانا ہو گا' مگر اس کی چاروں طرف اوپر انڈین فوج کی پوسٹیں ہیں"۔

رب نواز نے کہا۔

"بارودی سرنگیں پل کی دونوں طرف بچھی ہوں گی۔ ہمیں پیچھے جا کر نالے میں سے گزر کر پل تک پہنچنا چاہئے"۔

علی رضا کسی گہری سوچ میں تھا۔ اس نے شین گن پر میگزین چڑھا لیا تھا۔ گائیڈ بولا۔

"اس طرف سے راستہ زیادہ لمبا ہو جائے گا"۔

علی رضا نے آہستہ سے کہا۔

"ہمیں نالے کی طرف سے ہی جانا ہو گا۔ تم ہمیں پل سے کم از کم ایک فرلانگ پیچھے لے جا سکتے ہو؟"

گائیڈ بولا۔

"اگر یہ ضروری ہے تو ضرور لے جاؤں گا۔ مگر پیچھے میری اطلاع کے مطابق نالے کے کنارے ایک مشین گن پوسٹ ہے"۔

"پوسٹ تو ضرور ہو گی۔ مگر بارودی سرنگوں کا خطرہ نہیں ہو گا۔ گن پوسٹ کو ہم سنبھال لیں گے"۔

علی رضا نے دھیمے لہجے میں کہا۔ گائیڈ بولا۔

"میں جا رہا ہوں۔ آپ لوگ تیار رہیے میں ٹھیک بارہ بجے رات آؤں گا۔ رومال میں روٹیاں ہیں۔ تم کھا لینا۔ پانی پینے کے واسطے نیچے پہاڑی نالے پر دیکھ بھال کر جانا۔ یہ سارا علاقہ انڈین جاسوسوں سے بھرا ہوا ہے"۔

گائیڈ چلا گیا۔ رب نواز نے دروازہ بند کر دیا۔ اندھیرے میں ہی انہوں نے روٹی کھائی اور باری باری نیچے جا کر پہاڑی نالے پر پانی پیا۔ علی رضا نے ایک بار باہر نکل کر تیزی سے بڑھتی چلی آتی رات کا بغور جائزہ لیا اور پھر کیبن میں آ کر دروازہ بند کر کے بولا۔

"رب نواز! اسلحہ چیک کر لو"۔

تھیلا کھول کر ڈائنا میٹ کی چھڑیوں اور لائیٹ مشین گن کے پٹے کو چیک کیا گیا۔ رب نواز نے بھی اپنی شین گن پر میگزین چڑھا لیا۔ اس کام کے لئے علی رضا نے چھوٹی سے موم بتی کو جلا لیا۔ اسلحہ چیک کرنے کے فوراً بعد موم بتی بجھا دی گئی۔ وہ اندھیرے میں ہی بیٹھے ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ ان کی گفتگو اپنے ٹارگٹ تک پہنچ کر اسے تباہ کرنے کے بارے میں تھی۔ درمیان میں علی رضا اٹھ کر کیبن کے باہر کا جائزہ لے آتا تھا۔

علی رضا نے ایک بار گھڑی دیکھی۔ اس کی چمکیلی سوئیاں رات کے سوا بارہ بجا رہی تھیں — اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ساتھی رب نواز سے کہا۔

"اسے اب تک آ جانا چاہئے تھا"۔

"کہیں وہ پکڑا نہ گیا ہو"۔

رب نواز نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ علی رضا کی آنکھیں گھڑی کی چمکیلی سوئیوں پر جمی تھیں۔

"اگر پندرہ منٹ تک وہ نہ آیا تو ہم اکیلے ہی ٹارگٹ کی طرف ایڈوانس کریں گے۔ ہم پہاڑی نالے کا کھوج لگا لیں گے۔ گرنیڈ نکال کر بانٹ لو۔ ڈائنامیٹ کی چھڑیاں مجھے دے دو"۔

رب نواز نے تھیلا کھول کر پانچ ہینڈ گرنیڈ علی رضا کو دے دیئے اور پانچ اپنی کمر کے ساتھ کرتے کے اندر بندھے ہوئے کپڑے میں چھپا لئے۔ علی رضا نے جیب سے نقشہ نکال کر موم بتی جلائی۔ وہ بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں تھا۔ نقشے کی آڑی ترچھی لکیروں کو اس نے غور سے ایک بار پھر دیکھا۔ وہ دونوں ان لکیروں کی زبان کو سمجھتے تھے۔ اس کے بعد علی رضا نے نقشے کو پرزہ پرزہ کر کے زمین میں دبا یا اور موم بتی بجھا کر کہا۔

"ہمارے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔ اگر گائیڈ نہ آیا تو ہم یہاں سے نکل پڑیں گے۔ ہم درمیان میں دس پندرہ قدم کا فاصلہ رکھیں گے۔ تم میرے دائیں پہلو کی طرف سے آگے بڑھو گے"۔

علی رضا نے گھڑی اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ دونوں کی نظریں سیکنڈ کی چمکیلی سوئی پر جمی تھیں جو آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ابھی رات کے سوا بارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے کہ انہیں باہر آہٹ سنائی دی۔ دونوں زمین پر اوندھے ہو کر لیٹ گئے۔ مشین گنوں کا رخ کیبن کے دروازے کی طرف تھا' جہاں رات کی دھندلی نیلی روشنی ہو رہی تھی۔ علی رضا نے رب نواز کے کاندھے پر ہاتھ لگایا۔ رب نواز کیبن کی دیوار کے ساتھ آگے کھسکنے لگا۔

اتنے میں باہر سے گائیڈ غفار کے کوڈ لفظ کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ علی رضا نے کوڈ میں ہی جواب دیا۔ گائیڈ غفار اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی وہ ان کے پاس پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"آگے چیک پوسٹوں پر انڈین فوج کی نفری بڑھ گئی ہے۔ اب خطرہ زیادہ ہو گیا ہے۔ تم کیا کہتے ہو"۔

کیبن کے اندھیرے میں باہر سے رات کی پھیکی سی نیلی روشنی اندر آ رہی تھی جس میں علی رضا اور رب نواز کو گائیڈ کا ہیولا سا نظر آتا تھا۔ علی رضا نے گائیڈ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"ہم واپس جانے کے لئے نہیں آئے غفار بھائی۔ ہم اپنی ماؤں سے دودھ کی دھاریں بخشوا کر آئے ہیں"۔

کشمیری مجاہد گائیڈ کی آنکھوں میں بھی ایک چمک سی آ گئی۔ اس کے منہ سے اپنے آپ نکل گیا

"اللہ تیری شان"۔

وہ اٹھا۔

"میرے پیچھے پیچھے آؤ"۔

کیبن کے باہر آسمان صاف تھا۔ ستاروں کی چمک نے اندھیرے کی چادر کو سرمئی سا کر دیا تھا۔ جس میں انہیں درخت' جھاڑیاں سایوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ اس مشن کے لئے تاریک اور بغیر چاندنی کی راتوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ گائیڈ انہیں اندھیرے میں ایسے علاقے سے گزار رہا تھا۔ اتنے بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے کہ لگتا تھا کسی

نے پہاڑ کو کاٹ کر اس کے ٹکڑے ادھر ادھر ڈال دیئے ہیں۔ وہاں کوئی باقاعدہ راستہ یا پگ ڈنڈی نہیں تھی۔ انہیں خود راستہ بنا کر چلنا پڑ رہا تھا۔ یہ بھی خیال تھا کہ ان کے قدموں کی یا کسی جھاڑی کے چاقو سے کاٹنے کی آواز پیدا نہ ہو۔ کیونکہ اس سارے علاقے میں انڈین فوج پھیلی ہوئی تھی۔ لائیٹ سٹین گنیں ان کے کاندھوں سے سلنگوں کے ساتھ لٹک رہی تھیں۔ چاقو ہاتھوں میں تھے جن سے وہ سامنے آنے والی جھاڑیوں کی شاخوں کو احتیاط سے کاٹ کر الگ کر دیتے تھے۔

سامنے ٹیلے کی چڑھائی آ گئی۔

گائیڈ غفار رک گیا۔ اس نے دونوں پاکستانی جانبازوں کو وہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی میں بولا۔

"جب تک میں واپس نہ آؤں تم اسی جگہ بیٹھے رہنا"۔

یہ کہہ کر وہ جھکا جھکا چڑھائی چڑھنے لگا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد رب نواز نے علی رضا سے کہا۔

"گرائیں یہ کہاں گیا ہے؟"

علی رضا سمجھ گیا کہ رب نواز کا ابھی تک شک دور نہیں ہوا۔ رب نواز پاک فوج کا آزمودہ اور ٹرینڈ فوجی کمانڈو تھا اور انہیں اس بات کی خاص طور پر تربیت دی جاتی ہے کہ وہ کسی خوش فہمی کو قریب بھی نہ پھٹکنے دیں اور خطروں کو ہمیشہ سامنے رکھیں۔ مگر علی رضا نے کشمیری گائیڈ کو اپنی نظروں میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں اندھیرے میں ہی گائیڈ کو چڑھائی چڑھتے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"فکر نہیں۔ اللہ مالک ہے"۔

گائیڈ ٹیلے کے اوپر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ جھک کر دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ پہاڑی جنگل کا سارا علاقہ خاموش اور سنسان تھا۔ وہاں سے دور محاذ پر سے توپوں کی گولہ باری کی آواز بھی صبح سے بند تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد گائیڈ واپس آ گیا۔ اس نے قریب بیٹھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"سب ٹھیک ہے آ جاؤ"۔

وہ ٹیلے کی چڑھائی پار کر کے دوسری طرف ڈھلان پر آئے تو انہوں نے اپنے سامنے

پیالے کی شکل کی ایک چھوٹی سی وادی دیکھی ۔ یہ وادی اونچی پہاڑیوں کے درمیان تھی اور یہاں کہیں کہیں بجلی کی روشنیاں ستاروں کی طرح ٹمٹما رہی تھیں ۔ کشمیری گائیڈ نے انہیں ڈھلان پر ہی ایک جھاڑی کے پیچھے بٹھالیا تھا ۔ وہ سرگوشی میں کہہ رہا تھا ۔

" یہ انڈین فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے ۔ یہاں سے خطرناک ترین علاقہ شروع ہو رہا ہے ۔ اب ہماری ذرا سی کھانسی ' ذرا سی اونچی آواز ہماری جان اور تمہارے مشن کی دشمن بن سکتی ہے چار چار قدم کا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے پیچھے آجاؤ " ۔

ڈھلان میں جگہ جگہ گڑھے تھے ۔ گائیڈ ان کی راہ نمائی کر رہا تھا ۔ جدھر جاتا ادھر ہی دونوں جوان جاتے ۔ وہ جھک کر چل رہے تھے ۔ شبنم کی وجہ سے ڈھلان کی بے طرح اگی ہوئی جنگلی گھاس گیلی تھی جس کی وجہ سے کوئی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی ۔ گائیڈ انہیں سیدھا نیچے اتارنے کی بجائے ترچھا ہو کر ڈھلان پر مشرق کی طرف چل رہا تھا ۔ یہاں چیڑھ کے اونچے اونچے درخت بھی تھے اور چنار کے گھنے درخت بھی جو فاصلے فاصلے پر اگے ہوئے تھے ۔ ڈھلان سے نیچے اترنے کے بعد ایک تنگ راستہ آگیا جو دو پہاڑیوں کے درمیان بنا ہوا تھا ۔ یہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ لگتا تھا دونوں پہاڑ ایک دوسرے سے ملتے ملتے رہ گئے ہیں ۔ اس درے میں کانٹے دار جھاڑیوں کی بہتات تھی ۔ وہ ان پر قدم جما کر ست سی رفتار چل رہے تھے ۔ اس پہاڑی درے کے دوسرے سرے پر پہنچ کر گائیڈ رک گیا ۔ اس نے پیچھے گھوم کر علی رضا اور رب نواز کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا ۔ دونوں جلدی سے وہیں بیٹھ گئے ۔

اس کے ساتھ ہی رات کی خاموش فضا میں کسی ٹرک کے سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی ۔ علی رضا اور رب نواز کی آنکھیں چمکنے لگیں ۔ گائیڈ نے اپنا سر ان کے سروں کے ساتھ جوڑ رکھا تھا ۔ خشک آواز میں اس نے آہستہ سے کہا ۔

" میں نے ادھر ایک فوجی ٹرک کی روشنی دیکھ لی تھی ۔ ٹرک پہلے سے رکا ہوا تھا " ۔

" کیا آگے کوئی سڑک ہے " ۔

رب نواز نے سرگوشی میں پوچھا ۔

گائیڈ نے کہا ۔

" ہاں ۔ چھوٹی پہاڑی سڑک ہے ۔ اس سڑک کو پھاند کر ہمیں نیچے جانا ہو گا ۔ جہاں پہاڑی نالہ بہتا ہوا آگے پل کی طرف جاتا ہے " ۔

فوجی ٹرک کا انجن گھر گھر کر رہا تھا ۔ پھر ایک تیز آواز کے ساتھ اس کا گیئر لگا اور اس کی آواز دور ہونے لگی ۔ جب ٹرک کی آواز کافی دور چلی گئی تو علی رضا نے دھیمی آواز میں گائیڈ سے کہا ۔

" اب ہمیں سڑک پار کر لینی چاہئے " ۔

کشمیری گائیڈ نے علی رضا کے کاندھے کو ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا ۔

" مجھے آگے دیکھ آنے دو " ۔

علی رضا اور رب نواز وہیں پہاڑی درے میں بیٹھے رہے ۔ گائیڈ درے میں سے نکل کر دوسری طرف چلا گیا ۔ اس کے جانے کے فوراً بعد ایک اور فوجی ٹرک کی آواز سنائی دی ۔ یہ آواز پیچھے سے قریب آ رہی تھی ۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے ٹرک کی آواز بھی آنے لگی ۔ علی رضا نے اندھیرے میں رب نواز کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا ۔

" فوجی کانوائے لگتا ہے " ۔

اندھیرے میں گائیڈ تیز تیز قدم اٹھاتا جھکا جھکا ان کے پاس آ کر گھبرائی ہوئی سرگوشی میں بولا ۔

" یہاں سے نکل چلو ۔ بڑا لمبا فوجی کانوائے ہے ' آج کی رات تم آگے نہیں جا سکو گے " ۔

یہ بھی ان دونوں جانبازوں کی ٹریننگ کا ایک حصہ تھا کہ ٹارگٹ پر پہنچ کر خطرے میں کود جانا ہے مگر ٹارگٹ سے پہلے کسی خطرے کو مول نہیں لینا ۔ انڈین فوج کے ٹرکوں کی آواز کے ساتھ اب کسی فوجی کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی ۔ جس سڑک پر سے انڈین فوج کے یہ ٹرک گزر رہے تھے وہ درے کے آگے نچان میں بالکل قریب ہی تھی ۔

وہ دونوں وہاں سے واپس مڑے اور گائیڈ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے ۔ ایک بار پھر ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر وہ جھاڑیوں میں بیٹھ گئے ۔ علی رضا نے پیچھے مڑ کر دیکھا ۔ نیچے اسے سڑک تو نظر نہ آئی مگر ٹرکوں کی روشنی آگے بڑھتی صاف دکھائی دے رہی تھی ۔ گائیڈ نے

کہا۔

"یہاں مت رکو۔ چلے آؤ۔ انڈین فوج کی مزید نفری پہنچ رہی ہے۔"

رب نواز نے جواب میں کہا۔

"ہو سکتا ہے یہ سپلائی کے ٹرک ہوں"۔

گائیڈ نے جواب میں کہا۔

"سپلائی کے ٹرک پہلی دوسری کو آتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ آ جاؤ اب"۔

وہ ٹیلے کی اترائی پر سے ہوتے ہوئے ایک بار پھر دشوار گزار پہاڑی علاقے میں آ گئے۔ علی رضا نے گائیڈ سے کہا۔

"ہم یہیں کہیں چھپ کر باقی کی رات اور اگلا دن گزار دیتے ہیں۔ یہاں ہم ٹارگٹ کے قریب ہیں"۔

گائیڈ رک گیا۔ دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"یہاں کوئی چھپنے کی جگہ نہیں۔ ان کی روشنی میں آس پاس کے ٹیلوں کی پوسٹوں پر سے ادھر نگاہ پڑ سکتی ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ یہاں قریب ہی ایک جگہ ہے"۔

گائیڈ انہیں مشرق کی جانب اونچے اونچے درختوں کے درمیان سے گزار کر نیچے ایک کھڈ کے کنارے لے آیا۔

"دیکھ کر چلنا۔ تمہارے بائیں جانب کھڈ ہے"۔

گائیڈ نے انہیں خبردار کیا۔ اس کھڈ کے کنارے ٹیلے کی ڈھال کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا کچا پہاڑی رستہ بنا ہوا تھا۔ یہ رستہ تھوڑی دور جا کر ختم ہو گیا اور آگے پہاڑ کی دیوار آ گئی۔ علی رضا اور رب نواز رک گئے۔ گائیڈ آگے آگے تھا۔ وہ پہاڑ کی دیوار کے پاس جا کر غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا ہیولا پھر نمودار ہوا۔ قریب آ کر اس

نے آہستہ سے کہا۔

"یہاں ایک چھوٹی سی کھوہ ہے۔ وہاں تم وقت گزار سکتے ہو۔ میرا خیال ہے ادھر کبھی کوئی گشت کرتا سپاہی نہیں آتا"۔

کھوہ میں اندھیرا تھا اور بکریوں کی مینگنیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ علی رضا نے ہاتھ اوپر کیا اس کا ہاتھ کھوہ کی چھت سے جا لگا۔ وہ کھوہ کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ گائیڈ دھیمی آواز میں بولا۔

"تمہیں آج کی رات اور کل کا سارا دن اسی کھوہ میں گزارنا ہے۔ موقع محل دیکھ کر میں دن میں کسی وقت تمہارے لئے کچھ کھانے کو لے کر آؤں گا۔ یہاں آس پاس کوئی چشمہ نہیں ہے۔ تمہیں پانی کے بغیر کافی دیر تک رہنا ہو گا"۔

علی رضا نے کہا۔

"ہم رہ لیں گے، فکر نہیں"۔

گائیڈ کہنے لگا۔

"یہ یاد رکھنا کہ تم کھوہ میں نہیں موت کے منہ میں بیٹھے ہو۔ تمہاری ذرا سی بے احتیاطی تمہیں موت سے دوچار کر سکتی ہے۔ یہاں سے ہرگز باہر مت نکلنا۔ میں سارا جائزہ لے کر کل کسی وقت آنے کی کوشش کروں گا۔ اللہ کے حوالے"۔

یہ کہہ کر گائیڈ کھوہ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد علی رضا نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ پھر رب نواز سے کہا۔

"ابھی کافی رات باقی ہے۔ تم سو جاؤ۔ میں گارڈ ڈیوٹی دیتا ہوں"۔

رب نواز نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے کرائیں"۔

اور وہ وہیں کھوہ میں ٹانگیں لپیٹ کر لیٹ گیا۔ علی رضا نے اپنی سٹین گن پیچھے لٹکائی۔ چاقو کھول کر ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا اور کھوہ سے نکل کر کھڈ کے تنگ راستے پر جھک کر چلتا ہوا اس جگہ آ کر بیٹھ گیا جہاں سے اسے پہاڑی کی دوسری جانب کے درخت اور

کھلی جگہ رات کی تاریکی میں دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں سے چڑھائی اوپر ٹیلے کی طرف جاتی تھی۔ ٹیلے کے اوپر ستاروں سے روشن آسمان کا نیلا کنارہ نظر آتا تھا۔ وہ وہیں ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی عقابی نظریں اردگرد کا برابر جائزہ لے رہی تھیں۔ فوجی ٹرکوں کی آواز اب خاموش ہو گئی تھی لیکن اس طرف سے اب بھی فوجیوں کے ایک دوسرے کو آواز دینے کی دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ پھر یہ آوازیں بھی رک گئیں اور سارا علاقہ ایک بار پھر گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔

میں بھی اس جگہ موجود تھا۔ مگر مجھے پاک فوج کا جیالا جانباز کمانڈو علی رضا دیکھ نہیں سکتا تھا۔ مجھے خود اپنا آپ ایک لطیف دھندلے سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔ کسی وقت میرے وجود کا یہ دھندلا سا سایہ بھی میرے شعور کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ مجھے اپنے راہ نما سبز پوش کی موجودگی کا غیر شعوری طور پر احساس ضرور تھا، مگر اس کا ہیولا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پاک فوج کے جانباز کو دیکھا۔ وہ مجھے اندھیرے میں بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے پہاڑی کی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ مگر وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ کھلا ہوا چاقو اس کے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں جیسے جنگل کے ایک ایک درخت، گھاس کی ایک ایک پتی کو غور سے دیکھ رہی ہوں اور خطرے کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

تب میرے کانوں نے سبز پوش کی لطیف اور شفیق آواز سنی۔ سبز پوش کہہ رہا تھا۔

"جانتے ہو پاک فوج کا یہ سرفروش مجاہد دشمن کے گھر میں آکر، موت کے پیٹ میں گھس کر کیوں جاگ رہا ہے؟ کیا اس خطرناک سرد رات میں اس کا دل جاپانی کمبل اوڑھ کر سجے ہوئے خوشبودار بیڈ روم کے ریشمی پلنگ پر آرام سے سو جانا نہیں چاہتا؟ مگر نہیں۔ اس نے اپنی نیند اس لئے قربان کر دی ہے کہ تم پاکستان میں اپنے گھروں کے بیڈ روموں میں سکون کی نیند سو سکو۔ اس نے اپنی زندگی اور اپنے بیوی بچوں کا مستقبل اس لئے داؤ پر لگا دیا ہے کہ تم عزت آبرو کی زندگی بسر کر سکو اور تمہارے بچوں کا مستقبل روشن ہو۔ اسے کیا پڑی ہے کہ گھر کا آرام اور بیوی بچوں کی محبت

اور پیار چھوڑ کر اس ٹھٹھرتی رات میں موت کی پل صراط پر آکر بیٹھ جائے۔ یہ اگر چاہے تو یہاں سے آسانی سے واپس بھی جا سکتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں یورپ کے کئی کمانڈو ایسے ہوتے تھے جن کو پیراشوٹوں کے ذریعے دشمن کے مورچوں کے پیچھے گرایا جاتا اور وہ اپنی جان موت کے منہ میں ڈالنے کی بجائے ادھر ادھر سے ہو کر واپس آ جاتے تھے اور رپورٹ دیتے کہ ٹارگٹ نہیں ملا یا ٹارگٹ پر دشمن کی بھاری نفری تھی۔ مگر پاک فوج کا کمانڈو تو شہادت کا رتبہ حاصل کرنے کے لئے موت کو آگے لگا کر دشمن کے مورچوں کے پیچھے نکل آتا ہے۔ اور وہ ٹارگٹ تباہ کرنے سے پہلے شہید نہیں ہوتا۔ اس کے لبوں پر نبی کریم ؐ کا کلمہ ہوتا ہے اور سینے میں قرآن پاک کی امانت۔ جاؤ اس کے ہونٹوں کے ساتھ کان لگا کر سنو۔ یہ بھوکا پیاسا پاک فوج کا جوان قرآن کریم کی آیات کا ورد کر رہا ہے۔ کاش تم دیکھ سکتے کہ اس جنگل کے سارے درخت، درختوں کا ایک ایک پتا کس طرح ہمہ تن گوش ہے۔ کاش تمہاری دنیاوی آنکھ ان فرشتوں کو دیکھ سکتی جو آسمان سے اتر اتر کر اسلام اور نبی پاک ؐ کے دین برحق اور قرآن کی حرمت پر اپنی جان کی بازی لگا دینے والے اس جوان کی نورانی پیشانی کو چوم رہے ہیں ——— کاش تم دیکھ سکتے۔ کاش تم اس جذبے کو پہچان سکتے ———:"

سبز پوش کی آواز جیسے رات کے سناٹے میں اس پہاڑی جنگل کی تاریک فضاؤں میں گونجنے لگی۔ پھر یہ آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ میں بولنا چاہتا تھا مگر کچھ کہنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ صرف ایک الوہی احساس ہی احساس تھا۔ الفاظ بہت پیچھے رہ گئے۔ الفاظ کہیں سنائی نہیں دیتے تھے۔ ایک ایسی پاکیزہ خوشبو فضا میں رچ گئی تھی

جس کا احساس مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے علی رضا کی طرف دیکھا۔ اس پر نیند کے ذرا سے بھی اثرات نہیں تھے۔ وہ اسی طرح چیتے کی مانند ہوشیار اور چوکس بیٹھا اندھیرے میں گھور رہا تھا۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ پھر مشرق کی جانب پہاڑیوں کے اوپر آسمان کا کنارہ سلیٹی رنگ کا ہونے لگا۔ اس رنگ نے آہستہ آہستہ گلابی رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ علی رضا اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اس کی عقابی نظریں صبح کی گلابی روشنی میں دھیرے دھیرے نکھرتے درختوں اور پتھروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر وہ وہیں سے مڑا اور گہری کھڈ کے کنارے کنارے چل کر اس کھوہ میں آ گیا، جہاں اس کا ساتھی جوان رب نواز گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ اس لئے گہری نیند سو رہا تھا کہ اس کا ساتھی جوان جاگ رہا تھا۔ علی رضا نے آہستہ سے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ رب نواز جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ پاک فوج کے جیالے جوان کبھی غفلت کی نیند نہیں سوتے۔ وہ صرف اپنے اعصاب کو پھر سے مقابلے کے لئے تیار کرنے کے لئے نیند لیتے ہیں۔ علی رضا نے اپنی سٹین گن کاندھے سے اتار کر کھوہ میں ایک طرف رکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"سب ٹھیک ہے گرائیں۔ گارڈ ڈیوٹی پر جاؤ۔ خطرہ ہو تو مجھے جگا دینا۔ گائیڈ آئے تب بھی جگا دینا"۔

"فکر نہیں"۔

یہ کہہ کر رب نواز نے سٹین گن کاندھے پر ڈالی۔ ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا اور کھوہ سے باہر نکل آیا۔ اب سورج کی روشنی ساری وادی اور کھڈوں میں پھیل چکی تھی۔ رب نواز کھڈ کے کنارے چھوٹے سے کچے راستے پر کہنیوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا پہاڑی کی دیوار کے کنارے پر آ کر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ کھلا ہوا چاقو اس نے اپنی کمر میں

اڑس لیا اور ہاتھوں میں سٹین گن تھام لی۔ وہ پتھروں کے پیچھے اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کا پورا جسم چھپا ہوا تھا۔ صرف سٹین گن کی نالی پتھروں میں سے باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں کسی درخت پر کوئی پرندہ تھوڑی دیر بول کر چپ ہو جاتا تھا۔ عقب میں نیچے وادی کی جانب سے کسی وقت ٹرک یا جیپ کی آواز آ جاتی تھی۔

ابھی تک کوئی انڈین سپاہی ادھر گشت کرتا نظر نہیں آیا۔ رب نواز کی آنکھیں درختوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سورج مشرقی پہاڑیوں کے کافی اوپر آ گیا تھا اور چاروں طرف دھوپ پھیل گئی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ سورج درختوں کے اوپر آ گیا تھا۔ اتنے میں رب نواز نے ایک کشمیری چرواہے کو دیکھا جو دو بکریوں کو آگے آگے لگائے انہیں ہانکتا چلا آ رہا تھا۔ پہلے اس نے کوئی خیال نہ کیا، لیکن جب چرواہا درختوں میں ذرا قریب آیا تو اس نے پہچان لیا۔ یہ ان کا گائیڈ غفار تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی تھی جس کی مدد سے وہ بکریوں کو چلا رہا تھا۔

گائیڈ درے کے قریب آ کر رک گیا اور دونوں بکریوں کی رسیاں تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر وہ اٹھا اور بکریوں کو ہانکتے ہوئے کھڈ کے کنارے آیا۔ اس نے رب نواز کو گارڈ ڈیوٹی دیتے دیکھ لیا تھا۔ رب نواز اٹھا اور جھک کر واپس مڑا اور پہاڑی کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھوہ میں گھس گیا۔ اس نے جاتے ہی اپنے ساتھی علی رضا کو جگا دیا۔

"وہ آ گیا ہے گرائیں"۔

گائیڈ دونوں بکریوں کو لے کر کھوہ کے اندر آ گیا۔ بکریاں چھوٹے قد کی تھیں۔ علی رضا نے پوچھا۔

"تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

گائیڈ بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لو کھانا کھا لو پانی نہیں لا سکا۔ بکریاں لا یا ہوں ان کا دودھ پی لینا"۔

وہ جوار کی بڑی بڑی چار روٹیاں اور آم کا اچار لایا تھا۔ رب نواز اور علی رضا کو بڑی بھوک لگی تھی۔ وہ روٹی کھانے لگے۔ مگر ایک ایک روٹی سے زیادہ نہ کھا سکے۔

انہوں نے جی بھر کو بکریوں کا دودھ پیا۔ علی رضا نے دوسرا سوال صورت حال کے بارے میں کیا۔ گائیڈ بولا۔

"میں نیچے اپنے آدمی کے گاؤں میں تھا۔ وہیں سے تمہارے لئے روٹیاں پکوا کر لایا ہوں۔ اگر کوئی خطرے کی بات ہوتی تو ادھر نہ آتا۔ اب جاتا ہوں۔ رات کو بارہ بجے کے بعد آؤں گا"۔

پھر اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں تو کوئی نہیں آیا تھا؟"

رب نواز نے نفی میں سر ہلایا۔ گائیڈ بکریوں کو لے کر کھوہ سے نکل گیا۔ دونوں جانباز باری باری چھپ کر گارڈ ڈیوٹی دیتے رہے۔ اس طرح شام ہو گئی۔ پہاڑی علاقوں میں رات کا اندھیرا بڑی تیزی سے چھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سورج کے پہاڑوں کی اوٹ میں اترنے کے بعد شام کی روشنی بھی باقی نہیں رہتی۔ دونوں جانباز کمانڈو رات کے اندھیرے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ علی رضا نے رب نواز کو کھوہ میں بیٹھنے کو کہا اور خود کھڈ کے کنارے پہاڑ کی اوٹ میں آکر بیٹھ گیا۔ اس نے سر آگے کر کے آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے آسمان پر کوئی ستارہ نظر نہ آیا۔ سرد ہوا چلنے لگی تھی۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ علی رضا کمبل کی بکل مارے سٹین گن کی نالی باہر نکالے بیٹھا رہا۔

آدھی رات گزر جانے کے بعد ان کا گائیڈ آ گیا۔ وہ آتے ہی بولا۔

"شاید بارش ہو۔ بادل بڑے گہرے ہیں"۔

علی رضا نے کہا۔

"بارش میں ہمیں ٹارگٹ تک پہنچنے میں آسانی ہو گی۔ بارش کی آواز ہمارے قدموں کی آواز کو چھپا لے گی"۔

گائیڈ نے دونوں جانبازوں کو ساتھ لیا اور کھوہ سے نکل کر درختوں کے نیچے آ گئے۔ یہاں سے نشیب میں ایک پگ ڈنڈی کھڈ میں اترتی تھی۔ کھڈ میں پتھروں اور جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ابھی تک بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔ گائیڈ اندھیرے میں ان کے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ وہ اس سارے راستے سے واقف تھا۔ کافی آگے جا کر وہ

کھڈ سے باہر نکل آئے۔ یہاں دونوں طرف پہاڑی ٹیلے رات کے اندھیرے میں بھوتوں کی طرح کھڑے تھے۔

گائیڈ نے سرگوشی میں کہا۔

"آگے ٹیلے پر دشمن کی چوکی ہے۔ اس کے نیچے سے سانس روک کر گزرنا"۔

علی رضا اور رب نواز نے ٹیلے کی طرف دیکھا۔ اندھیرے میں وہاں انہیں کچھ نظر نہ آیا۔ وہ گائیڈ کے پیچھے پیچھے چل پڑے، ٹیلے کے نیچے پہنچ کر انہوں نے رفتار سست کر لی۔ وہ قدم دبا دبا کر چل رہے تھے۔ ٹیلے کے اوپر سے کسی فوجی کے دوسرے فوجی کو بلانے کی آواز آئی۔ علی رضا، رب نواز اور گائیڈ وہیں بیٹھ گئے۔ دوسرے انڈین فوجی نے پہلے فوجی کو گالی دی۔ دونوں ہنس پڑے۔ اس کے بعد گہرا سناٹا چھا گیا۔ گائیڈ نے ٹھیک کہا تھا۔ اس ٹیلے کے اوپر انڈین فوج کی پوسٹ تھی۔ وہ ٹیلے کے نیچے سے گزر گئے۔ آگے جگہ اونچی نیچی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔ گائیڈ اندھیرے میں انہیں کھڈوں اور کھائیوں سے بچاتا ہوا لے جا رہا تھا۔ اتنے میں ٹیلوں کے پیچھے ایک روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ وہ جلدی سے وہیں بیٹھ گئے۔ روشنی راؤنڈ آسمان پر جا کر پھٹا اور اس کی روشنی سارے علاقے میں پھیل گئی۔ پھر وہ ٹیلوں کی اوٹ میں اپنی روشنی کو سمیٹتا ہوا غائب ہو گیا۔

علی رضا نے گائیڈ سے پوچھا۔

"پہاڑی نالہ کتنے فاصلے پر ہے؟"

گائیڈ نے سرگوشی کی۔

"یہاں سے آدھا فرلانگ ہو گا۔ مگر اب نالے کے پیچھے جانا ٹھیک نہیں ہے۔ فوج روشنی کے گولے چلانے لگی ہے۔ اس روشنی میں تم دیکھے جا سکتے ہو"۔

علی رضا فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"تم ہمیں پل کے پیچھے نالے تک پہنچا دو۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم ہو جائے گا اور ہمارا کام شروع ہو گا"۔

"جیسے آپ کی مرضی۔"

یہ کہہ کر گائیڈ آگے بڑھ گیا۔ ٹھیک اس وقت ہلکی ہلکی پھوار شروع ہو گئی۔ علی رضا نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بجلی نہیں چمک رہی تھی۔ گائیڈ بیٹھ گیا۔ اب وہ تینوں بیٹھ کر چل رہے تھے۔ ایک ٹیلے کے کٹاؤ میں سے گزرنے کے بعد علی رضا کو پہلی بار پہاڑی نالے کے پانی کی ہلکی ہلکی آواز آئی۔ وہ نشیب میں اتر رہے تھے۔

اترائی ختم ہو گئی۔ آگے تھوڑے سے اونچے پہاڑی کناروں کے نیچے وہ نالہ بہہ رہا تھا جس پر آگے جا کر پل بنا ہوا تھا۔ یہی پل انہیں اڑانا تھا۔ گائیڈ نے سر آگے کر کے انہیں نالہ دکھایا اور سرگوشی میں کہا۔

"یہاں سے آگے کا فرلانگ جاؤ گے تو پل آ جائے گا۔ اب میں جاتا ہوں۔ خدا اور اس کا رسول تمہاری حفاظت کرے۔"

اتنا کہہ کر غفار گائیڈ نے دونوں کو باری باری سینے سے لگایا اور جدھر سے آیا تھا ادھر رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ علی رضا اور رب نواز نے کمبلوں کو اپنے اوپر اس طرح سے ڈال لیا کہ اگر روشنی راؤنڈ فائر ہوتا تو وہ جھاڑیوں کی طرح دکھائی دیتے۔ ابھی تک بارش کی پھوار ہی پڑ رہی تھی اور وہ بوندا باندی یا موسلا دھار بارش میں تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف ڈھلان سے اتر کر وہ پہاڑی نالے کے کنارے پر آ گئے۔

انہیں بتایا گیا تھا کہ پیچھے نالے پر کسی جگہ بھارتی فوج کی گن پوسٹ موجود ہے۔ وہ اندھیرے میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے اسی گن پوسٹ کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نالے کا پانی چھوٹے بڑے پتھروں سے ٹکرا کر ہلکا شور پیدا کرتا ہوا بہہ رہا تھا۔ نالہ ایک طرف گھوم گیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر بجلی کے دو چار قمقمے جھلملاتے نظر آئے۔ رب نواز نے علی رضا کا کندھا دبایا اور اس کے کان میں کہا۔ "یہی وہ پل ہے"۔

علی رضا کی آنکھیں بھی اس روشنی پر تھیں۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھتے گئے۔ اچانک انہیں فضا میں سگریٹ کے تمباکو کی بو محسوس ہوئی۔ علی رضا نے رب نواز کو وہیں بٹھا لیا۔ تمباکو کی بو رب نواز نے بھی سونگھ لی تھی۔ علی رضا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"مشین گن پوسٹ میں کوئی سگریٹ پی رہا ہے"۔

علی رضا وہیں اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ رب نواز نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ رینگنے لگے۔

نالے کا کنارا وہاں سے کوئی پانچ چھ فٹ اونچا تھا۔ کسی نے اوپر سے جلتا ہوا سگریٹ نالے میں پھینکا۔ سگریٹ کا جلتا ہوا ٹکڑا چھوٹے انگارے کی طرح ان کے اوپر سے ہو کر نالے کے پانی میں جا گرا۔ گن پوسٹ ان کے اوپر ہی تھی۔ انہوں نے سانس روک لیا اور بڑی احتیاط سے آواز پیدا کئے بغیر وہاں سے گزر گئے۔ آگے جا کر نالے کا کنارا نیچا ہونے لگا تھا۔ پھر وہ زمین کے ساتھ مل گیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر دو پہاڑیوں کے درمیان بنا ہوا پل انہیں بجلی کے دو قمقموں کی روشنی میں اب نظر آنے لگا تھا۔ بجلی کے یہ قمقمے پل کے دونوں سروں پر روشن تھے۔ اب انہیں بڑی احتیاط سے نالے کے پانی میں اترنا تھا اور پھر پانی میں ہی پل کی طرف بڑھنا تھا۔

اچانک ایک اور روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ انہوں نے اپنے سر جلدی سے زمین کے ساتھ لگا لئے۔ روشنی راؤنڈ تھوڑی دیر فضاء کو روشن کرنے کے بعد ٹیلے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا۔ راؤنڈ کی روشنی میں علی رضا نے دیکھ لیا تھا کہ پہاڑی نالے میں جگہ جگہ پتھروں کے ساتھ تار بندھے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ نالے میں بھی بارودی سرنگیں بچھائی ہوئی تھیں۔ اس نے رب نواز کے کان میں سرگوشی میں یہ بات بتا دی اور کہا کہ اب ہم پل کی طرف سے جائیں گے۔ رب نواز نے آہستہ سے کہا۔

"فکر نہیں"۔

وہیں لیٹے لیٹے انہوں نے اندھیرے میں ڈائنامیٹ کی چھڑیوں کے دونوں بنڈل نکال کر سلنگ کی مدد سے اپنے اوپر پیٹھ پر ڈال لئے۔ علی رضا آگے آگے تھا اور رب نواز اس کے پیچھے پیچھے رینگ رہا تھا۔ بارش ابھی تک پھوار کی شکل میں پڑ رہی تھی۔ ٹیلے کے عقب میں گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ دونوں رینگتے رینگتے وہیں رک گئے اور سر گیلی گھاس کے ساتھ لگا دیئے۔ ٹیلے کے اوپر سے ایک ہیلی کاپٹر اڑتا ہوا اوپر آیا۔ اس کی سرخ روشنی جگنو کی طرح جل بجھ رہی تھی۔ یہ انڈین آرمی کا ہیلی کاپٹر ہی ہو سکتا تھا۔ وہ زیادہ بلندی پر نہیں تھا۔ وہ اڑتا ہوا ان کے سروں کے اوپر سے گزر گیا اور پھر اس کی جلتی بجھتی لال روشنی دوسری طرف ٹیلوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔

اس کے ساتھ ہی دونوں جانبازوں نے دوبارہ پل کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ پل

قریب آ گیا تھا۔ یہ نالے کے پانی سے کافی بلندی پر تھا۔ اور نالے میں صرف اس کا ایک
ہی ستون اترا ہوا تھا۔ پل کے دونوں سروں پر کھمبوں کے ساتھ بجلی کے بلب روشن تھے۔
ان کی روشنی صرف وہیں تک ہی محدود تھی۔ مگر اس روشنی میں انہوں نے ایک سنتری
کو گشت کرتے دیکھ لیا تھا۔ علی رضا رک گیا اور رب نواز کے کان میں بولا۔

"صرف ایک سنتری ہے"۔

رب نواز نے علی رضا کے کان میں کہا۔

"پل کے اوپر ٹیکری پر گن پوسٹ ہے"۔

علی رضا کو اندازہ تھا کہ ٹیکری پر گن پوسٹ ضرور ہو گی۔ اس وقت ہلکی بارش
شروع ہو گئی۔ انہوں نے اپنے کمبل وہیں زمین پر ایک طرف رکھ دیئے۔ وہ آہستہ آہستہ
کہنیوں کے بل آگے رینگ رہے تھے۔ بارش تیز ہو گئی۔ علی رضا یہی چاہتا تھا۔ بارش
کی تیز آواز میں انہیں رینگنے میں آسانی ہو گئی۔ پل کے اوپر بھارتی فوج کا سنتری اس
طرح چل پھر کر پہرہ دے رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے پل کے ایک سرے کی طرف جاتا اور پھر
وہاں سے پلٹ کر واپس دوسرے سرے تک آ جاتا۔ پل کی لمبائی زیادہ نہیں تھی۔ زیادہ
سے زیادہ بیس پچیس گز ہو گی۔ علی رضا نے صورت حال کا پوری طرح سے جائزہ لیا اور
رب نواز کے کان میں کہا۔

"ایک سو بیس تک گنتی کرنا۔ اگر میں نہ آیا تو تم پیچھے آ جانا"۔

اتنا کہہ کر علی رضا رینگتا ہوا پل کی طرف بڑھا۔ رب نواز نے دل میں گنتی شروع کر
دی۔ وہ ایک ایک سیکنڈ کا وقفہ ڈال کر گنتی کر رہا تھا۔ علی رضا جھاڑیوں کے پیچھے سے ہو
کر رینگ رہا تھا۔ پل کے سرے پر جو بلب کھمبے کے ساتھ جل رہا تھا اس کی روشنی میں
اس نے کچھ اوپر آگے کو نکلے ہوئے ایک چبوترے پر ایک فوجی گاڑی کھڑی دیکھی۔ بارش
تیز ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یقیناً وہاں مشین
گن پوسٹ ہو گی، مگر وہ جگہ اسے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی جہاں سے پل شروع ہوتا تھا۔
وہاں ایک چٹان نالے کی جانب باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کی اوٹ میں چھپا جا سکتا تھا۔
سنتری دوسرے سرے سے ہو کر واپس پلٹا۔ پل پر اس کے فوجی بوٹوں کی دھمک
صاف سنائی دے رہی تھی۔ علی رضا نے سر نیچے کر لیا۔ سنتری پل کے سرے پر آ کر دو

سیکنڈ کے لئے رکا۔ پھر پلٹا اور دوسری طرف چلنے لگا۔ ایک سو بیس کی گنتی پوری ہو گئی
تھی۔ رب نواز نے دل میں کلمہ شریف پڑھا اور پل کی طرف رینگنے لگا۔ بارش میں اس
کے کپڑے شرابور ہو گئے تھے۔ مگر اسے بارش کا احساس ہی نہیں تھا۔ اسے زمین پر اپنے
ساتھی علی رضا کا ابھرا ہوا جسم اندھیرے اور پل کی روشنی میں دکھائی دیا۔ یہاں تک پل
کے بلب کی روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ رینگتا ہوا علی رضا کے پہلو میں آ گیا۔ علی
رضا نے اپنا منہ اس کے کان کے ساتھ لگا دیا اور سرگوشی میں کہا۔

"ایک ہی سنتری ہے۔ میں اسے قابو کروں گا۔ دوسرے سرے پر
میں ڈائنامیٹ لگا دوں گا۔ اس طرف تم لگاؤ گے۔ اس کے بعد اپنا
اپنا آڈر اور اپنا اپنا راستہ ہو گا۔ زندگی رہی تو پاکستان میں مل لیں
گے، نہیں تو حشر کے دن ملاقات ہو گی"۔

یہ کہہ کر علی رضا آگے بڑھا۔ رب نواز نے اس کے پیچھے دو قدم کا فاصلہ ڈال دیا اور
پھر وہ بھی رینگنے لگا۔ علی رضا نالے کے کنارے کنارے جو چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اگی ہوئی
تھیں ان کی آڑ میں رینگ رہا تھا۔ رب نواز اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ علی رضا پل کے
سرے پر چٹان کے نیچے پہنچ کر ساکت ہو گیا۔ رب نواز دو قدم پیچھے وہیں بے حس و
حرکت پڑا رہا۔ انڈین سنتری پل کی اس طرف چلا آ رہا تھا۔ یہ دبلا پتلا شاید کوئی مدراسی
سپاہی تھا۔ پل کے سرے پر آ کر وہ حسب معمول دو تین سیکنڈ کے لئے رکا رہا۔ پھر واپس
پلٹا اور دوسرے سرے کی طرف چہل قدمی کرتا نکل گیا۔ بارش میں وہ شرابور تھا۔ اس
کی سٹین گن اس کے ہاتھ میں ہی تھی۔

علی رضا نے اپنی بائیں جانب دیکھا۔ پل کی روشنی میں اسے تھوڑی سی اونچائی پر
گھاس کا ایک ڈھیر سا دکھائی دیا۔ یہ یقیناً مشین گن پوسٹ ہی تھی۔ علی رضا کو اس گن
پوسٹ کی نگاہوں سے بچنا تھا۔ مگر اب سوچنے اور غور کرنے کا وقت نکل چکا تھا۔ وہ
ٹارگٹ پر پہنچ چکا تھا۔ اب ٹارگٹ کو اڑانا تھا یا خود اڑ جانا تھا۔ رب نواز اس کے پیچھے
رکا ہوا تھا۔ بادلوں میں ہلکی سی گرج پیدا ہوئی اور بارش مزید تیز ہو گئی۔ علی رضا کی
آنکھیں سنتری پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ پل کے دوسرے سرے پر سے واپس آ رہا تھا۔
بارش کی آواز میں اس کے فوجی بوٹوں کی آواز گڈمڈ ہو گئی تھی۔ علی رضا نے اپنا سر چٹانی

پتھر کے نیچے کر لیا۔ اب اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ سٹین گن اور بارود کی چھڑیوں کا بنڈل اس کی پشت پر تھا۔ جونہی مدراسی سپاہی پل کے سرے پر دو سیکنڈ رک کر واپس مڑا علی رضا نے اللہ رسولؐ کو یاد کیا اور چٹان کے نیچے سے نکل آیا۔ وہ سانپ کی طرح رینگتا ہوا پل پر آگیا۔ سنتری اس کے آگے چار قدموں کے فاصلے پر تھا۔ علی رضا اٹھ کر پنجوں کے بل دو قدم چلا اور تیز بارش میں اس نے مدراسی سپاہی پر اس طرح سے چھلانگ لگائی کہ وہ اس کی گرفت سے نیچے بھی نہ گرا، کوئی آواز بھی نہ نکال سکا اور علی رضا کے کمانڈو چاقو نے اس کی گردن بھی ایک طرف سے کاٹ ڈالی۔ مدراسی سپاہی کو لے کر علی رضا وہیں بیٹھ گیا۔ دوسری طرف رب نواز چٹان کے نیچے پہنچ چکا تھا اور پل کے لکڑی کے بڑے بڑے شہتیروں کی قینچی میں بارود کی چھڑیوں کا بنڈل چپکا رہا تھا۔ اس نے علی رضا کو سنتری کو ہلاک کرتے دیکھ لیا تھا۔ رب نواز نے ڈائنا میٹ لگا دیا اور سٹین گن ہاتھ میں لے کر چٹان کی اوٹ میں سے علی رضا کو اپنی گن کا تحفظ دینے لگا۔

علی رضا نے سنتری کی لاش کو وہیں پل پر لٹا دیا تھا جس کی گردن سے ابلتا ہوا خون تیز بارش کے پانی کے ساتھ مل کر نیچے پہاڑی نالے کے تیز رفتار پانی میں گر رہا تھا۔ علی رضا پل کے دوسرے سرے تک رینگ رینگ کر گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ پل کے نیچے ڈھلان میں ہو گیا۔ ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر کسی کمپوٹرائزڈ مشین کی طرح اس نے ڈائنا میٹ شہتیروں کی قینچی کے نیچے لگا دیا۔ ابھی وہ پل کی اوٹ میں ہی تھا کہ کسی نے اوپر سے جہاں فوجی ٹرک کھڑا تھا پل پر ڈیوٹی دیتے مدراسی سپاہی کو آواز دی۔ علی رضا نے سٹین گن سیدھی کر لی۔ جب سنتری کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہیں اس چبوترے پر ایکدم سے سرچ لائیٹ روشن ہو گئی۔ سرچ لائیٹ کی تیز روشنی میں پل روشن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اوپر سے مشین گن کا برسٹ فائر ہوا۔ دو سنتری پل کے پیچھے کہیں سے نکل کر پل کی طرف دوڑے۔ اوپر سے کوئی فوجی چلایا۔ اسی وقت روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ سارا علاقہ اس طرح روشن ہو گیا جیسے دن نکل آیا ہو۔ پل کی طرف دوڑتے ہوئے سپاہیوں میں سے ایک نے علی رضا کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے فائر کیا۔ علی رضا نے سٹین گن سے فائرنگ شروع کر دی۔ دو سپاہی وہیں گر پڑے۔ تیسرے کی گولی علی رضا کے کاندھے پر گردن کے بالکل قریب آ کر لگی۔ مگر اس نے فائرنگ نہ روکی۔ مگر اس کا ایک بازو سن

ہونے لگا تھا۔ اب چاروں طرف جانے کہاں کہاں سے فائر آنے لگا تھا۔ رب نواز ابھی تک دشمن کی نگاہ میں نہیں آیا تھا۔ مشین گن پوسٹ سے آتی ہوئی گولیاں اس کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ رب نواز کو علی رضا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک کوئی فائر نہیں کیا تھا۔ پل کے نیچے اس نے بارود لگا دیا تھا۔ وہ پیچھے کھسکنے لگا۔ ایک اور روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ پل روشن ہو گیا۔ اب اس طرف سے بھی کچھ بھارتی سپاہی فائرنگ کرتے پل کی طرف دوڑے۔ رب نواز نے انہیں پل کی طرف جانے دیا۔ بارش اسی طرح موسلا دھار ہو رہی تھی۔ جب سپاہی پل پر پہنچے تو رب نواز نے پیچھے سے ان پر تین چار برسٹ مارے۔ سپاہی گر پڑے۔ ان میں سے دو سپاہیوں نے پیچھے گھوم کر رب نواز پر فائرنگ شروع کر دی۔ رب نواز پیچھے کھسک گیا۔ اسکے اوپر والی مشین گن پوسٹ اندھا دھند گولیاں برسا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر علی رضا زندہ ہے تو اسے اس گن پوسٹ کی فائرنگ میں فرار ہونے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ وہ پیچھے کھسکتا کھسکتا جھاڑیوں میں سے ہو کر گن پوسٹ کی چڑھائی پر اوپر کی طرف رینگنے لگا۔ اسے ایک جگہ سے سٹین گن کی گولیوں کے شرارے اڑتے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ اس گن پوسٹ کو خاموش کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کے ساتھی علی رضا کو روپوش ہونے کا موقع مل سکے۔ رب نواز رینگتا ہوا مشین گن پوسٹ کے سوراخ کے نیچے آ گیا۔ بجلی کی تیزی کے ساتھ اس نے دو ہینڈ گرنیڈوں کے پن نکالے اور انہیں ایک سیکنڈ گزرنے سے پہلے پہلے گن پوسٹ کے بنکر کے سوراخ کے اندر گرا دیا۔ اس کے فوراً بعد وہ نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ وہ ابھی نیچے نہیں پہنچا تھا کہ ایک دھماکہ ہوا اور مشین گن پوسٹ کا بنکر اڑ گیا۔

اب پل کی اس طرف سامنے سے مشین گنوں کا فائر آنا شروع ہو گیا جہاں رب نواز چھپا ہوا بارود کے پھٹنے اور پل کے اڑنے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہاں گولیوں کے ایسے دھماکے ہو رہے تھے جیسے جنگ شروع ہو گئی ہو۔ وہی ہیلی کاپٹر آ گیا۔ اس نے بھی اوپر سے نیچے پل کے نالے میں فائرنگ شروع کر دی۔

بارش اور گولیوں کی آواز میں کسی نے چیخ کر کہا۔

"پاکستانی گوریلے ہیں۔ پل بچ گیا ہے"۔

علی رضا پل کی دوسری طرف پتھر کی اوٹ میں لیٹا ایک ہی بازو سے سٹین گن کو

سامنے رکھے فائرنگ کر رہا تھا۔ سامنے سے اس پر بھی فائر آ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر نے اوپر سے سرچ لائیٹ کی روشنی پھینکی۔ پل ابھی تک سلامت تھا۔ ہیلی کاپٹر اوپر سے راکٹ فائر نہیں کر رہا تھا کہ پل کو نقصان نہ پہنچے۔ علی رضا جہاں چھپا ہوا تھا پل کے ستونوں کی وہ قینچی بالکل قریب تھی جہاں اس نے بارود لگایا اور جہاں تھوڑی دیر بعد دھماکہ ہونے والا تھا۔ علی رضا اگر چاہتا تو اپنے آپ کو نالے میں گرا کر اپنی جان بچا سکتا تھا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹا اور اس نے فائرنگ بند کی تو بھارتی سپاہی دوڑ کر پل پر آ جائیں گے اور سب سے پہلے پل کے نیچے شہتیروں کو چیک کریں گے اور اس کے لگائے ہوئے ڈائنامیٹ کی چھڑیوں کے بنڈل کو اتار کر نالے میں پھینک دیں گے۔ دوسری طرف رب نواز بھی اسی لگائے ہوئے ڈائنامیٹ کی وجہ سے وہاں سے پیچھے نہیں ہٹ رہا تھا۔ وہ پل سے تھوڑا سا پیچھے پتھروں کے پیچھے چھپا لائیٹ مشین گن سے مسلسل فائرنگ کر رہا تھا اور سپاہیوں کو پل کے اس سرے کی طرف آنے سے روکے ہوئے تھا۔ اوپر سے ہیلی کاپٹر نے اسے دیکھ لیا اور اس پر ایک راکٹ پھینکا۔ راکٹ رب نواز سے چند قدم کے فاصلے پر پھٹا۔ اس نے سر نیچے کر لیا اور ایک بار پھر فائرنگ کرنے لگا۔ چاروں طرف سے گھمسان کی فائرنگ ہو رہی تھی۔ ڈائنامیٹ کیوں نہیں پھٹ رہا؟ یہی ایک سوال تھا جو پل کی اس طرف رب نواز کو اور دوسری طرف علی رضا کو پریشان کر رہا تھا۔ پل کی اس طرف اپنی مشین گن سے رب نواز نے بھارتی سپاہیوں کو آگے بڑھ کر ڈائنامیٹ اتارنے سے روکا ہوا تھا اور دوسری طرف علی رضا شدید زخمی ہونے کے باوجود کسی انڈین سپاہی کو پل کی طرف نہیں آنے دے رہا تھا۔ اپنی مخصوص ٹریننگ کو بروئے کار لاتے ہوئے علی رضا نے ایک ہاتھ اور گھٹنے کی مدد سے سٹین گن کو میگزین چڑھایا اور پھر فائرنگ کرنے لگا۔ وہ پل کے بڑے ستون کے بالکل قریب اوٹ میں بیٹھا گولیاں چلا رہا تھا۔ جونہی کوئی سپاہی فائرنگ کرتا پل کی طرف لپکتا علی رضا اسے برسٹ مار کر وہیں گرا دیتا۔

اب اوپر سے ہیلی کاپٹر نے اس پر بھی فائرنگ شروع کر دی۔ علی رضا نے اپنا سر ستون کے نیچے کر لیا۔ گولیاں اس کے پیچھے شعلے اڑاتی گر رہی تھیں۔ یہ ٹارگٹ سے ٹکرا کر پھٹنے والی لمبی گولیاں تھیں۔ علی رضا کی گن کا رخ سامنے کی طرف تھا۔ ایک

انڈین سپاہی رینگتا ہوا پل کی طرف چلا آ رہا تھا۔ علی رضا نے اسے آنے دیا۔ اس نے ایک نظر پل کے نیچے اپنے قریب ہی شہتیروں میں لگے ہوئے ڈائنامیٹ کو دیکھا۔ وہ ابھی تک نہیں پھٹا تھا۔ یا اللہ! کہیں فیوز تو نہیں اکھڑ گیا۔ پل کی دوسری طرف بھی ابھی دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ انڈین سنتری رینگتا ہوا قریب آ گیا تھا۔ جونہی وہ اٹھ کر پل کی طرف دوڑا علی رضا نے اسے اپنے برسٹ پر لے لیا۔ وہ چکرا کر نیچے گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ علی رضا کا وہ کندھا جس کے اندر گولی گھس گئی تھی بالکل سن ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بازوؤں کو بڑی مشکل سے ہلا سکتا تھا۔ بارش میں اس کا خون بہہ رہا تھا۔ اس کے کاندھے اور گردن میں ٹیسیں پڑ رہی تھیں مگر اس جیالے مجاہد کی آنکھیں دشمن پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے دل میں جیسے چلا کر کہا۔

"اے خدا! بارود کیوں نہیں پھٹتا؟"

اس کے ساتھ ہی ایک قیامت خیز دھماکہ ہوا۔ ایک دھماکہ پل کی اس طرف ہوا اور ایک دھماکہ جیسے علی رضا کے سینے میں ہوا۔ ایک طرف سے پل اڑ گیا دوسری طرف علی رضا کا مادی جسم فضاء میں بکھر کر نور میں تبدیل ہو گیا۔

رب نواز نے دوسری طرف سے پل کو اڑتے دیکھا تو اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ اس کے ساتھ پل کی اس طرف بھی ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور باقی کا پل بھی اڑ گیا۔ وہاں آگ اور بارود کا دھواں ہی دھواں تھا۔ رب نواز نے مشین گن وہیں پھینکی اور اونچے کنارے پر سے نالے میں چھلانگ لگا دی۔ تیز بارش اور گولیوں کی بوچھاڑ میں وہ ٹھنڈے یخ پانی میں گرا۔ پانی کا تیز بہاؤ اسے آگے لے گیا۔ پل کی جگہ اب کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف بارود کا سیاہ اور سفید دھواں اٹھ رہا تھا۔ دشمن کی پوسٹوں سے اب بھی فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر ایک طرف غوطہ لگا گیا تھا۔ رب نواز نے یخ پانی میں اپنے آپ کو چھوڑ دیا۔ موجوں کا تیز بہاؤ اسے آن کی آن میں کہیں کا کہیں لے گیا۔ اب اسے اکیلے ہی دشمن کے علاقے سے نکل کر واپس اپنی رجمنٹ میں پہنچنا تھا۔

میں اسی جگہ مقبوضہ کشمیر کے پہاڑی نالے پر کھڑا تھا۔ میری روح ایک عجیب سرمدی جذبے سے سرشار تھی۔ مجھے ایک روح پرور خوشبو کا احساس ہوا۔ پھر سبز پوش کا روشن ہیولا میرے پہلو میں ظاہر ہو گیا۔ سبز پوش کی نورانی آواز آئی:

"جو کچھ تم نے دیکھا وہ پینسٹھ کی جنگ میں ہو چکا ہے۔ اگر ایسا موقع پھر آیا تو علی رضا اسی طرح پاکستان اور اسلام کے نام پر اپنی جان قربان کر دے گا اور رب نواز موت کے پیٹ میں گھس جائے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے رب نواز اپنی رجمنٹ میں زندہ سلامت پہنچ گیا ہو گا؟ یہ تمہارے اخبار کے میگزین ایڈیشن کی کوئی فرضی ایڈونچر کہانی نہیں ہے جس میں کاغذ کا ہیرو سب کو مار کر زندہ رہتا ہے۔ نہیں یہ زندہ گوشت پوست کے انسانوں کی سچی کہانیاں ہیں۔ ان کی بے مثال جراتوں اور اسلام کے نام پر دھڑکتے ہوئے جذبوں کے سچے واقعات ہیں۔ جس وقت علی رضا اپنے ٹارگٹ کے ساتھ شہید ہوا اور رب نواز نے پہاڑی نالے کے یخ بستہ پانیوں میں چھلانگ لگائی تھی اس وقت تم اپنے گلبرگ والے فلیٹ کے بیڈ روم میں گہری نیند سو رہے تھے اور ساتھ والے فلیٹ میں وی سی آر پر انڈین فلم دیکھی جا رہی تھی۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ قوم کا یہ مزاج تم نے یا تمہارے اخباروں میں چھپنے والی ہیجان خیز کہانیوں نے بنایا تھا کیونکہ یہ وہی قوم تھی جو وقت آنے پر دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں تو تمہاری قوم کے بیٹوں کے سچے واقعات دکھا رہا ہوں۔ یہ تمہاری ہی قوم کے فرزند تھے۔ یہ کل بھی قوم اور وطن کی عزت پر دشمن کے لئے قہر بن گئے تھے اور آج بھی اگر وقت آ گیا تو دشمن پر قہر بن کر ہی ٹوٹیں گے۔ خدا اور اس کے رسولؐ کا نام لینے والی یہی تو ایک قوم ہے جس سے موت بھی کترا کر گزرتی ہے۔ میں نے تو تمہیں جذبہ ایمان کی صرف ایک جھلک دکھائی ہے۔ ابھی تو حق و باطل کے اس میدان کار زار میں جرات و شجاعت کے ایسے ایسے ہزاروں واقعات بھرے پڑے ہیں جن کو دیکھ کر چشم عالم دنگ رہ گئی تھی۔ اب میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں سن پینسٹھ کی جنگ کے ایک دوسرے

محاذ پر لئے چلتا ہوں۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے اور تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ ایک مرد مومن آگ اگلتی توپ سے کیسے ٹکرا جاتا ہے۔ اور بم سینے پر باندھ کر اپنے آپ کو ٹینکوں کے آگے کیسے گرا دیتا ہے اور خود شہید ہو کر دشمن کے ٹینکوں کو آگ کے شعلوں میں کیسے بدلتا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے جذبۂ ایمانی کے نور میں درخشندہ ایک اور دروازہ کھولتا ہوں۔ میرے ساتھ رہنا"۔ میرا ہاتھ سبزپوش کے ہاتھ میں تھا اور میں جیسے ماضی کے بادلوں میں اڑا چلا جا رہا تھا۔

ساری وادی کشمیر دھند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میرا ہاتھ سبزپوش کے ہاتھ میں تھا۔ میں اس کے ہاتھ کا نیم گرم نورانی لمس اپنے سارے وجود میں سرائیت کرتا محسوس کر رہا تھا۔ دھند کے اوپر آسمان گھرے بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ ہم ان بادلوں میں سے گزرتے ہوئے وادیٔ کشمیر کی دھند میں آگئے۔ ہم نیچے اتر رہے تھے۔ پھر دھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگی۔ وادیٔ کے درخت کھیت ندی نالے ٹیلے ٹیکریاں نظر آنے لگے۔ میں سبزپوش کے ساتھ وادیٔ میں ایک جگہ اتر آیا۔ سبزپوش خاموش تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا سبز لبادہ ہلکے ہلکے نور میں نہایا ہوا تھا۔ مجھے اس کی شکل نظر نہیں آرہی تھی۔ ہم ایک ایسے مقام پر کھڑے تھے جہاں ہمارے آس پاس اونچی نیچی زمین پر جنگلی جھاڑیوں اور چیڑھ کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے درخت ہی درخت تھے۔ قریب ہی ایک پہاڑی ندی دھان کے کھیتوں میں سے ہو کر گزر رہی تھی۔

یہ سن پینسٹھ کے کسی مہینے کی سہ پہر تھی۔ میں جانتا تھا کہ سبزپوش مجھے یہاں پاک فوج کے جیالے کمانڈو جانبازوں کے ایمان افروز اور کفرشکن معرکے دکھانے اور ان غازیوں شہیدوں کی زیارت کروانے لایا ہے جنہوں نے اسلام اور پاکستان کا نام بلند رکھنے کے لئے بہادری اور شجاعت کے وہ کارنامے سرانجام دیئے کہ جن کی مثال جدید فوجی تاریخ پیش نہیں کر سکتی تھی۔ سبزپوش ماضی کے ورق الٹ کر دکھا رہا تھا۔ وہ مجھے ان غازیوں اور شہیدوں سے ملوا رہا تھا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کا نام لیتے ہوئے اپنے سے سات گنا بڑی نفری والے دشمن کے مورچوں کے پیچھے نکل گئے۔ وہ واپس آنے کے لئے نہیں گئے تھے۔ انہیں شہید ہونے سے پہلے دشمن کی سپلائی لائن اور اس کے اسلحہ کے ذخیروں کو تباہ کرنا تھا۔ مجھے سبزپوش کی نورانی آواز سنائی دی۔

یہ سن پینسٹھ کا وہ دن ہے جب ہماری فوج کے کمانڈوز کا ایک گروپ یہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر ٹیکری کے پیچھے ایک خفیہ جگہ پر چھپا ہوا ہے۔ میں پاک فوج کی اس

رجمنٹ کا نام نہیں بتاؤں گا جس کے یہ جوان تھے۔ اس کمانڈو گروپ کی قیادت ایک کرنل کر رہے ہیں۔ میں ان کا اصلی نام بھی نہیں بتاؤں گا۔ تم انہیں کرنل طارق کہہ سکتے ہو۔ تھوڑی دیر میں تم خود اس کرنل اور پاک فوج کے ان کمانڈو جانبازوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھو گے جو صرف پاکستان اور اسلام کی عزت و حرمت کی خاطر اپنا گھر بار بیوی بچے بہن بھائی ماں باپ چھوڑ کر یہاں دشمن کے حصار میں آکر بیٹھ گئے ہیں۔ یہ مقبوضہ کشمیر میں ملن کا مقام ہے اس کمانڈو گروپ کو دشمن کی ایک ایسی ڈیفنس لائن کے عقب میں جانا ہے جس کی نفری ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ انہیں کوئی ٹرانسپورٹ نہیں دی گئی۔ ہر جوان کے پاس اٹھانے کے لئے کم از کم ستر پونڈ وزن ہے۔ جس میں شلوار قمیض، ٹوپی، پی ٹی شوز، جرسی، کمبل، کچھ طبی سامان جو سات دنوں کے لئے کافی ہو، پکی ہوئی خشک روٹیاں، چھ چھ گرنیڈ، ایک ایمونیشن جیکٹ، سٹین گن کی بھری ہوئی چھ میگزینیں، ایک ایک پونڈ دھماکہ خیز بارود اور لائیٹ مشین گن اور فالتو ایمونیشن شامل ہے۔ ان کی منزل دشمن کی دفاعی لائن کا عقب ہے جہاں پہنچ کر انہیں ٹولیوں کی صورت میں بٹ جانا ہے اور دشمن کے اسلحہ کے ذخیروں، سپلائی لائن، فوجی سازو سامان اور ٹینکوں کو تباہ کرنا ہے۔ کل کی رات اور آج کا دن انہوں نے اپنی خفیہ پناہ گاہ میں آرام کیا ہے۔ اب اس گوریلا گروپ کو یہاں سے روانہ ہو کر نیل کٹھی کی پہاڑی سے گزر کر پنجابی گلی میں سے ہوتے ہوئے گلمرگ کی وادی کے عقب میں جانا ہے۔ یہاں سے یہ جانباز کمانڈو تین ٹکڑیوں میں بٹ جائیں گے اور اپنے اپنے پلان کے مطابق دشمن کی دفاعی لائن میں گھس کر موت سے پنجہ آزما ہو جائیں گے۔ اس کمانڈو گروپ کے جیالوں نے دلیری اور شجاعت کے جو کارنامے پاکستان کی تاریخ کے روشن صفحات پر رقم کئے وہ اس وادی نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ تم بھی انہیں ایک ساتھ نہیں دیکھ سکو گے۔ میں تمہیں کمانڈو لیڈر کرنل طارق کی پارٹی کے حوالے کرتا ہوں۔ تم اس کمانڈو پارٹی کو آزاد کشمیر پر قبضہ کرنے کے دشمن کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملاتے اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں اپنے ساتھ اس مقام پر لئے چلتا ہوں جہاں کرنل طارق کی کمانڈو پارٹی نیل کٹھی کی دس ہزار فٹ بلند چوٹی کو پار کر کے پہنچی اور وہاں سے ایک ندی عبور کرنے کی فکر میں ہے۔ میرا ہاتھ تھام لو۔"

میں نے سبزپوش کا نورانی ہاتھ تھام لیا اور پھر جیسے ہوا نے مجھے اوپر اٹھا لیا۔ ہم دھند کے بادلوں کو چیرتے ہوئے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے ہوتے ہوئے ایک ایسی وادی میں پہنچے جہاں مجھے سانپ ایسی بل کھاتی پہاڑی سڑک دکھائی دی جس پر ٹینکوں کی ایک قطار آہستہ آہستہ رینگتی چلی جا رہی تھی میں نے سبزپوش سے سوال کیا۔

"کیا یہ دشمن کے ٹینک ہیں۔"

سبزپوش نے جواب دیا۔

"ہاں یہ بھارت کی شیواجی رجمنٹ کے ٹینک ہیں جو تحریک آزادیء کشمیر کے مجاہدوں کے سینوں کو کچلتے ہوئے پہاڑی کی دوسری جانب ٹیکری والے پرانے قلعے کے بیس کیمپ میں جا رہے ہیں۔"

میں نے سبزپوش سے کہا۔

"کیا ہمارے کمانڈو ان ٹینکوں کو اس پہاڑی سڑک پر تباہ نہیں کریں گے؟"

سبزپوش نے جواب میں کہا۔

"ان ٹینکوں کو تباہ کرنا بھی ان کے پلان میں شامل ہے۔ مگر پہاڑی سڑکوں پر ٹینک تباہ کرنا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ان پہاڑوں کے اوپر دشمن کی مشین گن پوسٹیں ہیں۔ راکٹ لانچر سے وہ زیادہ سے زیادہ چار چھ ٹینک بھسم کر دیں گے مگر ان کا ٹارگٹ ظاہر ہو جائے گا اور پھر ان کا دشمن کی مشین گنوں سے بچ نکلنا مشکل ہو گا۔ اس طرح سے کمانڈو مشن ناکام ہو جاتے ہیں۔ تم آگے چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ ہمارے جانباز ان ٹینکوں کو کس طرح تباہ کرتے ہیں۔ تم نے یہ سوال اسلئے کیا ہے کہ تم نے آج تک جنگ کے فرضی قصے کہانیاں پڑھی ہیں۔ مگر اس وقت تم اصلی جنگ کے میدان میں ہو۔ یہ کفر و باطل کا حقیقی میدان کارزار ہے۔ یہاں کسی کمانڈو کی مدد کے لئے اوپر سے کوئی ہیلی کاپٹر نہیں آئے گا۔ کوئی فرضی ہیرو ان کی مدد کے لئے اچانک کسی درخت کے پیچھے سے نمودار نہیں ہو گا۔ انہیں ہر کام خود ہی کرنا ہو گا اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق کرنا ہو گا۔"

ہم ایک بار پھر دھند کے بادلوں میں گھر گئے۔ مجھے اوپر نیچے دائیں بائیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ صرف اتنا احساس تھا کہ سبزپوش نے میرا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ مجھے سردی

گرمی کا احساس بھی نہیں تھا۔ مجھے ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور میں سبزپوش کے ساتھ گہری دھند کے بادلوں میں نیچے اترنا شروع ہو گیا۔ دھند چھٹتی گئی۔ ایک بار پھر مجھے نیچے ایک چھوٹی سی وادی نظر آئی۔ اس وادی کی پہاڑیوں پر کوئی کھیت نہیں تھا۔ ڈھلانوں پر چیڑھ اور چنار کے درخت ہی درخت اگے ہوئے تھے۔ مغرب کی طرف ایک پہاڑی ان پہاڑیوں میں سب سے اونچی تھی۔ مجھے وہاں ایک فصیل دکھائی دی۔ سبزپوش بولا۔

"جو فصیل تم دیکھ رہے ہو یہ پرانے زمانے کی ایک چار دیواری ہے جس کے اندر انڈین آرمی کا بیس کیمپ ہے۔ وہ سارے ٹینک اسی کیمپ میں آ رہے ہیں جنہیں تم نے پہاڑی سڑک پر رینگتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ اس انڈین آرمی کا بیس کیمپ ہے جس نے ساری وادی کشمیر پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ اس کیمپ میں اسلحہ اور گولا بارود کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ یہیں سے وادی کے اس علاقے میں ڈیپلائے انڈین آرمی کی یونٹوں کو اسلحہ وغیرہ سپلائی ہوتا ہے۔ بھارتی فوج اسی اسلحہ کے ذخیرے کی مدد سے آزاد کشمیر پر قبضہ کرنے کا ناپاک پلان بنا چکی ہے اور ہمارے کمانڈو جانبازوں کی یہ کمانڈو پارٹی کرنل طارق کی قیادت میں اسی بیس کیمپ کو تباہ کرنے کا مشن لے کر یہاں سے کچھ دور چھپی ہوئی ہے اور ایک ندی عبور کرنے کی کوشش میں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ان کے پاس لئے چلتا ہوں۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا تم اسے اپنی آنکھوں سے خود دیکھو گے۔ پہلے کی طرح اس بار بھی تم ان کے درمیان ہو گے۔ تم ان سب کو دیکھ سکو گے۔ مگر تمہیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ تم ان کے خیالات بھی پڑھ رہے ہو گے۔ تم ان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھو گے مگر تم ان سب کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو گے۔ آؤ۔"

ایک بار پھر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں جب میرے پاؤں زمین پر لگے اور آنکھیں دوبارہ کھلیں تو سبزپوش غائب ہو چکا تھا۔ میں وہاں اکیلا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو کرنل طارق اور اس کے تین کمانڈو جانبازوں کے درمیان پایا۔ یہ چاروں کمانڈو ایک ٹیلے کے اندر بنی ہوئی قدرتی کھوہ میں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے شلوار قمیض پہن رکھی تھیں۔ اسلحہ وغیرہ کے دو تھیلے ان کے پاس ہی پڑے تھے۔ یہ سب چمکیلی آنکھوں، چوڑے شانوں اور گٹھے ہوئے بدن والے پاک آرمی کے جیالے اور ٹرینڈ کمانڈوز تھے۔ ان کی ڈاڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔ ہر کمانڈو کے لمبے کرتے کے اندر

میگزین کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کھوہ کے باہر چھوٹی سی ڈھلان کے نیچے ایک پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ یہ ندی تیز رفتار اور چوڑی تھی۔ کمانڈو لیڈر کرنل طارق نے ندی کے پار کچھ فاصلے پر وادی کی سب سے اونچی پہاڑی پر نظریں جماتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"ٹارگٹ ہمارے سامنے ہے۔ انڈین آرمی کے اس ہیڈکوارٹر میں بکتر بند گاڑیوں، چھوٹے ٹینکوں اور دو انچ دہانے کی توپوں کی بھاری تعداد کے علاوہ زیرزمین بہت بڑا ایمونیشن ڈپو اور پٹرول کا ڈمپ بھی ہے۔ یہ سب کچھ جیسا کہ ہم میں سے کو سب معلوم ہے آزاد کشمیر پر حملے کے لئے اکٹھا کیا گیا ہے۔ ہمیں اسی ہیڈکوارٹر کو تباہ کرنا ہے۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"سر! نقشے کے مطابق دشمن کے اس قلعے کو صرف ایک ہی پہاڑی سڑک جاتی ہے جس کی دونوں جانب گن پوسٹیں ہیں۔"

کرنل طارق نے کہا۔

"ہم دوسری طرف سے قلعے کے اندر جانے کی کوشش کریں گے۔"

کمانڈو قاسم بولا "ہم رات کے اندھیرے میں ندی پار کرنے کی کوشش کریں گے سر!"

کرنل طارق کی نظریں اب بھی دور پہاڑی پر نظر آتی دشمن کے ہیڈکوارٹر کی فصیل پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ندی کے پار سدھن قبیلے کا ایک کشمیری شعبان ہمیں گائیڈ کرے گا۔ اسے آج رات بارہ بجے کے بعد کا وقت دیا گیا ہے۔"

کمانڈو فاروق نے مشکوک انداز میں کہا۔

"مگر سر کیا وہ بھروسے کا آدمی ہے؟"

کرنل طارق بولا۔

"سدھن قبیلے کے کشمیری جانباز شروع ہی سے وادی میں قابض آمرانہ طاقتوں کے ساتھ نبرد آزما رہے ہیں۔ وہ بھارتی قابض فوجوں کے خلاف آج بھی لڑ رہے ہیں۔ ان کے کئی جوان شہید ہو چکے ہیں۔ ہم ان پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ پھر شعبان کا نام ہمیں

خاص طور پر دیا گیا ہے۔ وہ ہمیں چھپنے کے لئے جگہ بھی دے گا اور انڈین آرمی کے اس قلعہ نما ہیڈکوارٹر کے بارے میں اس سے مفید معلومات بھی ملیں گی۔"

شام ہو گئی۔ وادی میں اندھیرا اترنے لگا۔ پھر درختوں پر پرندوں کا شور بھی تھم گیا اور ہر طرف رات کی تاریکی چھا گئی۔ یہ چاروں کمانڈو کھوہ میں پناہ لے ہوئے تھے۔ یہ علاقہ انڈین آرمی کی چیک پوسٹوں کے عقب میں تھا۔ اسی لئے یہاں تک پہنچنے کے لئے یہ راستہ اختیار کیا گیا تھا۔ چاروں کمانڈوؤں نے اپنی اپنی گھڑیاں ملالی تھیں۔ وہیں انہوں نے تھوڑا بہت کچھ کھایا اور رات کے مزید گہری ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جب رات کے پونے بارہ بجے تو کرنل طارق نے باری باری تینوں کمانڈوؤں کے کاندھوں پر آہستہ سے ہاتھ مارا اور سب سے پہلے کمانڈو طارق کھوہ سے رینگتا ہوا باہر نکل آیا۔ کمانڈو فاروق کمانڈو خالد اور کمانڈو قاسم بھی اس کے پیچھے پیچھے رینگ کر کھوہ میں سے نکل آئے۔ وہ سب آگے پیچھے اونچی گھاس والی ڈھلان پر ندی کی طرف رینگ رہے تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ندی کی موجوں کا شور آہستہ آہستہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ندی کے کنارے پہنچ کر رک گئے۔ کمانڈو کرنل طارق نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جن دو تھیلوں میں میگزین اور دوسرا اسلحہ وغیرہ رکھا تھا ان پر پلاسٹک چڑھا تھا یہ دونوں تھیلے دو کمانڈوؤں کی پیٹھ پر بندھے تھے۔ سب سے پہلے کمانڈو فاروق ندی کے پانی میں اتر گیا۔ پانی تیز اور ٹھنڈا تھا مگر اترنے والا کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ اپنی ٹریننگ کے دوران اس نے اس سے بھی زیادہ پرشور اور یخ بستہ ندیوں کو خالی جانگیہ پہن کر سینکڑوں بار عبور کیا تھا۔ وہ ندی کی لہروں پر دوسرے کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ اس کے بعد کمانڈو خالد، پھر کمانڈو قاسم اور آخر میں کمانڈو طارق بھی ندی میں اتر گیا۔ وہ اس طرح آگے پیچھے رات کے اندھیرے میں ندی میں تیر رہے تھے کہ ان کے ہاتھ پیر پانی کے اندر ہی اندر چل رہے تھے۔ صرف سر اور پیٹھ کا تھوڑا سا حصہ پانی سے باہر تھا۔ ندی کا تیز بہاؤ انہیں آگے لے جانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ سیدھ میں رہنے کی جدوجہد کرتے ہوئے دوسرے کنارے کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

ندی پار کرتے ہوئے انہیں دس پندرہ منٹ لگ گئے۔ کنارے پر پہنچ کر وہ کچھ دیر گیلی گھاس میں بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔ ان کے کپڑے پانی میں شرابور تھے۔ اسلحہ

کے دونوں تھیلے الگ کر دیئے گئے ۔ قمیض شلواریں اتار کر نچوڑی اور دوبارہ پہنی گئیں ۔ کرنل طارق نے اندھیرے میں ہاتھ سے ایک اشارہ دیا ۔ تینوں کمانڈو دس دس قدم کا فاصلہ ڈال کر درختوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے ۔ کرنل طارق بھی ایک درخت کے پیچھے چھپا ہوا تھا ۔ اس کی آنکھیں تاریکی میں سامنے والے درختوں کے درمیان اگی ہوئی جھاڑیوں کا جائزہ لے رہی تھیں ۔ اسنے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی رات کے بارہ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے ۔ اسے جھاڑیوں میں ایک انسانی سایہ حرکت کرتا نظر آیا ۔ کرنل طارق کے ہاتھ میں کھلا ہوا کمانڈو چاقو تھا ۔ انسانی سایہ جھاڑیوں میں سے نکل کر ایک جگہ ساکت ہو گیا ۔ کرنل طارق کو بتایا گیا تھا کہ شعبان کشمیری گائیڈ منہ سے تین مرتبہ ایک پرندے کی مخصوص آواز نکالے گا ۔ یہ اس کی پہلی پہچان ہو گی ۔ کرنل طارق انتظار کرنے لگا ۔ چاقو پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی ۔

انسانی سائے نے منہ سے تین بار ایک پرندے کی مخصوص آواز نکالی ۔ جواب میں پلان کے مطابق کرنل طارق نے منہ سے ہلکی سی سیٹی بجائی ۔ انسانی سایہ سیٹی کی آواز کی طرف بڑھا ۔ پھر اس نے ایک خفیہ کوڈ لفظ بولا ۔ کرنل طارق نے اس کے جواب میں دوسرا خفیہ کوڈ لفظ بولا اور درخت کے پیچھے سے نکل آیا ۔ انسانی سایہ کرنل طارق کے پاس آگیا اور آہستہ سے بولا ۔

" سر! میرا نام شعبان ہے' شعبان سدھن' آپ کے دوسرے آدمی کہاں ہیں؟"

کرنل طارق نے دوسری بار دھیمی آواز میں سیٹی بجائی ۔ باقی تینوں کمانڈو بھی درختوں کے پیچھے سے باہر نکل آئے ۔ وہ سب شعبان کے قریب ہو کر زمین پر بیٹھ گئے ۔ شعبان کہنے لگا ۔

" آپ کو ایک ایک کر کے میرے ساتھ چلنا ہو گا ۔"

یہ کہہ کر شعبان اٹھا اور اندھیرے میں جھاڑیوں کی طرف چلنے لگا ۔ اس کے پیچھے کرنل طارق' پیچھے کمانڈو کیپٹن خالد' کمانڈو قاسم اور کمانڈو فاروق پانچ پانچ قدموں کا فاصلہ ڈال کر چل پڑے ۔ شعبان کمانڈو پارٹی کو اندھیرے میں جھاڑیوں' چھوٹی چھوٹی ٹیکریوں اور درختوں میں سے گزار کر ایک کھڈ میں لے آیا ۔ کھڈ کے سامنے کی چڑھائی چڑھنے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی کھلی جگہ میں آگئے ۔ یہاں وہ ناشپاتیوں کے ایک مختصر سے باغ میں سے

گزرے ۔ سامنے لکڑی کا اک منزلہ ایک طرف کو جھکا ہوا دیہاتی مکان تھا ۔ مکان میں کہیں کوئی روشنی نہیں ہو رہی تھی ۔ شعبان مکان کے عقب میں آگیا ۔ یہاں دو ستونوں کے درمیان چھوٹا سا لکڑی کا برآمدہ تھا ۔ شعبان نے آگے بڑھ کر دروازے کا پٹ کھول دیا اور ہاتھ سے اشارہ کیا ۔ چاروں کمانڈو اس کے پیچھے کمرے میں گھس گئے ۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے فرش پر دری بچھی ہوئی تھی ۔ کارنس پر تیل کا دیا جل رہا تھا ۔ اس کی روشنی میں ایک گورے رنگ کی خوش شکل صحت مند عورت فرن میں ملبوس چولھے کے پاس کمبل اوڑھے بیٹھی تھی ۔ چولھے کے پاس ہی سماوار رکھا ہوا تھا جو گرم کشمیری چائے سے بھرا تھا ۔

شعبان نے کشمیری زبان میں اس عورت سے کچھ کہا ۔ عورت نے چار پیالیاں نکال کر سماوار کے پاس رکھ دیں اور ان میں سماوار میں سے گرم گرم کشمیری چائے ڈالنے لگی ۔

کرنل طارق اور اس کے کمانڈو ساتھیوں نے چراغ کی روغنی روشنی میں پہلی بار اپنے کشمیری گائیڈ شعبان کو دیکھا ۔ وہ تیس بتیس سال کا گبھرو جوان تھا ۔ رنگ کشمیریوں کی طرح سرخ و سفید تھا اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں بھی تھیں ۔ لباس کشمیری دیہاتیوں جیسا تھا ۔ گلے میں گرم مفلر تھا ۔ شعبان بولا ۔

" یہ میری بیوی زونی ہے ہماری شادی کو سات آٹھ برس ہو گئے ہیں ۔ ہمارا کوئی بچہ نہیں ہے ۔ ہم دونوں اسی مکان میں رہتے ہیں ۔ ناشپاتی کا ایک چھوٹا سا باغ ہے دو بھینسیں بھی ہیں ۔"

چاروں کمانڈو اس دیہاتی مکان کی فضا میں پہنچ کر سکون محسوس کر رہے تھے ۔ ان کے کپڑے ابھی تک گیلے تھے ۔ شعبان نے انہیں سکھانے کے لئے کہا تو کرنل طارق بولا " اس کی کوئی ضرورت نہیں ۔ جسم کی گرمی سے اپنے آپ سوکھ جائیں گے ۔ تم ہمیں انڈین آرمی ہیڈ کوارٹر کے بارے میں بتاؤ ۔ کیا وہاں کوئی خفیہ راستہ بھی ہے! ایسا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہو گا ؟" شعبان کی بیوی زونی نے چائے کی پیالیاں جانبازوں کے آگے رکھ دیں ۔ وہ آہستہ آہستہ چائے پینے لگے ۔ کرنل طارق کشمیری جوان شعبان کی طرف تک رہا تھا ۔ شعبان نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا ۔

" اگر کوئی خفیہ راستہ ہے تو مجھے اس کا علم نہیں ہے ۔"

کوٹھڑی نما کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی ۔ چاروں کمانڈو ایک دوسرے کو تکنے لگے شعبان کہہ رہا تھا۔

"سارے علاقے پر انڈین آرمی کا قبضہ ہے ۔ انہیں کوئی خفیہ راستہ بنانے کی کیا ضرورت ہے ۔ ٹیکری کے قلعے کے پرانے دروازے تک ایک ہی کچی سڑک جاتی ہے۔ اس راستے سے ٹرک آتے جاتے ہیں ۔ فوج کو سپلائی بھی اس سڑک پر سے ملتی ہے۔ آج شام کو کچھ چھوٹے ٹینک بھی اس سڑک پر سے آئے تھے ۔"

میں ان کے قریب ہی بیٹھا تھا ۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی ٹینک ہیں جنہیں میں نے سبز پوش کے ساتھ پہاڑی سڑک پر جاتے ہوئے دیکھا تھا ۔ کرنل طارق نے پوچھا۔

"قلعے میں فوج کی نفری کتنی ہوگی "؟

شعبان نے چائے کی پیالی نیچے رکھ دی ۔ گرم کوٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا ۔

"ٹھیک تو نہیں بتا سکتا ' لیکن کافی فوجی ہیں ۔ میں صبح کو انڈے بھی مکھن لے کر قلعے میں جاتا ہوں ۔ ہر طرف فوجی ہی فوجی دکھائی دیتے ہیں ۔"

کرنل طارق کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں ۔

"کیا تم روز انڈے مکھن لے کر قلعے میں جاتے ہو ——— ؟

"روز نہیں "شعبان نے کہا

"ہفتے میں دو تین بار جانا ہوتا ہے ۔ ویسے تو فوج کو انڈے مکھن وغیرہ کی سپلائی مہینے میں دو تین بار گلمرگ چھاؤنی سے آجاتی ہے' مگر کچھ فوجی تازہ دودھ مکھن اور دیسی مرغیوں کے انڈے پسند کرتے ہیں ۔ انہوں نے مجھے کہہ رکھا ہے کہ میں انہیں ہفتے میں دو تین بار انڈے اور خالص مکھن دے جایا کروں ۔"

کمانڈو خالد نے کرنل طارق کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا ۔ کرنل طارق نے شعبان سے کہا ۔

"کیا تم ہمیں قلعے کے اندر کا نقشہ بنا کر بتا سکتے ہو کہ وہاں ایمونیشن ڈپو اور پٹرول کے ڈمپ کہاں پر ہیں ؟"

شعبان بولا ۔ "میں ان جگہوں سے واقف نہیں ہوں ۔ انڈین فوجی مجھے ادھر ادھر

جانے ہی نہیں دیتے ۔ زیادہ سے زیادہ میں قلعے کے اندر کمانڈر کے آفس تک جاتا ہوں ۔ وہیں برآمدے میں آکر صوبیدار رام داس مجھ سے انڈے مکھن وغیرہ لے لیتا ہے اور پیسے دے دیتا ہے ۔ میں وہیں سے واپس آجاتا ہوں ۔ میرے سامنے کچھ فوجی گاڑیاں ضرور کھڑی ہوتی ہیں اور ہندو سکھ فوجی وہاں پہرہ دے رہے ہوتے ہیں ۔ ان "ٹرکوں کے پیچھے فوجی کنٹین ہے جہاں فوجی چائے وغیرہ پیتے ہوتے ہیں ۔ آگے میں کبھی نہیں گیا ۔"

ایک پلان کرنل طارق نے اپنے ذہن میں سوچ لیا تھا ۔ ایک بات ثابت ہوگئی تھی کہ شعبان انھیں صرف ٹارگٹ تک پہنچا ہی سکتا تھا اور انہیں وہاں چھپنے میں مدد ہی دے سکتا تھا ۔ اس سے آگے وہ بے بس تھا ۔ انڈین آرمی کے ہیڈکوارٹر کے بارے میں اسکے پاس وہ معلومات نہیں تھیں جن کی کمانڈو پارٹی کو ضرورت تھی ۔

کرنل بولا ۔

"اب تم کب قلعے میں انڈے وغیرہ لے کر جا رہے ہو؟ "شعبان نے بتایا کہ وہ پرسوں جائے گا ۔ کرنل طارق نے کہا

"کیا ہم رات یہیں بسر کریں گے یا تمہارے پاس کوئی دوسری خفیہ جگہ بھی ہے ؟"

شعبان نے کہا ۔ "آپ لوگ باقی کی رات یہیں بسر کرلیں کیونکہ رات تھوڑی ہی باقی رہ گئی ہے صبح میں آپ کو دوسری جگہ لے جاؤں گا ۔ "

"ٹھیک ہے ۔ "کرنل طارق نے دری پر دیوار کے پاس لیٹتے ہوئے کہا ۔ کمانڈو قاسم ' خالد اور فاروق بھی وہیں دیوار کی طرف منہ کرکے ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر لیٹ گئے ۔ شعبان نے انہیں کونے میں سے کمبل نکال کر دے دیئے جو انہوں نے اوپر ڈال لئے ۔ کرنل طارق نے کمبل میں سے منہ نکال کر شعبان سے کہا ۔

"اذان کے وقت ہمیں جگا دینا ۔"

اور اس کے ساتھ ہی چاروں کمانڈو سو گئے ۔ انہیں ایک دم گہری نیند سو جانے کی بھی ٹریننگ دی گئی تھی تاکہ انہیں جب کہیں بھی نیند کی ضرورت ہو وہ فوراً سو کر نیند پوری کرلیں ۔ شعبان کی بیوی زونی نے پیالیاں اور سماوار ایک طرف کر دیئے ۔ شعبان نے اپنی بیوی زونی سے کہا ۔

"صبح جلدی اٹھ کر مرغی بھون لینا۔ میں بھی سونے لگا ہوں۔"

شعبان وہیں چولھے کے پاس ہی لیٹ گیا۔ اس کی بیوی بھی تھوڑی دیر بعد دیا گل کر کے قریب ہی کمبل اوڑھ کر سو گئی۔ اذان کے وقت اپنے آپ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے خاوند کو جگایا۔ شعبان نے کرنل طارق کو جگا دیا۔ باقی کمانڈو بھی اٹھ بیٹھے۔ شعبان کہنے لگا۔

"دن کی روشنی ہونے سے پہلے پہلے آپ لوگوں کو اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ جانا چاہئے۔"

وہ چاروں کمانڈوز کو ساتھ لے کر پچھلے پہر کے اندھیرے میں باہر آ گیا۔ یہاں سے ایک کچا راستہ نیچے ایک کھڈ میں اترتا تھا۔ اس کھڈ میں تھوڑا آگے جا کر ایک باڑہ تھا جس پر چھپر پڑا ہوا تھا۔ اس باڑے میں ایک طرف شعبان کی دو بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ باقی جگہ خالی تھی اور وہاں پرالی کا ڈھیر پڑا تھا۔ شعبان بولا۔

"جب تک کسی کو خبر نہیں ہوتی آپ لوگ یہاں چھپ سکتے ہیں۔ ویسے ادھر کوئی نہیں آتا۔ گاؤں یہاں سے دوسری طرف ٹیکری کے پیچھے ہے۔ لیکن آپ لوگوں کو اپنے مشن میں زیادہ دیر نہیں کرنی ہوگی۔ کیونکہ کبھی کبھی کوئی انڈین فوجی بھی ادھر ضرور آ نکلتا ہے۔"

کرنل طارق نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ کوئی انڈین فوجی ادھر آیا تو ہم اسے سنبھال لیں گے۔"

شعبان نے جلدی سے کہا۔

"خدا کے لئے کہیں اسے قتل کر کے نہ پھینک دینا' قیامت آجائے گی ہم سب پکڑے جائیں گے۔"

کمانڈو خالد نے کہا "ایسا نہیں ہوگا۔ تم گھبراؤ نہیں۔"

شعبان نے باڑے کے لکڑی کے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"اسے بند رکھنا اور باہر مت نکلنا میں تم لوگوں کے لئے روٹی لے کر دوپہر کو خود ہی آجاؤں گا پانی کونے میں مٹکے میں پڑا ہے۔"

وہ جانے لگا تو رک گیا۔ کرنل طارق کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"ویسے آپ لوگوں کو یہاں کتنی دیر لگے گی؟ میں جانتا ہوں آپ کا مشن کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو اپنے مشن میں کامیاب کرے۔ آپ کے مشن کی کامیابی کے بعد ہو سکتا ہے ہم پر کوئی مصیبت نازل ہو۔ مگر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ آپ کا مشن کامیاب ہونا چاہئے۔"

کرنل طارق نے کہا۔

"ہم جلدی سے جلدی اپنا کام ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں تم سے دوپہر کو بات کریں گے' اب تم جاؤ آرام کرو۔"

شعبان چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد چاروں جانباز سر جوڑ کر بیٹھ گئے' کرنل طارق کہنے لگا۔

"قلعے کا ایمونیشن ڈپو اور پٹرول ڈیپ اڑانا ہی ہمارا مشن ہے۔ دھماکہ اتنا بڑا ہوگا کہ اس کے بعد قلعے میں موجود توپوں اور ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کو اڑانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ یہ سب کچھ اس دھماکے میں ایک ساتھ اڑ جائے گا۔ مگر ہمیں قلعے کے مین گیٹ میں سے ہی ہیڈکوارٹر میں داخل ہونا پڑے گا۔"

تینوں کمانڈو اپنے کمانڈر کو تکنے لگے۔ کمانڈو خالد سمجھ گیا تھا کہ لیڈر کے ذہن میں کیا سکیم ہے۔ اس نے کہا۔

"فوجی قلعے کے اندر داخل ہونے کی ایک ہی ترکیب ہے کہ ہم میں سے کوئی شعبان کی جگہ انڈے اور مکھن کی سپلائی لے کر وہاں جائے۔"

کرنل طارق بولا۔ "تم نے میرے ذہن کو پڑھ لیا ہے کیپٹن!"

"لیکن کمانڈو قاسم کہنے لگا سر! اس میں خطرہ بھی ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی کشمیری زبان نہیں جانتا اور پھر انڈین فوجی شعبان کی جگہ ایک اجنبی کو دیکھ کر ضرور شک کریں گے۔"

کرنل طارق بولا۔

"شعبان ساتھ ہوگا۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں اسے سمجھا دوں گا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔"

کمانڈو قاسم نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"سر! اگر ہم میں سے کوئی کشمیری دیہاتی کے لباس میں مکھن انڈے دینے قلعے میں چلا گیا تب بھی وہ ایمونیشن ڈپو اور پٹرول ڈمپ کا پتہ نہیں چلا سکے گا۔ کیونکہ فوجی تو شعبان کو بھی ایک قدم آگے نہیں جانے دیتے۔"

کرنل طارق نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ اسی لئے شعبان کے ساتھ کل میں خود جاؤں گا۔"

تینوں کمانڈو خاموش ہو گئے۔ کمانڈو پارٹی میں جب ایک فیصلہ ہو جائے تو وہ آخری فیصلہ ہوتا ہے اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ کیونکہ یہ فیصلے عین وقت پر کئے جاتے ہیں اور پھر ان پر عمل ہی کیا جاتا ہے بحث نہیں کی جاتی۔ کرنل طارق نے اپنے آپ کو اس مشن کے ہراول کے کردار کے لئے چن لیا تھا۔ وہ دوسرے جانبازوں میں سے بھی اگر کسی کو چن لیتا تو وہ بھی آگے سے انکار نہ کرتا۔ انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ باہر دن کی روشنی آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھی۔ باڑے کے شکستہ دروازے میں سے دن کی روشن کرنیں باڑے میں داخل ہو رہی تھیں۔ ایک بھینس تھوڑی دیر ڈکرا کر چپ ہو گئی۔ دوپہر سے ذرا پہلے شعبان آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ چاروں جانبازوں کے لئے کھانا لایا تھا۔ ایک گڑوا الگ لایا تھا۔ کھانا جانبازوں کے حوالے کر کے وہ خود بھینس کا دودھ دوہنے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"تم روٹی کھاؤ میں تمہارے لئے دودھ دوہتا ہوں۔"

جوار کی روٹیاں تھیں اور رات کا ساگ تھا۔ ساتھ انہوں نے بھینس کا تازہ نیم گرم دودھ پیا۔ کرنل طارق نے صورت حال کے بارے میں دریافت کیا۔ شعبان نے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔ ادھر کوئی نہیں آتا۔ اگر کسی وقت کوئی انڈین فوجی آتا بھی ہے تو وہ اوپر والی پگڈنڈی سے ہو کر گزر جاتا ہے۔ اس باڑے کی طرف کبھی کوئی نہیں آیا۔"

کھانے کے بعد کرنل طارق نے اپنی سکیم اور پلان جب شعبان کو بتایا تو وہ پہلے تو ایک پل کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر سگریٹ کا کش لگا کر بولا۔

"ٹھیک ہے سر! جو اللہ کو منظور۔ پاکستان اور اسلام کے لئے شعبان کی جان بھی حاضر ہے۔ مگر ایک بات ہے صاحب! آپ اگر میرے ساتھ جائیں گے تو کشمیری میں بات

کیسے کریں گے۔ کیونکہ اوپر ایک ڈوگرہ صوبیدار بھی ہے جو کشمیری جانتا ہے۔ میرے ساتھ کوئی بھی اجنبی گیا تو وہ اپنا شک دور کرنے کے لئے اس سے کشمیری میں ضرور بات کرے گا۔"

کرنل طارق نے کہا۔

"تم مجھے گونگا بہرہ ظاہر کر سکتے ہو۔"

شعبان بولا۔

"صاحب یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ انڈین فوجی بڑے ہوشیار ہیں۔ وہ کسی نہ کسی بہانے آپ کو چیک ضرور کریں گے۔ میرا مطلب ہے کہ اگر ڈوگرہ صوبیدار نے آپ کو گالی دے دی یا کوئی ایسی ہی بات کہہ دی جس پر آپ چونک پڑے تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ کیونکہ آپ تو بہرے ہوں گے۔"

کرنل طارق نے کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ ہمیں اس کی بھی ٹریننگ دی گئی ہے۔ تم مجھے ایک بار اپنے ساتھ قلعے کے اندر لے جاؤ آگے میں سب سنبھال لوں گا۔"

"ٹھیک ہے" شعبان نے سگریٹ پھینکتے ہوئے کہا "مجھے کل صبح قلعے میں انڈے مکھن لے کر جانا ہے۔ آپ تیار رہیے۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے آجاؤں گا۔ اور ہاں رات کو ہوشیار رہیے گا۔ ہو سکتا ہے رات کو گشت کرتا کوئی انڈین سپاہی ادھر آنکلے میں شام کو چائے لے کر آؤں گا۔"

شعبان کے جانے کے بعد چاروں جانباز اپنے پلان کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ شام کے وقت شعبان وعدے کے مطابق چائے کا ساوار اور پیالیاں لے کر آ گیا۔ چائے دے کر شعبان اگلے دن صبح آٹھ بجے آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ رات کو چاروں کمانڈوز نے باری باری پہرہ دیا۔ رات گزر گئی۔ دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا۔ انہوں نے نماز پڑھ کر اللہ سے اپنے مشن کی کامیابی کی دعا مانگی اور شعبان کا انتظار کرنے لگے۔

اپنے وقت پر شعبان بھی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی۔ ٹوکری میں مرغی کے انڈے اور مکھن سے بھری ہوئی دیگچی تھی۔ اس سے پہلے کہ کرنل طارق شعبان کے ساتھ اپنے مشن پر روانہ ہوتا کمانڈو خالد اپنے لیڈر کرنل طارق کو ایک طرف لے گیا اور

کہنے لگا۔

" سر! آپ صورت حال کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا اس طرح شعبان کے ساتھ انڈین آرمی کے ہیڈکوارٹر میں جانا ٹھیک نہیں۔ وہ لوگ احمق نہیں ہیں۔ انہیں آپ پر ضرور شک پڑ جائے گا اور ممکن ہے وہ آپ کو وہیں روک لیں۔"

کرنل طارق نے کہا۔

" میں جانتا ہوں کیپٹن' مگر اس کے باوجود ہم میں سے کسی کو یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ شعبان قلعے کے اندر ایمونیشن ڈپو اور پٹرول ڈمپ کی لوکیشن کو شناخت نہیں کر سکتا کہ وہ کس جگہ پر واقع ہیں۔ صرف ہم میں سے ہی کوئی شناخت کر سکتا ہے۔ اگر میں پکڑا گیا تو تم پارٹی کو لیڈ کرو گے۔ پھر مجھے بھول جانا اور قلعے کی عقبی دیوار میں اندر گھسنے اور ایمونیشن ڈپو کو اڑانے کی کوشش کرنا۔ بس اللہ کے حوالے۔"

اتنا کہہ کر کرنل طارق کشمیری جوان شعبان کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں شعبان نے کرنل طارق کو مزید کچھ باتیں بھی سمجھا دیں۔ کرنل طارق کا حلیہ بالکل کشمیری گوجروں ایسا تھا۔ مکھن کی دیگچی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی تھی۔ وہ پہاڑی راستوں پر سے گزرتے آخر انڈین آرمی کے قلعہ نما ہیڈکوارٹر کی ٹیکری کے نیچے آ گئے۔ یہاں سے ایک کچی سڑک اوپر دروازے تک جاتی تھی۔ شعبان کے ساتھ کرنل طارق دیگچی سر پر رکھے بالکل دیہاتی آدمی کی طرح چل رہا تھا۔ شعبان نے ہیڈکوارٹر کے دروازے کے قریب پہنچتے ہوئے آخری بار کرنل طارق کو ہدایت کی کہ وہ بالکل گونگا بہرہ بنا رہے اور کوئی بات نہ کرے۔ کسی بات پر نہ چونکے۔

کرنل طارق نے کنکھیوں سے دائیں بائیں ذرا بلندی پر تین چار گن پوسٹیں دیکھیں جن کو جھاڑیوں اور درختوں کی شاخوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ کرنل طارق اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ وہ ایک عیار دشمن کے درمیان جا رہا ہے جو بے وقوف نہیں ہے اور دشمن کو اس بات کی خبر ہو چکی ہے کہ پاک فوج کے کمانڈوز ان کے علاقہ میں گھس آئے ہیں۔ کیونکہ دوسرے محاذوں پر باقاعدہ جنگ جاری تھی۔ جنگ ہو رہی ہو تو دونوں ملکوں کے کمانڈوز ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے ایک دوسرے کی دفاعی لائنوں کے عقب

میں جایا ہی کرتے ہیں۔ قلعے کا دروازہ کھلا تھا۔ ایک انڈین جوان مشین گن لئے دروازے کے اوپر مورچہ لگائے بیٹھا تھا۔ ایک گن پوسٹ دروازے کی بائیں جانب ایک بنکر کے اوپر بنی ہوئی تھی۔ ان بھارتی فوجیوں کی وردی سے کرنل طارق سمجھ گیا کہ ان کا تعلق کمانڈو رجمنٹ سے ہے۔ دروازے پر ایک بھارتی لانس نائیک نے انہیں روک لیا۔

شعبان نے سلام کرتے ہوئے کہا۔ "صاحب میں شعبان گوجر ہوں۔ صوبیدار صاحب کے لئے انڈے اور مکھن لایا ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے۔" بھارتی فوجی کرنل طارق کو گھورتے ہوئے بولا۔

" مگر یہ کون ہے تمہارے ساتھ؟"

شعبان نے کہا۔

"صاحب! یہ میرا ماموں نور دین ہے۔ میں اسے صوبیدار جی سے پاس دلوانے لایا ہوں۔ کیونکہ اب یہی انڈے مکھن لایا کرے گا۔ میں بھینس خریدنے ٹن مرگ جا رہا ہوں۔"

انڈین فوجی نے کرنل طارق سے پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا"

کرنل طارق احمقوں کی طرح اسے تکتا رہا۔ شعبان نے فوراً کہا۔

" صاحب یہ گونگا بہرہ ہے۔ نہ بول سکتا ہے نہ سن سکتا ہے۔ ماں جی نے اسے میرے پاس باغ کی رکھوالی کے لئے بھیج دیا ہے۔"

بھارتی فوجی نے کرنل طارق کی تلاشی لی اور اسے شعبان کے ساتھ اندر جانے کی اجازت دے دی۔ قلعے کے اندر کافی کشادہ جگہ تھی۔ یہ ایک ہموار میدان تھا جہاں ایک جانب دیوار کے ساتھ بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک ایک لمبی قطار میں کھڑے تھے۔ بائیں طرف فوجی جیپیں اور ٹرک کھڑے تھے۔ جگہ جگہ انڈین فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ رجمنٹل ہیڈکوارٹر کے باہر ایک چھوٹے سے چبوترے پر رجمنٹ کا جھنڈا لگا تھا۔ ہیڈکوارٹر کے اک منزلہ دفتر کے اوپر بھارتی ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ شعبان نے کرنل طارق کو برآمدے میں ایک جگہ زمین پر بٹھا دیا اور آہستہ سے کہا "میں آتا ہوں۔" کرنل طارق گنواروں کے انداز میں ٹوپی اتار کر اپنے سر کو کھجانے لگا۔ پھر اپنے سر کو یوں دائیں

بائیں ہلانے لگا جیسے کوئی مجذوب ہو۔ اس دوران اس کی تیز اور ٹرینڈ نگاہوں نے قلعے کے
شمال مغرب کی طرف ایک اونچے ٹیبے کو دیکھ لیا تھا جس کی دو جانب ریت کی بوریوں کی
دیوار کھڑی تھی۔ یہ اسلحہ اور پٹرول کا ڈمپ ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے ٹیبے کے نقشے کو
اچھی طرح سے ذہن میں بٹھا لیا۔ شعبان برآمدے کی دوسری طرف سے واپس آیا اور
آہستہ سے بولا:

"چلو نکل چلو۔"

کرنل طارق اپنے سر کو مجذوبوں کی طرح ہلاتے ہوئے اٹھا اور شعبان کے ہاتھ سے
خالی ٹوکری لے کر اسکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ٹوکری میں خالی دیگچی پڑی تھی۔ وہ قلعے کے
دروازے سے نکلے تو کمانڈو رجمنٹ کے لانس نائیک نے پوچھا۔

"صوبیدار صاحب سے پرمٹ لے لیا اپنے ماموں کا؟"

شعبان نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"صاحب جی صوبیدار صاحب کو نہیں ملے۔ انڈے مکھن میں نے لانگری کو دے
دیئے ہیں۔ پرسوں چوتھ راشن لے کر آؤں گا تو ماموں کو پھر ساتھ لیتا آؤں گا جی۔ رام
رام!"

دونوں خاموشی سے قلعے کی ڈھلان اترنے لگے۔ دونوں خاموش تھے۔ کوئی ایک دوسرے
سے بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے آس پاس دشمن کی گن پوسٹیں چھپی
ہوئی ہیں۔ جب وہ قلعے کی ڈھلان اتر کر جنگل میں آئے تو شعبان نے آہستہ سے کہا۔

"صوبیدار رام داس کہیں گیا ہوا تھا۔ میں انڈے مکھن لانگری کو دے آیا ہوں۔
اب آپ پرسوں میرے ساتھ چلنا۔"

کرنل طارق نے آہستہ سے جواب دیا۔

"شعبان اب میرے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ معلوم کرنا تھا میں
نے معلوم کر لیا ہے۔ پرسوں چوتھ تم جاؤ تو کہہ دینا کہ گاؤں کا ایک آدمی بھینس لے کر
آگیا تھا اب میں ہی انڈے مکھن لایا کروں گا۔"

شعبان نے چلتے چلتے ایک نظر کرنل طارق کی طرف دیکھا اور بولا۔

"صوبیدار رام داس کو تو آپ کا پتہ نہیں ہے۔ ہاں اگر باہر والے فوجی نے پوچھا تو

اسے بتا دوں گا۔ مگر اب آپ کیا کریں گے؟"

کرنل طارق نے کہا۔

"اب ہم اپنا مشن شروع کریں گے۔ لیکن ہم تمہارے باڑے سے نکل جائیں گے۔
تم فکر مت کرو۔"

شعبان نے کوئی جواب نہ دیا باڑے میں دوسرے کمانڈو اپنے لیڈر کا بے تابی سے
انتظار کر رہے تھے۔ شعبان یہ کہہ کر اپنے گھر پر ہی رہ گیا کہ میں دوپہر کا کھانا لے کر آؤں
گا۔ اس نے کرنل طارق کو ایک بار پھر تاکید کی کہ باڑے سے باہر ہرگز نہ نکلیں باڑے
میں آتے ہی کرنل طارق نے دروازہ بند کر لیا اور اپنے ساتھیوں کے درمیان بیٹھ کر انہیں
سمجھانے لگا کہ قلعے کے اندر ایمونیشن اور پٹرول کا ذخیرہ اس کے اندازے کے مطابق
کس مقام پر ہے۔ بند دروازے کی درازوں میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔
کرنل طارق نے وہیں کچے فرش پر انگلی سے لکیریں کھینچ کر قلعے کا سارا محل وقوع اور
شمال مغربی دیوار کے بارے میں بتایا کہ انہیں اس دیوار کو پھاند کر قلعے کے اندر داخل ہونا
ہوگا۔"

"یہ کمانڈو رجمنٹ کا رجمنٹل ہیڈکوارٹر ہے۔ اس کے صدر دروازے سے اندر
داخل نہیں ہو سکیں گے۔"

"کیا قلعے کے دیوار کی اوپر کوئی گن پوسٹ نہیں ہے۔"

کمانڈو خالد نے پوچھا۔ کرنل طارق نے کہا۔

"دیوار مجھ سے کافی فاصلے پر تھی اور اس کا کچھ حصہ ایمونیشن یا پٹرول ڈمپ کے
ابھار میں چھپا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی پوسٹ ہو۔"

کمانڈو قاسم نے رائے ظاہر کی کہ ہمیں پہلے دیوار کی ریکی کر لینی چاہئے۔

لیڈر بولا۔

"ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ ہم یہاں ٹریننگ یا مشقوں پر نہیں آئے ہوئے
ہم دشمن کے درمیان بیٹھے ہیں۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

باڑے کی نیم روشن فضا میں چاروں جانبازوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں کرنل
طارق نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ہم آج ہی رات اٹیک کریں گے۔ تین جوان آگے پیچھے قلعے کی شمال مغربی دیوار کی طرف بڑھیں گے۔ ایک جوان پیچھے رہ کر انہیں تحفظ دے گا۔"

اسی وقت رات کے اٹیک کا پلان تیار کر لیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ کرنل طارق ان کی قیادت کرے گا۔ خالد اور قاسم اس کے پیچھے ہوں گے۔ کیپٹن فاروق آٹھ قدموں کے فاصلے پر پیچھے پیچھے انہیں لائٹ مشین گن کا تحفظ دے گا۔ کرنل طارق کہہ رہا تھا۔

"قلعے کی دیوار بوسیدہ اور شکستہ ہے۔ اس کی اینٹیں کہیں نہ کہیں سے ضرور اکھڑی ہوئی ہوں گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم خود اکھاڑ لیں گے تم لوگ اسلحہ وغیرہ سیٹ کر لو۔"

دوپہر کو شعبان ان کے لئے کھانا لے کر آیا تو کرنل طارق نے اس کو یہ بالکل نہ بتایا کہ وہ آج رات اٹیک کرنے والے ہیں۔ بلکہ اس سے قلعے کی عقبی دیوار کے بارے میں سوالات کئے، جن کے جواب میں شعبان نے کہا۔

"دیوار تین چار مرد اونچی ہے اور ٹوٹی ہوئی بھی ہے" اس نے بتایا کہ اس کے مشاہدے کے مطابق قلعے کی دیوار پر صرف دروازے کے اوپر اور باہر انڈین فوج کے دو تین مورچے ہیں۔

اصل میں یہ کوئی قلعہ نہیں تھا۔ کشمیر کے کسی بادشاہ نے یہاں ایک گول دیوار کھینچ کر احاطہ سا بنا لیا تھا۔ اس کے اندر ایک پرانی بارہ دری بھی ہے۔ بارہ دری اب ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔"

شعبان نے پوچھا "آپ لوگوں نے اب کیا پروگرام طے کیا ہے؟"

کرنل طارق نے اپنے پلان کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"اس کے بارے میں ہم کل تمہیں کچھ بتا سکیں گے۔"

شعبان کہنے لگا۔

"میرا تو مشورہ یہی ہے کہ آپ کو جو کچھ کرنا ہے جلدی کر لینا چاہئے۔ کیونکہ یہاں ہر وقت خطرہ ہے۔ آپ انڈین آرمی کے بالکل سامنے بیٹھے ہیں۔"

کرنل طارق نے شعبان کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو شعبان۔ ہم خود زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔"

شعبان یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ کل صبح دودھ دینے کے وقت آئے گا۔ باقی کا دن کمانڈو

پارٹی نے وہیں بھینسوں کے باڑے کے اندر ہی گزارا وہ سر جوڑے اپنے شروع کئے جانے والے خطرناک مشن پر مزید غور و فکر کرتے رہے۔ انہوں نے شام تک ساری تیاری مکمل کر لی تھی۔ کرنل طارق کہنے لگا۔

"ٹارگٹ پر پہنچ کر حالات نیا رخ بھی بدل سکتے ہیں۔ موقع کے مطابق وہاں کام کیا جائے گا۔"

رات کے ایک بجے تک کمانڈو پارٹی کے سارے جوان جاگتے رہے۔ انہوں نے اپنی اپنی گھڑیوں کے وقت ملا لئے تھے۔ ہر ایک کی پیٹھ پر میگزین سے بھری ہوئی لائٹ مشین گن لگی تھی۔ ہر ایک کی جیب میں گرنیڈ اور کمانڈو چاقو تھے۔ بھینسوں کے باڑے سے روانہ ہونے سے پہلے ان سب نے آنکھیں بند کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنے مشن کی کامیابی کے لئے دعا مانگی۔ اس کے بعد کرنل طارق نے آخری وقت میں کچھ ہدایات دیں اور کہا۔

"جوانو! کوئی پتہ نہیں ہم میں سے کوئی واپس بھی آتا ہے کہ نہیں۔ اس جگہ ایک دوسرے سے کہا سنا معاف کرا لو۔ اللہ کا خیال دل میں رکھنا۔ دشمن کی پوزیشنوں کو نگاہ میں رکھنا۔ ٹارگٹ ہر حالت میں تباہ کرنا ہے۔ مر گئے تو شہید۔ زندہ رہے تو غازی۔ نبی پاکؐ کا کلمہ پڑھو اور چلو۔"

انہوں نے دل میں کلمہ شریف پڑھا اور ایک ایک کر کے بھینسوں والے باڑے سے باہر نکل آئے۔ رات اندھیری تھی۔ انہیں اندھیری رات ہی کی ضرورت تھی۔ مشن کے لئے یہ اندھیری راتیں خاص طور پر چنی گئی تھیں۔ روانہ ہونے سے پہلے ایک ایک چیز چیک کر لی گئی تھی۔ وادی پر چاروں طرف رات کا گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چاروں گوریلے سیدھا راستہ چھوڑ کر ایک طرف ڈھلان اترنے لگے۔ ڈھلان ایک گہری کھڈ کے دہانے تک چلی گئی تھی۔ کمانڈو لیڈر کرنل طارق آگے آگے تھا۔ وہ ایک قطار میں چل رہے تھے۔ ہر کمانڈو کے درمیان چار قدم کا فاصلہ تھا۔ سب سے آخر میں کیپٹن خالد تھا جس نے لائٹ مشین گن اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ اندھیرے میں ان کی آنکھیں اور کان چوکس تھے۔ وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں وادی کا ایک لمبا چکر کاٹ کر واپس ٹیلے کے دامن میں آ گئے جس کے اوپر انڈین کماؤں رجمنٹ کا قلعہ

نما ہیڈکوارٹر تھا۔ کرنل طارق نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ سب بیٹھ گئے۔ کرنل طارق
کی نظریں اندھیرے میں اوپر قلعے کی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے سرگوشی میں اپنے
ساتھیوں کو آخری بار کچھ ہدایات دیں اور ٹیلے کی چڑھائی چڑھنی شروع کر دی۔

کیپٹن خالد لائٹ مشین گن لئے ان سے تھوڑا سا الگ ہو کر پہلو میں اس طرح چل
رہا تھا کہ اگر دائیں بائیں کسی طرف سے دشمن کی پٹرول پارٹی کا خطرہ پیدا ہو تو اپنے
ساتھیوں کو تحفظ دیا جا سکے۔ ٹیلے کی چڑھائی کہیں کہیں دشوار ہو جاتی اور انہیں جھاڑیوں
کا سہارا لے کر اوپر چڑھنا پڑتا۔ خطرہ صرف یہ تھا کہ کہیں دیوار کی اس جانب اچانک کسی
گن پوسٹ سے ان پر فائر نہ آنے لگے۔ رات کا اندھیرا کافی حد تک ان کی حفاظت کر رہا
تھا۔ قلعے کی دیوار قریب آ گئی تھی۔ وہ اب رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ کرنل
طارق کو یقین تھا کہ یہ قلعے کی دیوار کا وہی حصہ ہے جس کے اندر ایمونیشن کا ڈپو اور
پٹرول کا ڈمپ ہے۔ قلعے کی دیوار کے دامن میں پہنچ کر وہ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے
۔ کیپٹن خالد لائٹ مشین گن لئے تھوڑا پیچھے ایک جھاڑی میں پوزیشن لئے بیٹھا تھا۔
کرنل طارق نے اندھیرے میں دیوار کی دونوں جانب اور اوپر کی طرف دیکھا۔ اسے دیوار
کے اوپر کوئی انسانی سایہ حرکت کرتا نظر نہ آیا۔ اس نے ٹٹول کر دیوار کا جائزہ لیا۔ دیوار
واقعی بوسیدہ تھی۔ اگرچہ وہ پتھر کی دیوار تھی مگر امتداد زمانہ کے باعث پتھر جگہ جگہ سے
اکھڑے ہوئے تھے۔ دیوار کی بلندی بیس فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ کرنل طارق نے ایک
اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی تینوں کمانڈوز نے اسلحہ چیک کیا۔ گنیں پیٹھ پر باندھ لیں اور
کمانڈو چاقو دانتوں میں دبا کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ بجلی ایسی تیزی کے
ساتھ ایک کمانڈو نے کرنل طارق کے پاؤں اپنے کاندھے پر رکھے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تیسرا
کمانڈو دیوار کے ساتھ لگ کر پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ جس کمانڈو نے کرنل طارق کو اپنے
کاندھے پر اٹھا رکھا تھا اس نے اپنے پاؤں تیسرے کمانڈو کے کاندھے پر رکھ دیئے۔ تیسرا
کمانڈو دیوار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کرنل طارق سب سے اوپر تھا۔

اب اس کا ہاتھ دیوار کی منڈیر سے ایک فٹ نیچے تھا۔ اس نے آہستہ سے اچھل کر
دیوار کی منڈیر کو پکڑ لیا اور ساتھ ہی دونوں پاؤں اٹھا کر دیوار کے اوپر ٹانگیں لگا دیں اور
وہیں اوندھا پڑا رہا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ نیچے کیا۔ دوسرا کمانڈو بھی اس ہاتھ کے سہارے

دیوار پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ تیسرا کمانڈو دیوار کے ساتھ نیچے ہی گن لئے بیٹھا رہا۔ کرنل
طارق اور اس کے ساتھی کمانڈو فاروق نے دیوار کے اوپر اوندھے پڑے پڑے گردن گھما
کر دوسری طرف دیکھا۔ کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر زمین کا ابھار ایک بہت بڑی قبر کی
طرح اوپر کو نکلا ہوا تھا۔ کرنل طارق نے کمانڈو فاروق کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ادھر
اشارہ کیا۔ کمانڈو فاروق بھی اس ابھار کو دیکھ چکا تھا جس کے سامنے کی جانب ایک اونچے
کھمبے کے ساتھ بجلی کا بلب روشن تھا۔ بلب کی روشنی آگے کی طرف زیادہ تھی۔ یہ
ایمونیشن ڈپو اور پٹرول کا ڈمپ ہی ہو سکتا تھا۔ ابھار کے پیچھے اندھیرا تھا۔ یہ قلعہ محاذ
جنگ سے بہت دور تھا اس لئے دشمن نے یہاں بلیک آؤٹ کی بھی ضرورت محسوس نہیں
کی تھی۔ صرف بلب کے چاروں طرف ایک شیڈ لگا دیا گیا تھا۔ جنگ ابھی اس طرف پہنچی
بھی نہیں تھی۔ جنگ کا زور پنجاب کے محاذوں پر زیادہ تھا۔ کرنل طارق نے نیچے دیکھا۔
نیچے گھنی جھاڑیاں اندھیرے میں سیاہ دھبوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ اسے صرف
یہی خطرہ تھا کہ ان کے گرنے سے کہیں آواز پیدا نہ ہو۔ کیونکہ یہ بات یقینی تھی کہ
ایمونیشن ڈمپ کے آگے نائٹ گارڈ کا پہرہ ہو گا اور انڈین فوجی وہاں موجود ہوں گے۔
وقت گزر رہا تھا۔ وہ وقت ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ کرنل طارق نے کمانڈو
فاروق کا بازو تھوڑا سا دبایا اور پھر اپنے آپ کو ایک بے جان پتھر کی طرح نیچے جھاڑیوں پر
گرا دیا۔ وہ ایک بوری کی طرح گھنی جھاڑیوں میں جا کر گرا۔ جھاڑیاں نرم تھیں کوئی
آواز پیدا نہ ہوئی۔ پھر بھی کرنل طارق چاقو ہاتھ میں لئے جھاڑیوں میں ایک دو سیکنڈ کے
لئے ساکت ہو کر بیٹھا رہا اور زمین کے ابھار کی طرف تکتا رہا۔ جب ادھر سے کوئی انڈین
فوجی نہ آیا تو کرنل طارق جھاڑیوں میں سے نکل کر گھٹنوں کے بل چلتا دوسری طرف
ہو گیا۔ کمانڈو فاروق دیوار کے اوپر سے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔
اسے کرنل طارق کا سایہ ایک طرف ہٹتے نظر آیا تو اس نے دل میں کلمہ شریف پڑھا اور
اپنے آپ کو جھاڑیوں پر گرا دیا۔ دھپ کی ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ دونوں کمانڈو اس جگہ
ساکت ہو گئے۔ ان کی آنکھیں ایمونیشن ڈپو کے قبر نما بڑے ابھار کی طرف لگی ہوئی
تھیں جدھر دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ اس طرف سے گشت کرتے کسی بھارتی سپاہی کے
اچانک نمودار ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ دو کمانڈو قلعے کی دیوار کے

باہر تھے۔ کیپٹن خالد دیوار سے چند قدم پیچھے جھاڑیوں میں لائٹ مشین گن لئے بیٹھا اندھیرے میں گھور رہا تھا۔ کمانڈو قاسم دیوار کے نیچے اندھیرے میں گن لئے بیٹھا دیوار کی دونوں جانب نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ دیوار کے اندر کرنل طارق اور کمانڈو فاروق ایمونیشن ڈمپ کے پیچھے شبنمی گھاس میں اوندھے لیٹے ہوئے تھے۔ اب ایک دوسرے کو ہدایات دینے کا وقت گزر چکا تھا۔ یہ ایکشن کا وقت تھا۔ چاروں کمانڈوز کو معلوم تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ کرنل طارق نے اپنے قریب زمین پر لیٹے کمانڈو فاروق کے کندھے کو آہستہ سے دبایا۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈو فاروق ڈمپ کی دوسری طرف رینگنے لگا۔ کرنل طارق ڈمپ کے ابھار کی اس طرف رینگتے ہوئے آگے بڑھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو تھے۔

کرنل طارق رینگتے رینگتے ڈمپ کے پہلو میں آگیا۔ یہاں روشنی تھی۔ اسے پہلی بار فوجی جوتوں کی آواز آئی۔ وہ زمین کے ساتھ لگ گیا اور گردن ایک طرف کرلی۔ پھر ذرا سا سر آگے کرکے دیکھا۔ یہ وہی جگہ تھی جو اس نے دن کی روشنی میں دیکھی تھی۔ یقیناً یہ ایمونیشن ڈپو تھا۔ جو زمین کے اندر بنا ہوا تھا۔ سامنے ایک طرف آگ بجھانے کے آلات دیوار کے ساتھ ٹنگے ہوئے تھے۔ کونے میں ریت کی بوریوں کا مورچہ تھا جس کے آگے دو فوجی ٹہل رہے تھے۔ ان کی لائٹ مشین گنیں کاندھوں کے ساتھ لٹک رہی تھیں۔

ادھر ایمونیشن ڈپو کا زمین کے اندر جاتا راستہ تھا۔ ایک انڈین فوجی نے ڈوگری زبان میں دوسرے سے کچھ کہا۔ دوسرا ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنسا۔ کرنل طارق کو معلوم تھا کہ ڈمپ کی دوسری طرف سے کمانڈو فاروق بھی اپنی پوزیشن پر پہنچ گیا ہوگا۔ اس نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ دور کچھ فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ رجمنٹل آفس کی جانب بھی شیڈ والی دھندلی روشنی ہو رہی تھی۔ ان دونوں انڈین فوجیوں کے سوا تیسرا کوئی سپاہی نہیں تھا۔ ایک سپاہی ریت کی بوری پر بیٹھا تھا۔ دوسرا اس کے آگے ٹہل رہا تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق کمانڈو فاروق نے ڈمپ کی دوسری جانب اندھیرے میں حلق سے گیدڑ کی آواز نکالی۔ دونوں فوجیوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ جو فوجی بیٹھا ہوا تھا بولا۔

"سالے پھر آگئے ہیں گیدڑ کی اولاد۔"

"میں اسے بھگاتا ہوں" دوسرا فوجی یہ کہہ کر دوسری طرف بڑھا۔

پہلے نے پیچھے سے آواز دی۔

"فائر نہ کرنا تمہیں دیکھ کر ہی بھاگ جائیں گے۔"

دوسرا فوجی گن ہاتھوں میں لئے اس طرف بڑھا جدھر سے فاروق نے گیدڑ کی آواز نکالی تھی۔ کرنل طارق ٹکٹکی باندھے اندھیرے میں اس طرف دیکھ رہا تھا۔ کمانڈو رجمنٹ کا جوان ڈمپ کی دوسری طرف اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ یہ بڑی نازک گھڑی تھی۔ ادھر سے فائرنگ کی آواز یا انڈین فوجی کی چیخ کی آواز بھی آسکتی تھی اور کمانڈو پارٹی کا سارے کا سارا مشن خاک میں مل سکتا تھا۔ کرنل طارق ہمہ تن گوش ہو کر زمین کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ دوسری طرف گہرا سناٹا چھایا رہا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کمانڈو فاروق نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اگر اس کا ہاتھ غلط پڑتا تو اب تک یہاں فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ مگر فاروق ایک ٹرینڈ کمانڈو تھا۔ اس کا ہاتھ اوچھا پڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ انڈین سپاہی جو پیچھے مورچے کے باہر ریت کی بوری پر بیٹھا تھا اس طرف دیکھ کر بولا۔

"کانشی راما۔ کیہ ہوگیا اوئے۔"

وہ اٹھا اور اس جانب بڑھنے ہی لگا تھا کہ اب کرنل طارق نے وہی آواز حلق سے نکالی۔ سپاہی وہیں رک گیا۔ گھوم کر پیچھے دیکھا اور گالی دے کر بولا۔

"اب ادھر آگیا ایں اوئے۔"

وہ کرنل طارق کی طرف بڑھا۔ وہ چلا بھی آرہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ گیدڑ کو گالیاں بھی دے رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں آیا تو ایک طرف سے کوندا سا لپکا اور دوسرے لمحے کماؤن رجمنٹ کا یہ جوان اس طرح کرنل طارق کے ہاتھوں میں لٹک گیا کہ اس کی گردن ایک طرف سے آدھی سے زیادہ کٹ چکی تھی۔ کرنل طارق نے اسے وہیں نیچے گرا دیا اور ڈمپ کے دروازے کی طرف لپکا۔ دوسری طرف سے کمانڈو فاروق بھی وہاں آگیا۔ ایمونیشن ڈمپ کے آگے ریت کی بوریوں کی دیوار کھڑی کی ہوئی تھی۔ وہ ایک طرف سے گزر کر دیوار کے پیچھے آگئے۔ سامنے ایک غار نما راستہ نیچے جا رہا تھا۔ یہاں بھی آگے ریت کی بوریوں کی ایک دس فٹ اونچی دیوار کھڑی تھی۔ اس کے عقب میں ایک کشادہ ہال نما کمرہ تھا جہاں جگہ جگہ اسلحہ کے ڈھیر پڑے تھے۔ دیوار کے ساتھ لوہے کے شیلفوں میں بھی قسم قسم کا اسلحہ، گرنیڈ، راکٹ لانچر، مارٹر توپوں کے گولے اور میگزین پڑے تھے۔

چھت کے ساتھ ایک بلب روشن تھا۔ کمانڈو فاروق اور کرنل طارق تیزی سے اپنے
اپنے کام میں لگ گئے۔ انہیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔
انہیں معلوم تھا کہ کہاں کہاں بارودی سٹکیں لگانی ہیں۔ یہ کافی بڑا اسلحہ کا ڈپو تھا۔ پانچ
منٹ سے بھی کم وقت میں دونوں جانبازوں نے سات جگہوں پر بارود کی سٹکس لگا کر ان
سب کو ایک تار کے ساتھ منسلک کر دیا اور سوکٹ میں چھپے ہوئے چھوٹے سے کلاک کا
بٹن دبا دیا۔ بیس منٹ بعد ایمونیشن ڈپو میں دھماکے شروع ہو جانے تھے۔ کرنل طارق
نے کمانڈو فاروق کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں ڈپو کے دروازے کی طرف لپکے۔ ابھی وہ
ریت کی بوریوں کی پہلی دیوار کے قریب ہی تھے کہ باہر سے کسی فوجی کی بھاری بھرکم آواز
بلند ہوئی۔

"اوئے تم جانگلی کہاں مر گئے ہو؟"

دونوں کمانڈوز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انڈین فوجی اندر آرہا تھا۔ دونوں غار نما
راستے کی دیوار کے ساتھ لگ گئے۔ لائٹ مشین گنیں ان کے ہاتھوں میں سیدھی ہو
گئیں۔ جونہی ایک بھاری بھرکم انڈین فوجی اپنے گم شدہ فوجیوں کو آوازیں دیتا سامنے
نمودار ہوا کرنل طارق نے مشین گن کا برسٹ مارا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ
ہی باہر سے کسی نے چلا کر کہا۔

"کیا ہوا؟ یہ فائرنگ کس نے کی ہے صوبیدار جی؟"

معلوم ہوا باہر بھی کچھ فوجی موجود تھے۔ ان کے ادھر ادھر دوڑنے اور ایک دوسرے
کو پکارنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کرنل طارق نے فاروق سے کہا۔

"یہ لوگ اندر آگئے تو ہمارے لگائے ہوئے بم ڈی ٹیکٹ کر لیں گے۔ ہمیں انہیں
دھماکہ ہونے تک باہر ہی روکے رکھنا ہے۔"

کمانڈو فاروق اور کرنل طارق سمجھ گئے تھے کہ اب وہ زندہ واپس نہیں جا سکیں گے۔
شہادت کا مرتبہ انکے حصے میں لکھ دیا گیا تھا۔ باہر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ دونوں کمانڈو
میگزین لے کر غار کی دونوں جانب پوزیشنیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ جونہی کوئی سپاہی اندر
آتا یہ اسے برسٹ مار کر وہیں ڈھیر کر دیتے۔ باہر خطرے کا الارم بجا دیا گیا تھا۔ ہر طرف
ایک شور مچ گیا تھا۔ کرنل طارق نے فاروق سے کہا۔

"جوان! ابھی دھماکہ ہونے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ ہوسکتا ہے اتنی دیر میں دشمن
کچھ ٹینک وغیرہ قلعے سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو جائے۔ جب شہید ہی ہونا ہے تو پندرہ
منٹ پہلے کیا اور پندرہ منٹ بعد میں۔ کلمہ پڑھ لے۔"

یہ کہہ کر کرنل طارق بھی کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھا۔ شیلف میں سے راکٹ لانچر اٹھا
کر اس میں راکٹ ڈالا۔ کاندھے پر رکھا اور ایمونیشن کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو
ٹارگٹ بنا کر فائر کر دیا۔ کمانڈو فاروق فائرنگ کر کے انڈین سپاہیوں کو اندر آنے سے
روکے ہوئے تھا۔ راکٹ اپنے لانچر سے نکل کر اسلحہ کے ڈھیر سے ٹکراتے ہی پھٹا اور
ایک دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ ان دھماکوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا جو اس کے
بعد شروع ہوئے۔ ایمونیشن ڈمپ ایٹم بم کی طرح پھٹا اور قلعے میں زلزلہ آگیا۔ آگ کے
شعلوں میں سے راکٹ فائر ہو کر قلعے میں ادھر ادھر گرنے اور جگہ جگہ کھڑے ٹینکوں،
گاڑیوں اور فوجیوں کے پرخچے اڑنے لگے۔

پہلے دھماکے کے ساتھ ہی قلعے کی دیوار کے باہر اندھیرے میں بیٹھے کمانڈو قاسم کو
ایک دھکا لگا اور وہ اچھل کر دور جا گرا۔ کمانڈو خالد جھاڑیوں میں پوزیشن لئے ہوئے تھا۔
اس کے بعد دھماکے شروع ہو گئے۔ آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ قلعے کی دیوار کے
اندر جیسے آگ کے قیامت خیز الاؤ بھڑکنے لگے تھے۔ دھماکوں سے کان پھٹ رہے تھے۔
کیپٹن خالد نے اپنے ساتھی کمانڈو قاسم کو آواز دی۔

"گرائیں واپس چلو۔ کرنل صاحب اور فاروق شہید ہو گئے ہیں۔"

انہوں نے لائٹ مشین گنیں وہیں پھینکیں اور اندھیرے میں قلعے کی ڈھلان پر لڑھکتے
چلے گئے۔ قلعے میں دوزخ کا منظر تھا۔ جیسے پہاڑ پھٹ رہے تھے۔ آگ کے بلند شعلے
آسمان کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ساری وادی روشن ہو گئی تھی۔ راکٹوں کے کڑاکے اور
پھر ان کے پھٹنے کے دھماکوں سے وادی کے ٹیلے اور پہاڑیاں لرز رہی تھیں کماؤں رجمنٹ
کا ہیڈ کوارٹر ایک تنور بن چکا تھا جس کے اندر بارود کے شعلے ہر شے کو جلا کر راکھ کر رہے
تھے۔ میں نے جھک کر نیچے دیکھا۔ مجھے اپنے کمانڈو کہیں نظر نہ آئے۔ آگ کی تپش میں
وہاں کھڑے رہنا میرے لئے بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میں پیچھے ہٹنے ہی لگا تھا کہ کسی نے میرا
ہاتھ پکڑ کی مجھے وہاں سے نکال لیا۔ یہ ہاتھ سبز پوش ہی کا تھا۔ میں اس ہاتھ کے نورانی

لمس کو پہنچاتا تھا۔ میں جیسے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ کماؤں رجمنٹ ہیڈ کوارٹر کی جہنمی آگ کے شعلے مجھ سے دور ہوتے چلے گئے اور پھر مجھے بادلوں نے ڈھانپ لیا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ میرا ہاتھ سبز پوش کے ہاتھ میں تھا بادلوں کی سرد ہوا میرے جسم کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ سبز پوش کی لطیف آواز میرے کانوں میں آئی۔

"آنکھیں کھول کر دیکھو۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ چاروں طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے سامنے سرسوں کا ایک خوبصورت کھیت تھا کھیت کے کنارے کنارے چیڑھ کے درخت دور ایک گاؤں تک چلے گئے تھے جس کے مکانوں پر خاموشی اور اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے سبز پوش سے سوال کیا۔

"ہم کہاں آگئے ہیں؟"

سبز پوش کی آواز آئی۔

"یہ پوٹھوہار کا علاقہ ہے جہاں کے جیالے بہادر نوجوان فوج کی نوکری کو ایک باعزت اور باعث فخر پیشہ سمجھتے ہیں۔ اس علاقے کا شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو گا جس کے ایک دو جوان فوج میں نہ ہوں۔ دوسری عالمگیر جنگ میں جس فوج نے العالمین کے ٹینکوں کی سب سے بڑی جنگ میں جرمن جرنیل رومیل کی پوری ڈویژن کو شکست فاش دے کر جرمنوں کو شمالی افریقہ سے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا اس فوج کے جوانوں کا تعلق اسی پوٹھوہار، جہلم، میانوالی اور چکوال کے علاقے سے تھا۔ تب یہ انگریزوں کی خاطر لڑتے تھے۔ مگر اب یہ پاکستان اور اسلام کے شیر دل مجاہد ہیں اور پاک فوج کو ان جیالوں پر فخر ہے۔"

میں نے سبز پوش سے پوچھا۔

"مگر آپ مجھے اس سنسان جگہ پر کس لئے لائے ہیں؟"

سبز پوش کی آواز آئی۔

"میں تمہیں اس بہادر خطے کے ایک نوجوان سے ملوانے لایا ہوں۔"

"مگر مجھے تو یہاں کوئی نوجوان دکھائی نہیں دیتا" میں نے کہا۔

سبز پوش نے چاندنی رات میں دور اونچے نیچے کھیتوں کے درمیان سوئے ہوئے چھوٹے

سے گاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

اور وہ میرا ہاتھ تھام کر پلک جھپکتے میں مجھے گاؤں کے قریب لے آیا۔ گاؤں سے ایک کوس کے فاصلے پر گاؤں کے چھوٹے سے دیہاتی ریلوے سٹیشن کے سگنل کی سرخ بتی سبز ہو گئی ہوئی تھی۔ پھر دور سے ایک ریل گاڑی کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ سبز پوش بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ جس نوجوان سے میں تمہیں ملوانے لایا ہوں وہ اسی گاڑی سے اپنے گاؤں آرہا ہے۔ وہ اپنی فوج کا ایک سپاہی ہے۔ وہ دو دن کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں آرہا ہے۔ مگر وہ اپنے گھر والوں سے اپنے ماں باپ بہن بھائی سے ملنے نہیں آرہا۔"

میں نے کسی قدر تعجب سے پوچھا۔

"تو پھر وہ اپنے گاؤں کس لئے آرہا ہے؟"

سبز پوش نے پر سکون آواز میں جواب دیا۔

"وہ اپنے ایک دشمن کو قتل کرنے آرہا ہے۔"

میں حیران سا ہو کر رہ گیا۔ میری زبان سے اپنے آپ نکل گیا۔

"کیا وہ اپنی رجمنٹ سے چھٹی لے کر صرف اپنے دشمن کو قتل کرنے کے واسطے آرہا ہے؟"

سبز پوش نے کہا۔

"تمہاری حیرت بجا ہے۔ تم شہر کے رہنے والے زیادہ تعلیم یافتہ نوجوان ہو۔ تم لوگوں نے دوستی کے رشتوں کے ساتھ ہی ساتھ دشمنی کے جذبے کو بھی اپنی منافقت میں رنگ کر بدنام کر دیا ہے۔ نہ تم اچھے دوست ہو نہ اچھے دشمن۔ تم جس سے دشمنی رکھتے ہو مصلحت کے پیش نظر اس سے دوستی بھی کر لیتے ہو۔ مگر یہ نوجوان گاؤں کا رہنے والا ہے۔ تمہاری طرح زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ وہ کھل کر دوستی کرتا ہے اور کھل کر دشمنی کرتا ہے۔ تم دوستی کی آڑ میں دشمنی کرتے ہو مگر دیہات کا یہ نوجوان ابھی اس قسم کی شہری منافقت سے آشنا نہیں ہے۔ وہ دشمن کے منہ پر اپنی دشمنی کا اعلان کرتا ہے اور اسے للکار کر، اسے خبردار کر کے اس پر حملہ کرتا ہے۔"

میں نے سوال کیا۔

"تو کیا یہ رات کے اندھیرے میں چھپ کر اپنے دشمن کو قتل کرنے نہیں آرہا؟ اسے تو دن کی روشنی میں اپنے دشمن پر وار کرنا چاہئے تھا۔"

سبزپوش نے کہا۔

"گاؤں کا یہ نوجوان جس کا نام نورداد ہے اپنے دشمن میاں خان پر چھپ کر وار نہیں کرے گا۔ یہ اسے گھر سے جگا کر میدان میں بلائے گا۔ تاکہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آکر موت کو للکاریں۔"

میں نے کہا۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

سبزپوش بولا۔

"تم سب کچھ اپنے آپ سمجھ جاؤ گے۔ میں تمہیں کچھ دیر کے لئے گاؤں میں آنے والے فوجی جوان نورداد کے ساتھ کر دوں گا۔ تم اپنے کانوں سے سنو گے کہ وہ کیا کہتا ہے تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ سٹیشن پر گاڑی آگئی ہے۔"

سبزپوش نے چاندنی رات میں مجھے ساتھ لیا اور اس پگ ڈنڈی پر آگیا جو گاؤں کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن سے گاؤں کی طرف آتی تھی۔ ریل گاڑی ایک منٹ رک کر سٹیشن سے روانہ ہو چکی تھی۔ آدھی رات کو اس دیہاتی سٹیشن پر سوائے ایک فوجی جوان کے دوسرا کوئی مسافر نہیں اترا تھا۔ یہ فوجی جوان سفید کپڑوں میں تھا۔ اس نے فوجی وردی نہیں پہنی ہوئی تھی۔ وہ گاؤں کی طرف جاتی پگ ڈنڈی پر چلا آرہا تھا۔ اس کی بغل میں ایک تھیلا لٹک رہا تھا۔ سبزپوش مجھ سے جدا ہوگیا تھا۔ اس نے اس فوجی جوان کا نام نورداد بتایا تھا۔ چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سارے کا سارا علاقہ سنسان تھا۔ یہ نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ گاؤں کے قریب آکر وہ ایک طرف کو مڑگیا جدھر ایک چھوٹا سا پہاڑی نالہ بہتا تھا۔ جس کو پوٹھوہار کی زبان میں کسی کہتے ہیں۔ نالے کے اوپر سے ہو کر وہ گاؤں کے پچھواڑے نکل آیا۔ یہ پچاس ساٹھ دیہاتی مکانوں پر مشتمل چھوٹا سا گاؤں تھا جو آدھی رات کی خاموشی میں نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ محنت کش لوگ دن بھر کے

کام کاج سے تھک کر گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ گاؤں کی طرف سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ جوان وہیں رک گیا۔ ایک کتا مکانوں کی طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور جوان کے پاس آکر اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ کتا اپنے گاؤں کے جوان کی بو کو پہچانتا تھا۔ اس نے اپنے گاؤں کے جوان کی بو کو پہچان لیا تھا۔ جوان نے اسے پیار کیا اور کتا ادھر ادھر کی بو سونگھنے کے بعد واپس گاؤں کی طرف چلا گیا۔ جوان کا مکان اسی گاؤں میں تھا جہاں اس کا باپ ماں ایک بہن اور ایک بھائی سو رہے تھے۔ مگر وہ ان سے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے خاندانی دشمن میاں خان کو قتل کرنے آیا تھا جس کے بارے میں اس کے باپ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ "میاں خان کے باپ نے ہمارے کھیت کی زمین اپنے کھیت میں شامل کرلی ہے۔ ہم نے اسے منع کیا تو وہ اپنے آدمی لے آیا۔ ہم بھی میدان میں نکل آئے۔ ڈانگیں چلنے لگیں۔ فائر بھی ہوئے مگر گاؤں والے بیچ میں پڑ گئے ہم نے مقدمہ کر دیا ہے۔ پر دشمن کا بڑا زور ہے۔ پٹواری بھی اس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ہمیں خطرہ ہے کہ ایک دن وہ ہماری ساری زمین پر قبضہ کرلے گا۔" یہ خط جوان نورداد کو اپنی رجمنٹ میں ملا تھا۔ اس نے خط کو پڑھا اور ایک ہی بار سارا قصہ ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے دو دن کی چھٹی لی اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وزیر آباد کے اسٹیشن پر سے اس نے دو لمبے چاقو خرید لئے اور ایسی گاڑی پکڑی جو آدھی رات کے وقت اس کے گاؤں پہنچتی تھی۔ وہ اپنے دشمن میاں خان کو قتل کرنے کے بعد وہیں سے اپنی رجمنٹ میں واپس چلا جانا چاہتا تھا۔ میاں خان بھی اس کی عمر ہی کا جوان تھا۔ ملک کی صورت حال یہ تھی کہ کشمیر میں جنگ ہو رہی تھی اور اکھنور کے محاذ پر دشمن کو بھاری نقصان ہو رہا تھا اور بھارت کے وزیراعظم نے اعلان کر دیا تھا کہ اب وہ اپنی مرضی کا محاذ کھولیں گے۔ فوجی جوان نورداد کو چھٹی ملنا مشکل تھی مگر اس نے اپنے باپ کی شدید بیماری کا بہانہ بنا کر دو دن کی چھٹی لے لی اور رجمنٹل ہیڈکوارٹر سے اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایک دن اسے اپنے گاؤں پہنچتے ہوئے لگ گیا تھا اور ایک ہی دن اسے واپس اپنی رجمنٹ میں پہنچنے میں لگنے والا تھا۔

جوان نورداد گاؤں میں اپنے مکان کی طرف جانے کی بجائے ایک پہاڑی ڈنڈی پر سے گزرتا ہوا گاؤں کے عقب میں ذرا باہر نکل کر بنی ہوئی کوٹھڑی کے پاس آکر رک گیا۔

اس نے دائیں بائیں غور سے دیکھا ۔ ہلکی چاندنی میں اسے وہاں کوئی آدمی نظر نہیں آرہا تھا ۔ اسے معلوم تھا کہ اس کوٹھڑی میں اس کا دیہاتی دوست اور ہم راز صابو لکڑ ہارا رہتا ہے ۔ کوٹھڑی کے دروازے پر آکر نورداد نے آہستہ سے دستک دے کر صابو کو آواز دی ۔ دو تین بار دستک دینے کے بعد اندر سے کسی نے پوچھا "کون ہو بھئی" نور داد نے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر کہا ۔ " میں ہوں صابو ' نور داد ' دروازہ کھولو " دروازہ کھل گیا ایک دبلے پتلے نوجوان نے گھور کر نورداد کو دیکھا ۔ "نور داد تم ؟ کیا چھٹی پر آئے ہو ؟"

" ہاں " نورداد نے کہا اور کوٹھڑی کے اندر گھس کر دروازہ بند کر دیا ۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا ۔ صابو نے مٹی کے تیل کا لیمپ روشن کرتے ہوئے پوچھا ۔

" خیر تو ہے ۔ تم گھر نہیں گئے ۔"

نور داد بولا ۔ " لیمپ کی بتی اونچی نہ کرنا میں ایک بڑے ضروری کام سے آیا ہوں" صابو سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ گڑ بڑ ہے ۔ اس نے لیمپ کی بتی نیچی ہی رکھی جس سے کوٹھڑی میں دھندلی سی روشنی ہو گئی تھی ۔ نورداد وہیں صابو کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا ۔ اس نے تھیلا کھولا ۔ تھیلے میں سے وزیر آباد کے دو چاقو نکالے چاقوؤں کو کھول دیا ۔ وہ کافی لمبے چاقو تھے ۔ ایک چاقو صابو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ۔

" صابو ! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ۔ میں دو دن کی چھٹی لے کر رجمنٹ سے آیا ہوں ۔ ایک دن یہاں آتے ہوئے گزر گیا ہے ۔ دوسرا یہاں سے واپس جاتے ہوئے گزر جائے گا ۔ میرے پاس یہی دو چار گھنٹے ہیں ۔ اگر زندہ رہا تو صبح کی اذان والی گاڑی پکڑ کر واپس روانہ ہو جاؤں گا ۔"

صابو سمجھ گیا کہ اس کا دوست نورداد رات کے سناٹے میں دو چاقو لے کر گاؤں میں کیوں آیا ہے ۔ وہ میاں خان سے اس کی دشمنی کو اچھی طرح سے جانتا تھا ۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ گاؤں میں ایسی دشمنیوں کا فیصلہ دونوں گروپوں کے دس بارہ افراد کے قتل پر ہی ہوتا ہے ۔ نورداد نے لمبا چاقو صابو کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا ۔

" میاں خان کے گھر جاؤ ۔ وہ بیٹھک میں اکیلا سوتا ہے ۔ اسے جگا کر یہ چاقو دو اور کہو کہ نورداد تم سے بدلہ چکانے آگیا ہے ۔ اگر مرد ہو تو میدان میں آکر مجھ سے

مقابلہ کرو ۔ جو زندہ بچ گیا وہی ہماری زمین کا مالک ہو گا ۔ جاؤ ابھی جاؤ ۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ۔"

صابو خاموشی سے اپنے دوست نورداد کو تک رہا تھا ۔ نورداد نے کہا ۔

" تم میرا منہ کیا تک رہے ہو ؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم اپنے دشمن سے اسی طرح مقابلہ کرتے ہیں ؟"

صابو آہستہ سے بولا ۔

" نورداد ! مگر اب اس کا کوئی فائدہ نہیں ۔"

کیوں ؟ " نورداد نے غصے سے پوچھا ۔ "کیا میاں خاں مر گیا ہے ۔"

صابو نے کہا ۔

" وہ مرا نہیں وہ فوج میں بھرتی ہونے کے لئے لاہور چلا گیا ہے ۔ اسے لاہور گئے آج تیسرا دن ہے ۔"

نورداد کا چہرہ ایک دم اتر سا گیا ۔ وہ دشمن سے لڑنے کے لئے آیا تھا ۔ خود مرنے یا اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے آیا تھا مگر دشمن غائب تھا ۔ اب دشمن کا ایک چھوٹا بھائی اور بوڑھے ماں باپ ہی باقی تھے ۔ بھائی کم عمر تھا ۔ نورداد ان کو اپنے مقابلے کے لئے نہیں للکار سکتا تھا ۔ یہ مردانگی کی شان کے خلاف تھا کہ وہ دشمن کے کمسن بھائی اور بوڑھے ماں باپ کو موت کے گھاٹ اتار دے ۔ یہ ان کی روایات کے بھی خلاف تھا ۔ نورداد کے ہاتھ میں اپنا چاقو تھا ۔ اس نے جھنجلا کر کہا ۔

" تم جھوٹ بول رہے ہو صابو تم ۔ نہیں چاہتے کہ گاؤں میں قتل و خون ہو ۔"

صابو نے قسم کھا کر کہا ۔

" نور داد ! تم جانتے ہو کہ ایسے معاملے میں میں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا ۔ تم بے شک خود معلوم کر لو ۔ اب ۔ تم گاؤں میں آگئے ہو تو صبح تک یہاں ہی رہو گے ۔ صبح کو معلوم کر لینا ۔ تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ میاں خان بھرتی ہونے چلا گیا ہے ۔ گاؤں میں جنگ کی خبریں آتی رہتی ہیں کہ کافر دشمن نے کشمیر میں شکست کھانے کے بعد اعلان کر دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کی جنگ شروع کرے گا ۔ گاؤں کے کئی دوسرے جوان بھی اپنی فوج میں بھرتی ہونے جا چکے ہیں ۔ پھیکا اور اللہ داد بھی چلا

گیا ہے۔ اسی طرح میاں خان بھی چلا گیا۔ اس کے باپ نے خوش ہو کر اسے فوج میں بھیجا ہے۔"

جوان نورداد لیمپ کی دھندلی روشنی میں اپنے ہاتھ میں پکڑے چاقو کو دیکھ رہا تھا۔ صابو نے اپنے ہاتھ والا چاقو بند کرتے ہوئے کہا۔

"نورداد! ہمارے دشمن نے ہمارے ملک پر حملہ کر دیا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اپنی ساری آپس کی دشمنیاں کچھ وقت کے لئے بھلا دیں اور اپنے سانجھے دشمن کے دانت کھٹے کر دیں اور اسے ایسی شکست دیں کہ وہ باقی عمر اپنے زخموں کو چاٹتے ہوئے گزار دے۔ اپنا چاقو بھی بند کر لو۔"

نور داد کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ چہرے پر ملے جلے تاثرات تھے۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور بولا۔

"صابو! ٹھیک ہے۔ پہلے باہر سے آئے ہوئے دشمن کو تباہ کر لیں اس کے بعد میاں خان کو بھی سمجھ لوں گا۔"

یہ کہہ کر نور داد نے اپنا کھلا ہوا چاقو بھی بند کر دیا۔ پھر وہ چاقو بھی صابو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میرا اور میرے دشمن میاں خان کا چاقو بھی تم اپنے پاس رکھو۔ اگر میں جنگ میں شہید نہ ہوا اور میاں خان بھی زندہ رہا تو جنگ کے بعد واپس آ کر اسے دوبارا للکاروں گا۔ یہ دونوں چاقو تمہارے پاس میری امانت بن کر رہیں گے۔"

صابو نے دونوں چاقو لکڑی کے ایک صندوق میں بند کر دیئے اور بولا۔

"اب تم اپنے گھر جاؤ۔ گھر والے تمہیں دیکھ کر بڑے خوش ہوں گے۔"

نور داد نے اٹھتے ہوئے صابو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"صابو! اگر میرا دشمن گاؤں میں ہی ہوا تو میں جاؤں گا نہیں۔ اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے کل کی رات بھی رک جاؤں گا۔ مگر تیری میری دوستی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی یہ سمجھ لینا۔"

صابو نے کہا۔

"نورے! میری بات کا اعتبار کر۔"

نورداد اپنے دوست صابو کی کوٹھڑی سے نکل کر سیدھا اپنے گھر آ گیا۔ راستے میں اس نے اپنے دشمن میاں خان کے مکان کو ایک نظر دیکھا۔ بیٹھک میں اندھیرا تھا۔ نور داد کی آواز پر گھر کے سارے لوگ جاگ پڑے۔ بوڑھے ماں باپ نے بیٹے کو گلے سے لگا کر چوما۔ بھائی اور بہن کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ بوڑھا باپ سابق فوجی تھا۔ اس نے پوچھا۔

"چھٹی مل گئی تھی تمہیں نورے؟"

"ہاں ابا مل گئی تھی" نور داد نے بہن کے ہاتھ سے گرم دودھ کا گلاس تھامتے ہوئے کہا۔

"مگر تم نے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی" باپ نے پوچھا۔

"ابا جنگ شروع ہونے والی ہے۔ بلکہ اوپر اکھنور میں تو جنگ لڑی جا رہی ہے۔ بس خیال آیا کہ گھر والوں کو ایک نظر دیکھ آؤں۔"

سابق فوجی باپ نے کہا۔

"مگر پتر اس وقت تمہیں اپنی رجمنٹ میں ہونا چاہئے تھا۔ تمہیں چھٹی کیسے مل گئی؟"

نور داد بولا۔

"بس مل گئی ابا۔ چند گھنٹوں کے لئے تو آیا ہوں۔ اذان کے وقت چلا جاؤں گا۔ آج شام رجمنٹ میں حاضری دینی ہے۔"

ماں نے اس وقت بیٹے کے لئے آٹا گوندھ کر چار پراٹھے پکا دیئے۔ دو اسے اس کے اپنے سامنے بیٹھ کر کھلائے اور دو باندھ دیئے۔ "یہ ساتھ لے جانا پتر۔ دوپہر کو راستے میں کھا لینا ریل گاڑی کی چیزیں نہ کھانا۔"

نور داد نے باتوں ہی باتوں میں اپنے دشمنوں کی بات شروع کر دی اور پوچھا کہ میاں خان کے باپ نے جو زمین ہتھیا لی ہے اسکا کیا بنا؟" باپ نے بتایا کہ معاملہ عدالت میں ہے۔ ہم نے وکیل کرا لیا ہے۔ ہمیں زمین واپس مل جائے گی"۔ نور داد اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ بولا۔

"میں میاں خان سے بات کرنا چاہتا ہوں تاکہ بات خون خرابے تک نہ پہنچے"

وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میاں خان گاؤں میں ہی ہے یا باہر چلا گیا ہے ۔ اس کے باپ نے کہا ۔

"وہ تو بھرتی ہونے گاؤں کے دوسرے جوانوں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہوا ہے ۔ اسے آج تیسرا دن ہو رہا ہے ۔ تم فکر نہ کرو ۔ ہم نے بڑا اچھا وکیل کرایا ہے ۔ زمین ہم واپس لے لیں گے ۔"

نور داد چپ ہو گیا ۔ صابو کی اطلاع کی تصدیق ہو گئی تھی اب وہ صبر کرنے اور اس معاملے کو کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا ۔ گھر والوں سے باتیں کرتے کرتے اذان کا وقت قریب آیا تو نورداد جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ۔

"اچھا اللہ بیلی ۔ اذان کے وقت مجھے ٹرین پکڑنی ہے ۔"

ماں نے بیٹے کا ماتھا چومتے ہوئے کہا ۔

"پتر! آئے تھے تو ایک دن کی چھٹی تو لے کر آتے ۔"

نور داد بولا ۔

"ماں جی! بڑی مشکل سے اتنے وقت کی چھٹی ملی ہے ۔"

اس نے باپ کو گلے سے لگایا ۔ بھائی کو پیار کیا ۔ بہن کے سر پر ہاتھ پھیرا ۔ ماں نے دعا پڑھ کر پھونکی اور چٹھی لکھنے کی تاکید کی ۔ نور داد نے "اللہ کے حوالے" کہا اور گھر سے نکل کر صابو کی کوٹھڑی میں آ گیا ۔ صابو چارپائی پر ہی بیٹھا تھا ۔

"صابو! تو ٹھیک کہتا تھا ۔ اب پہلے کافر دشمن کو ٹھکانے لگالوں پھر میاں خان سے بھی نبڑاوں گا ' اللہ بیلی!"

صابو نے اٹھ کر اپنے دوست نور داد کو گلے لگایا ۔ بولا ۔

"نورے! مجھے گنٹھیے نے مار دیا ہے ورنہ اس وقت تم مجھے یہاں نہ دیکھتے ' میں بھی بھرتی ہونے لاہور پہنچ چکا ہوتا ۔"

نور داد نے صابو کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا ۔

"فکر نہیں صابو ۔ ہماری فوج خدا کے شیروں سے بھری ہوئی ہے ۔ دشمن کے لئے ہم کافی ہیں ۔ تمہیں بتا دیتا ہوں دشمن لاہور یا قصور کا فرنٹ کھولے گا ۔ ہم بھی

پوری طرح تیار ہیں ۔ دعا کرنا شہادت کا درجہ ملے ۔ اللہ بیلی ۔"

دونوں دوست گلے لگ کر ملے اور نور داد ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا ۔ وہ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا ۔ آسمان پر مشرق کی طرف پو پھٹنے والی تھی ۔ وہ کچھ پہاڑی اور کچھ ہموار راستوں پر سے ہوتا ہوا ریلوے اسٹیشن کے قریب پہنچ گیا ۔ عین اس وقت گاؤں کی مسجد کی طرف سے صبح کی اذان کی آواز آنے لگی ۔ سٹیشن کا پلیٹ فارم خالی تھا ۔ پھر دور سے ریل گاڑی کے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی ۔ نور داد پچھلے پہر کی خاموشی میں خالی خالی پلیٹ فارم کے بیچ پر اکیلا بیٹھا گہری سوچ میں تھا ۔ اسے اس بات کا بڑا قلق تھا کہ وہ اپنے دشمن سے دو دو ہاتھ نہیں کر سکا ۔ سٹیشن کے لیمپ روشن تھے ۔ ابھی بلیک آؤٹ شروع نہیں ہوا تھا ۔ لاہور کا محاذ عنقریب کھلنے والا تھا ۔ دشمن کی فوج کے کالم سرحد کے پار جمع ہو رہے تھے ۔ پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے دشمن نے پوری تیاریاں کر لی تھیں ۔ اب صرف ریڈ سگنل کا انتظار تھا ۔

ٹرین آ کر پلیٹ فارم پر رک گئی ۔ کوئی مسافر وہاں نہ اترا ۔ گارڈ نے سیٹی دی ۔ نور داد تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں جا کر بیٹھ گیا ۔ اکثر مسافر سو رہے تھے ۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانک کر باہر دیکھا ۔ اسے سبز پوش کہیں نظر نہ آیا ۔ نور داد نے آنکھیں بند کر کے سر کھڑکی کے ساتھ لگا دیا ۔ اس پر نیند طاری ہونا شروع ہو گئی ۔ گاڑی نے وسل دی اور چل پڑی ۔

نور داد شام تک اپنی رجمنٹ میں واپس پہنچ گیا اور جاتے ہی رپورٹ کر دی ۔ اسے بارکوں میں غیر معمولی صورت حال کا احساس ہوا ۔ جوانوں میں بڑا جوش و خروش تھا ۔ اس کی پلٹن کے جوان بوریا بستر باندھے تیار بیٹھے تھے ۔ نور داد نے اپنے ساتھی حوالدار سے پوچھا ۔

"کیوں جوان پلٹن کشمیر جا رہی ہے کیا؟"

حوالدار نے تیز تمباکو والے سگریٹ کا کش لگا کر کہا ۔

"گرائیں! دشمن سے سن سنتالیس کا بدلہ لینے کا وقت آ گیا ہے ۔"

اور پھر اسی رات دشمن نے پاکستان پر حملہ کر دیا ۔ حملے کا پہلا نشانہ لاہور تھا ۔ دشمن نے رات کے اندھیرے میں حملہ کیا تھا ۔ نور داد کی بارک میں یہ خبر اندھیرے منہ

پہنچی ۔ ہر طرف ایک جوش کا عالم پیدا ہوگیا تھا ۔ لاہور پر دشمن کے حملے کی خبر نے
جوانوں کے سینوں میں بجلیاں بھر دی تھیں ۔ ہر کوئی محاذ پر جاکر دشمن کو نیست و نابود
کرنے کے لئے بے تاب تھا ۔ نور داد کا بھی یہی حال تھا ۔ صوبیدار اس کے قریب
سے گزرا تو نور داد نے پرجوش لہجے میں کہا ۔

" صوبیدار صاحب ! ہمیں محاذ پر کیوں نہیں بھیجا جارہا ؟ ہم یہاں راشن کھانے
کے لئے نہیں آئے ہوئے ۔"

صوبیدار نے کرخت آواز میں کہا ۔

" زبان بند رکھو ۔ تم پلٹن کے جوان ہو ۔ آرڈر ملے گا تو جاؤ گے ۔"

تھوڑی دیر بعد ہی یہ اطلاع بھی بارکوں میں پہنچ گئی کہ لاہور کے محاذ پر پاک فوج
کے جیالوں نے اپنے سے دس گنا بڑی طاقت والے دشمن کو پسپا کر دیا ہے اور کئی
جگہوں پر جنگ اب دشمن کے علاقے کے اندر لڑی جارہی ہے ۔ بارکیں اللہ اکبر کے
فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھیں ۔ یہ ضابطے کے خلاف بات تھی مگر جوانوں کے
دلوں میں اسلام اور پاکستان پر جان نچھاور کر دینے کا جو جذبہ موجزن تھا اسے روکا بھی
نہیں جا سکتا تھا ۔

چھ ستمبر کی رات کو پچھلے پہر دشمن نے لاہور پر حملہ کیا تھا ۔ جہاں چند گھنٹوں کے
بعد میدان کارزار دشمن کے جلے ہوئے ٹینکوں اور دشمن کی لاشوں سے بھر گیا اور
لاشوں اور زخمی فوجیوں کے بھرے ہوئے ٹرکوں کا امرتسر کی طرف تانتا بندھ گیا ۔
دشمن لاہور پر قبضہ کرنے کے ناپاک عزائم لے کر آیا تھا اور اب اسے اپنی جان کے
لالے پڑ گئے تھے ۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے ۔ لاہور
کے محاذ پر عبرت ناک ہزیمت اٹھانے کے بعد اس نے بوکھلا کر ۸ ستمبر کو سیالکوٹ پر
حملہ کر دیا ۔ نورداد کی پلاٹون کو راتوں رات گاڑیاں اٹھا کر سیالکوٹ کے محاذ پر لے
گئیں ۔ جوانوں کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں ۔ رگیں تنی ہوئی تھیں ۔ بارکوں میں
وہ ایک دوسرے کو ہر قسم کا مذاق کر لیا کرتے تھے مگر اس وقت وہ سارے مذاق بھول
گئے تھے ۔ ان میں سے بیشتر ایسے جوان تھے جنہوں نے اپنے بڑے بوڑھوں سے سن
سینتالیس کے خونیں واقعات سن رکھے تھے کہ کس طرح ہندو سکھوں نے پاکستان کی

طرف آتے نہتے مسلمانوں کے قافلوں پر لرزہ خیز مظالم ڈھائے تھے ۔ آج ان مظالم کا
حساب چکانے کا وقت آگیا تھا ۔ سینوں میں جذبہ ء حریت موجزن تھا ۔ آنکھوں میں
بجلیاں کوند رہی تھیں جو دشمن پر قہر بن کر ٹوٹنے کے لئے بے تاب تھیں ۔ رات کے
اندھیرے میں مورچے کھودے گئے اور جوان مورچوں میں بیٹھ گئے ۔ توپوں کی گولہ
باری کے دھماکے دور سے سنائی دے رہے تھے ۔ نور داد بھی مورچے میں تھا ۔ اپنی
رائفل کے ٹریگر پر انگلی جمائے ہوئے تھا ۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں عقاب کی
آنکھوں کی طرح دشمن کو تلاش کر رہی تھیں ۔ بائیں جانب کھیتوں سے دور درختوں
کے سیاہ دھبوں کے پیچھے بجلیاں سی چمک رہی تھیں ۔ دھماکوں کی ہلکی ہلکی آوازیں
آرہی تھیں ۔ بمبار اور فائیٹر طیاروں کے زناٹے سنائی دے رہے تھے ۔ جنگ بہت
قریب لڑی جارہی تھی ۔ مورچے میں اس کے ساتھ اسکی پلٹن کا ایک نائیک بھی سر باہر
نکالے آسمان پر چمکتی گولہ باری کی بجلیوں کو تک رہا تھا ۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا ۔ لگتا
تھا کہ وہ بھی دوسرے جوانوں کی طرح قیامت خیز طوفان کو اپنے سینے میں دبائے ہوئے
ہے ۔ اس نے کسی قدر غصیلے لہجے میں نور داد سے پوچھا ۔

" کافر ادھر کیوں نہیں آتا گرائیں ؟"

نور داد نے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے ۔ اس نے آہستہ سے ڈانٹ کر کہا ۔

" چپ رہ ۔"

دوسرے مورچوں میں بھی پاک فوج کے جوانوں کے ہونٹوں پر یہی بے چین
سوال تھا ۔ دشمن ادھر کب آئے گا ؟ ہمارے بائیں طرف بجلیاں کڑک رہی ہیں ۔
ہمارے بھائی توپوں اور ٹینکوں کے گولوں کے دھماکوں میں لڑ رہے ہیں ۔ ہمیں
مورچوں میں کیوں قید کر دیا ہے ؟ ہمیں بھی اس آگ اگلتے محاذ پر بھیجو ۔ ہم بھی اسلام
کے لئے پاکستان کے لئے لڑنا چاہتے ہیں ۔ ہم یہاں مورچوں میں بیٹھنے اور دشمن کا
انتظار کرنے نہیں آئے ۔۔ یہ سوال پاک فوج کے جوانوں کے جذبوں کے سوال تھے ۔
مگر جنگ ایک ضابطے کے تحت لڑی جاتی ہے ۔ یونہی فوج کے جوانوں کو جنگ کی آگ
میں نہیں جھونک دیا جاتا ۔ نورداد کی پلاٹون کو بھی ایک خاص سٹریجی ' ایک خاص پلان
کے تحت وہاں لایا گیا تھا ۔ دشمن بھی ایک خاصی پلان ایک خاص سٹریجی کے مطابق

حملہ آور ہوا تھا۔ اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ پاکستان کی فوجی نفری کم ہے اس لئے تھوڑی فوج اور تھوڑے سازوسامان سے حملہ کیا جائے۔ نہیں ۔۔ اس نے پوری فوجی طاقت اور بھرپور جنگی سازوسامان کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ اس نے اپنی انفنٹری اور ٹینکوں کی بھرپور قوت میدان میں جھونک دی تھی۔ اور پھر ساری دنیا یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ لاکھوں کی نفری میں ہزاروں ٹینکوں کے ساتھ حملہ کرنے والے دشمن کی فوج صرف دس میل کا فاصلہ کیوں نہ طے کر سکی۔ نہ صرف یہ بلکہ قصور سیکٹر میں اپنا ایک بہت بڑا تاریخی قصبہ کھیم کرن بھی اپنے ہاتھ سے گنوا بیٹھی اور اگر تاشقند میں شاستری شور مچا کر جنگ بندی کرانے میں کامیاب نہ ہو جاتا تو پاک فوج کے ٹینک امرتسر پہنچ گئے ہوتے۔ پاک فوج کے مجاہدوں نے اپنے جذبے اور اپنے خون سے بہادری اور شجاعت کی ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔ جنگ کے تمام کلیوں تمام نصابوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔ ایک طرف سو فوجی ہوں اور دوسری طرف تین فوجی ہوں تو سو فوجی فتح حاصل کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ جنگی نصاب کا ایک عام سا کلیہ قاعدہ ہے۔ مگر جنگ ستمبر میں پاک آرمی کے جوانوں اور افسروں نے ایک نیا کلیہ قاعدہ مرتب کیا تھا۔ اس جنگ میں ایک ایک جوان نے چار چار انڈین ٹینکوں کے پرخچے اڑا دیئے تھے اور ایک ایک اکیلے جوان نے پورے پورے بریگیڈ کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ ستمبر کی جنگ میں پہلی بار دنیا پر اقبال کے اس شعر کا مفہوم واضح ہوا تھا کہ۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

یورپ کے جنگی ماہرین کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔ یورپ کے اخباروں کے نامہ نگار اور وقائع نگار جنگ بندی کے بعد مورچوں میں چاق و چوبند بیٹھے پاک فوج کے سپاہیوں کو چشم حیرت سے دیکھنے آتے تھے اور حیران ہوتے تھے کہ کیا یہ وہی جوان ہیں جنہوں نے پرانی وضع کے ہتھیاروں سے دشمن کی جدید آلات جنگ سے لیس اپنے سے دس گنا بڑی فوج کو خاک و خون میں غرق کر دیا۔ لاہور کے محاذ پر اپنے مورچے میں کھڑے ضلع چکوال کے ایک جوان سے جرمنی کے ایک اخبار نویس نے

مترجم کی وساطت سے کہا۔

"جنگوں میں ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کسی فوجی حکمت عملی یا جنگی مصلحت کے تحت فوج کی کوئی کمپنی مورچے چھوڑ کر پیچھے بھی ہٹ جاتی ہے۔ خود ہمارے ملک جرمنی کی فوجیں دوسری جنگ عظیم میں یورپ کے کئی محاذوں پر سے خود ہی پیچھے ہٹ گئی تھیں مگر تم لوگوں نے اپنے مورچے نہیں چھوڑے۔ تم بیس بیس گھنٹے کچھ کھائے پیئے بغیر اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے اور تمہاری مشین گنیں آگ اگلتی رہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ تم تھوڑا پیچھے بھی ہٹ سکتے تھے۔"

ضلع چکوال کے اس لانس نائیک نے مترجم سے یہ بات سنی اور اپنی سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر کہا۔

"اسے کہو ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ پیچھے لاہور تھا' پیچھے پاکستان تھا' پیچھے ہمارا دین ایمان تھا۔"

اور جرمن کا اخبار نویس اپنے مترجم سے چکوال کے لانس نائیک کا جواب سن کر اس کا منہ تکتا رہ گیا تھا۔ ہمارے جوان پیچھے ہٹنے کے لئے آگے نہیں بڑھے تھے۔ وہ دشمن کا سر کچلنے اور اس کا غرور خاک میں ملانے کے لئے لوہے اور آگ کے پہاڑوں سے ٹکرا گئے تھے۔ کوئی بھی واپس جانے کے لئے جنگ کے میدان میں نہیں کودا تھا۔ وہ ماؤں سے دودھ بخشوا کر آئے تھے اور نبی پاکؐ کے کلمے کا ورد کرتے ہوئے اسلام' پاکستان اور قرآن کی حرمت کو بچانے کے لئے کافروں کے ٹینکوں کے ٹکڑے اڑانے اور خود شہید ہونے جا رہے تھے۔

یہ سبز پوش کی آواز تھی جو خاموش مگر بجلی کی طرح تڑپتی لہروں کی طرح میری رگ و پے میں سرائت کر رہی تھی۔ ضلع گوجر خان کا سپاہی نور داد اپنے ساتھی کے ہمراہ مورچے میں تھا۔ بائیں طرف کسی محاذ پر گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ توپوں اور ٹینکوں کے گولوں کے دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ آسمان پر بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔ میں سپاہی نور داد کے مورچے کے پاس کھڑا تھا۔ سبز پوش بھی میرے قریب ہی تھا مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی مگر سبز پوش کے خیالات کا مفہوم میرے ذہن میں اترتا چلا جا رہا تھا۔

"۔۔۔۔۔ شجاعت کے بے مثال واقعات اکثر محاذوں پر
برستے گولوں کی آگ اور دھماکوں میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو
گئے۔ اس لئے کہ ان کے سنانے والے شہید ہو گئے تھے اور
جنہوں نے ان معرکوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ بھی دشمن
کو خاک و خون میں مٹانے کے بعد شہید ہو گئے تھے۔ لاہور اور
قصور کے محاذوں پر پاک فوج کے جوانوں اور افسروں نے کیسے
کیسے معرکے سرانجام دیئے' یہ ایک الگ محاذ کی داستان ہے۔
ابھی تم سیالکوٹ کے سیکٹر میں ہو اور پاک آرمی کی ایک پلاٹون
کے سپاہی نورداد کے پاس کھڑے ہو اور دشمن کا حملہ آرہا ہے
سیالکوٹ کے سیکٹر میں دشمن نے جتنے ٹینک جھونک دیئے ہیں
اتنے ٹینک لے کر جرمن جرنیل رومیل بھی شمالی افریقہ میں
نہیں آیا تھا۔"

میں نے مورچوں کی طرف ایک انسانی سائے کو جھک کر
بڑھتے دیکھا یہ پاک فوج کا ایک افسر تھا۔ وہ ایک ایک مورچے
پر جاکر اونچی آواز سے آواز دیتا۔ "ٹھیک ہو جوانو" اور ہر مورچے
سے یہی آواز آتی۔ "اللہ مالک ۔۔ دشمن کہاں ہے؟"
اس کے ساتھ ہی مورچوں کے ارد گرد گولے پھٹنے لگے۔ دشمن کی توپوں نے گولہ
باری شروع کر دی تھی۔ مٹی اڑ رہی تھی۔ زمین ہل رہی تھی۔ گولے مورچوں کے
آگے پیچھے بائیں دائیں پھٹ رہے تھے۔ دھماکوں سے مورچے لرز رہے تھے۔ گولوں
کے دہکتے ہوئے سرخ ٹکڑے زناٹوں کے ساتھ اڑ رہے تھے۔ بارود کے دھوئیں اور
گرد و غبار نے رات کی تاریکی کو مزید تاریک کر دیا تھا۔ گولے مسلسل فائر ہو رہے
تھے۔ یہ آگ' پتھر' لوہے اور موت کا رقص تھا۔ مگر مورچوں میں موجود پاک فوج
کے شیروں کے دہکتے ہوئے چہرے دیکھ کر موت کو ان کے قریب آنے کا حوصلہ نہیں
ہو رہا تھا۔ گولہ باری رک گئی۔ کسی مورچے کی طرف سے سیکشن کمانڈر کی آواز
آئی۔ "حملہ آرہا ہے جوانو!" اور اس کے ساتھ ہی سامنے کی جانب سے گڑگڑاہٹوں

کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ تھی۔ دشمن کے ٹینک آگے بڑھ رہے
تھے۔ ٹینکوں نے گولے فائر کرنے شروع کئے۔ دشمن کا خیال تھا کہ اس کے توپ
خانے کی گولہ باری نے پاک فوج کے مورچوں کو بھسم کر دیا ہو گا۔ رک رک کر فائر
کرتے ان کے ٹینک تیزی سے بڑھے چلے آرہے تھے۔ مگر پاک فوج کے جوان دشمن
کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ دو ہوائی جہاز زناٹے سے غوطے لگا کر نکل گئے۔
انکے بم دشمن کے اگلے ٹینکوں پر گرے اور انہیں آگ لگ گئی۔ یہ پاک ایئرفورس
کے طیارے تھے۔ پھر ہر طرف گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ پاک فوج کے جوان
دشمن کے ٹینکوں پر راکٹ لانچروں سے فائر کرنے لگے۔ جہاں سے راکٹ فائر ہوتا
دشمن کا ٹینک اس جگہ کو رینج میں لے کر فائر کرتا۔ ٹینک پاک مورچوں کے اوپر سے
گزر گئے۔ جوان مورچوں سے نکل کر ٹینکوں پر راکٹ لانچر فائر کرتے۔ پھر پاک فوج
کے ٹینک بھی دھاڑتے ہوئے آگئے اور دشمن کے ٹینکوں سے ٹکرا گئے۔ ٹینک ٹینکوں
سے لڑ رہے تھے۔ ہر طرف دھماکے' آگ' گرد و غبار اور اللہ اکبر کے نعروں کی گونج
تھی۔ افسر اور جوان شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ کمپنی کی آر آر گنیں فائر کر رہی تھیں۔
جو ٹینک ہٹ ہوتا وہ ایک دھماکے سے پھٹ جاتا اور دشمن کے سپاہی اس کے اندر ہی
بھسم ہو جاتے۔ اپنے جوان بھی شہید ہو رہے تھے۔
ٹینکوں کی اس جنگ میں اپنی انفنٹری بھی شجاعت کے حیرت انگیز معرکے لڑ رہی
تھی۔ افسر اور جوان ایک ہو گئے تھے۔ چہرے گرد و غبار میں اٹ گئے تھے۔ کوئی
نہیں پہچانا جاتا تھا۔ صرف اللہ اکبر اور یا علی کے نعروں کی آوازیں ہی ایک پہچان باقی
رہ گئی تھی۔ یہی وہ ازلی اور ابدی شناخت تھی جو ایک مومن کو کافر سے الگ کرتی
تھی۔ دشمن پاک فوج کے مورچوں کو روندتا ہوا آگے سیالکوٹ پسرور سڑک پر نکل کر
اس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ سیالکوٹ تک اس کا راستہ صاف ہو جائے۔ مگر وہ نہیں
جانتا تھا کہ اس کا پالا کس قوم سے پڑ گیا ہے اور اس نے کس جیالی قوم پر حملہ کرنے
کی غلطی کی ہے۔ پاک فوج کا ہر جوان دشمن کی راہ میں پہاڑ بن گیا تھا۔ مگر دشمن
کے پاس بے پناہ جنگی ساز و سامان تھا۔ اس کے ٹینک پھٹ رہے تھے اور وہ نئے ٹینک
جھونکتا چلا جا رہا تھا۔ دشمن اپنی طاقت کے نشے میں تھا مگر پاک فوج کے صف شکن

مجاہدوں نے بہت جلد دشمن کا نشہ اتار دیا اور دشمن کو بہت جلد اس حقیقت کا احساس ہوگیا کہ وہ فولادی چٹانوں کے ساتھ سر ٹکرا رہے ہیں۔ دشمن لہولہان ہوگیا تھا۔ میدان اس کی لاشوں سے پٹ گیا تھا مگر اس کی تازہ دم کمپنیاں بھی آگے بڑھتی آرہی تھیں۔ توپیں آگ اگل رہی تھیں۔ ٹینک گرج رہے تھے۔ طیارے بم برسا رہے تھے۔ ہر طرف دھماکے، آگ، گرد و غبار اور لوہے کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں کی چیخیں تھیں۔ اپنے جوان مورچوں سے نکل آئے تھے۔ وہ اب خود ہی کمانڈر اور خود ہی سپاہی تھے۔ سامنے سے دشمن کا ٹینک آتا تو وہ اس پر راکٹ لانچر سے فائر کرتے۔ لانچر سے راکٹ فائر ہوتا تو اسکے ساتھ ہی ٹینک کی مشین گن کا برسٹ آتا۔ راکٹ دشمن کے ٹینک میں گھس کر اسے پھاڑ ڈالتا اور ٹینک کی گن کا برسٹ جوان کو شہید کر دیتا۔ نور داد کے پاس لائٹ مشین گن تھی۔ یہاں لائٹ مشین گن کا کام نہیں تھا۔ وہ دشمن کے ٹینکوں کے پیچھے نکل آیا تھا۔ بموں کے شعلوں میں وہ دشمن کے ٹینکوں کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ اکھڑی ہوئی روندی ہوئی زمین پر رینگتا ہوا ایک ٹینک کے نزدیک ہوگیا۔ گرنیڈ اس کے ہاتھ میں تھا۔ رات کے اندھیرے میں دشمن کا ٹینک اس کے قریب سے گڑگڑاتا ہوا گزرا تو نورداد نے ہینڈ گرنیڈ کا پن کھینچا اور گرنیڈ ٹینک کے پٹے پر رکھ دیا۔ گرنیڈ رکھتے ہی اس نے ایک اکھڑے ہوئے مورچے کے گڑھے میں اپنے آپ کو لڑھکا دیا۔ گرنیڈ کا دھماکہ ہوا اور ٹینک وہیں رک گیا۔ ٹینک ایک طرف کو جھک کر گھوم گیا۔ ایک دوسرا ٹینک اس مورچے کے اوپر سے نکل گیا جس کے گڑھے میں نور داد چھپا ہوا تھا۔ اس پر مٹی گری۔ ٹینک کے نکلتے ہی نور داد گڑھے سے نکلا اور پھٹتے گولوں اور قیامت خیز فائرنگ کی چیخوں میں رینگتا ہوا دشمن کے دوسرے ٹینک کی طرف بڑھا۔ مگر وہ ٹینک دوسری طرف کو نکل گیا۔ اچانک ایک گولہ اس پر آکر لگا اور وہ دھماکے سے پھٹ گیا۔ یہ یقیناً اپنی توپ کا گولہ تھا۔ چاروں طرف سے قیامت کی فائرنگ ہورہی تھی۔ کوئی پتہ نہیں چلتا تھا کہ اپنی فائرنگ کونسی ہے۔ اچانک روشنی کے دو راؤنڈ یکے بعد دیگرے فائر ہوئے۔ یہ ایسے روشنی راؤنڈ تھے جن کے ساتھ پیراشوٹ بندھے ہوئے تھے۔ سارا محاذ روشن ہوگیا۔ ان کی روشنی میں نور داد کو دائیں جانب درختوں کے نیچے دو ٹینک نظر پڑے۔ ادھر سے جے ہند کے نعروں کی

آوازیں آئیں اور پھر دشمن کی انفنٹری کی پلاٹون کے سپاہی سمندر کی موجوں کی طرح آگے بڑھے۔ نور داد ان پر سٹین گن سے فائرنگ کرنے لگا۔ گن کے برسٹ پڑے اور دشمن کی پلٹن کے کچھ سپاہی ڈھیر ہو گئے۔ روشنی راونڈ بجھ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مارٹر گنوں کے گولوں کے دھماکے ہونے لگے۔ نور داد کی انگلیاں فائرنگ کرتے کرتے سوج گئی تھیں مگر وہ اس طرف اندھیرے میں بھی فائر کرتا رہا جدھر اس نے دشمن کی پلٹن کے فوجی دیکھے تھے۔ ٹینک کا ایک گولہ نور داد کے قریب آکر پھٹا۔ نور داد نے سر نیچے کرلیا۔ اس پر مٹی کا ڈھیر آن گرا۔ وہ مٹی کے ڈھیر میں سے نکل کر رینگتا ہوا دشمن کے ٹینکوں کی طرف بڑھا۔ اس کے پاس اب کوئی گرنیڈ نہیں تھا۔ اندھیرے میں ٹینک سانڈوں کی طرح بھاگ دوڑ کر فائرنگ کر رہے تھے۔ کسی طرف سے اللہ اکبر کے نعرے سنائی دیئے۔ ادھر دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔ اچانک دشمن کا ایک ٹینک بائیں طرف سے نکل کر سامنے آگیا۔ نور داد کے پاس صرف لائٹ مشین گن ہی تھی۔ مشین گن سے وہ ٹینک کو تباہ نہیں کر سکتا تھا۔

ٹینک نے شاید اسے دیکھ لیا تھا۔ نور داد ایک طرف کو لڑھک گیا۔ ٹینک کا فاصلہ صرف پچاس ساٹھ قدم رہ گیا تھا کہ نور داد کو پیچھے سے آواز آئی۔

"گرائیں فکر نہیں۔"

اور پھر گرد مٹی میں اٹا ہوا ایک جوان اندھیرے میں سے نکل کر آگے آیا۔ اس کے ہاتھ میں راکٹ لانچر تھا۔ وہ بیٹھ گیا۔ راکٹ لانچر کاندھے پر رکھا۔ ٹینک کا فاصلہ کم ہو گیا تھا۔ وہ بڑھتا چلا آرہا تھا۔ اس کی مشین گن فائرنگ کر رہی تھی۔ گولیاں نور داد کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ جوان نے یا علی کا نعرہ لگایا اور راکٹ فائر کر دیا۔ راکٹ سیدھا ٹینک کو جا کر لگا اور ٹینک پھٹ کر آگ کے شعلوں میں تبدیل ہوگیا۔

نور داد نے اندھیرے میں جوان کو دیکھا۔ اس نے دوسرا راکٹ بھی فائر کر دیا جو دشمن کے دوسرے ٹینک کو لگا۔ دوسرا ٹینک بھی جلنے لگا۔ تیسرے ٹینک نے اپنا رخ باجرے کے کھیتوں کی طرف کر لیا۔ راکٹ فائر کرنے والا جوان رینگتا ہوا نور داد کے قریب آگیا۔ فضا گولوں کے دھماکوں، سٹین گنوں اور مشین گنوں کی فائرنگ سے گونج

رہی تھی۔ جوان نے نور داد سے کہا۔

" فکر نہیں جوان ۔ آگے دشمن کے چار ٹینک ہیں ۔ ادھر چلو۔"

اندھیرے میں نور داد کو اس جوان کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ویسے بھی بارود اور گرد و غبار میں شکلیں پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ مگر جوان کی آواز پر وہ ضرور چونکا تھا اس آواز کو وہ سینکڑوں آوازوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ اپنی فوج کا ہی جوان تھا۔ مگر جس طریقے سے اس نے راکٹ فائر کیا تھا اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ نیا نیا رنگروٹ ہے اور اسے معمولی سی ٹریننگ کے بعد محاذ پر بھیج دیا گیا ہے سن پینسٹھ کی جنگ میں ایسا ہی ہوا تھا کیونکہ دشمن کی نفری تین چار گنا زیادہ تھی اور پاکستان کے جوان اپنے وطن کے تحفظ کے لئے فوج میں بھرتی ہونے موج در موج آگے بڑھ رہے تھے۔ چنانچہ انہیں ضروری ٹریننگ کے بعد رجمنٹوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اگرچہ زیادہ تعداد میں ہر محاذ پر اپنی پیشہ ور ٹرینڈ فوج ہی لڑ رہی تھی مگر عوام کے جذبے کو ٹالا نہیں جا سکتا تھا جو اپنی فوج کے شانہ بشانہ دشمن سے لڑنا اور اسے نیست و نابود کرنے کے لئے بے تاب تھی۔

نور داد اپنی فوج کے اس جوان کے پیچھے پیچھے تیزی سے رینگتا ہوا جا رہا تھا جو اسے نیا رنگروٹ لگا تھا۔ یہ اس کی پلٹن کا جوان نہیں تھا۔ وہ اپنی پلٹن کے سارے جوانوں کی آوازیں پہچانتا تھا۔ میدان جنگ میں ایسا ماحول بن گیا تھا کہ سب پلٹنیں آپس میں گڈ مڈ ہو گئی تھیں۔ آگے ایک کھیت آگیا۔ کھیت کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے وہاں سے ہزاروں سانڈ دوڑتے ہوئے گزر گئے ہوں۔ جوان اٹھا اور اندھیرے اور گرد و غبار میں ایک طرف کو جھکا جھکا دوڑتا ہوا چلا گیا۔ وہ نور داد کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ نور داد بھی آگے بڑھتا گیا۔ اس نے گمنام جوان کی جانی پہچانی آواز میں سن لیا تھا کہ سامنے درختوں کے جھنڈ میں دشمن کے چار ٹینک ہیں۔ وہ اسی طرف گیا تھا۔ شاید اس نے ان ٹینکوں کو پہلے سے دیکھ لیا تھا۔ نور داد کے دماغ میں ابھی تک اس گمنام جوان کی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے آواز کو کچھ پہچان بھی لیا تھا مگر ابھی تک اس کے دل میں شک تھا۔ کیا معلوم یہ وہ نہ ہو۔

گولوں کے دھماکے اور ٹینکوں کی فائرنگ نور داد کے پیچھے رہ گئی تھی۔ پیچھے گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی جدھر سے اللہ اکبر اور یا علی کے نعروں کی آواز بھی گولوں کے دھماکوں میں سنائی دے رہی تھی۔ نور داد نے گمنام جوان کو اپنے ذہن سے نکال دیا تھا۔ اب وہ بھی دشمن کے ان ٹینکوں کو کسی نہ کسی طرح تباہ کرنا چاہتا تھا جو بقول گمنام جوان کے درختوں کے جھنڈ میں کھڑے تھے۔ نور داد جھک کر چل رہا تھا۔ وہ کھیت سے باہر نکل گیا۔ مشین گن کے برسٹ کی آواز قریب سے آتی تو وہ جلدی سے لیٹ جاتا۔ وہ کھیت کی مینڈھ کے پہلو سے رینگتا ہوا کچھ دور گیا تو اسے درختوں کا سیاہ جھنڈ دکھائی دیا۔ اچانک درختوں میں سے دو ٹینک آگے پیچھے نکلے اور گولے فائر کرتے ایک طرف کو چلے۔ نور داد کا خیال تھا کہ گمنام جوان ضرور ان میں سے کسی پر راکٹ فائر کرے گا کیونکہ اس کے پاس راکٹ لانچر موجود تھا۔ مگر کوئی راکٹ فائر نہ ہوا۔ نور داد سمجھا کہ جوان شاید شہید ہو گیا ہے۔ اس کے حساب سے درختوں میں چار میں سے دو ٹینک ابھی موجود ہونے چاہئیں تھے۔ نور داد نے سوچا کہ اسے پیچھے کی طرف سے جانا چاہئے۔ وہ کسی طرح ان ٹینکوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ انہیں تباہ نہیں کر سکتا تھا۔ کہنیوں کے بل تیزی سے رینگتا وہ کھیت کی مینڈھ پر سے گزر گیا اور درختوں کے پیچھے آگیا۔ یہاں ایک جانب سیم نالے کی ڈھال تھی۔ درختوں کے نیچے اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ رینگتا ہوا درختوں کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ عین اس وقت آسمان پر ایک روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ اس کی روشنی میں نور داد کو درختوں کے نیچے دو ٹینک کھڑے نظر آگئے۔ اس نے جلدی سے اپنا سر نیچے کر لیا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا کہ اسے کیا ترکیب کرنی چاہئے۔ ظاہر ہے ٹینکوں کریو ٹینکوں کے اندر ہی ہو گا۔ چند قدم رینگنے کے بعد وہ دونوں ٹینکوں کے اتنی قریب آگیا کہ اگر اس کے پاس ہینڈ گرنیڈ ہوتے تو وہ اندھیرے میں رینگتا ہوا گرنیڈ ٹینکوں کے پٹوں پر رکھ کر واپس بھی آسکتا تھا۔ گرنیڈ سے ٹینک کا صرف اتنا ہی نقصان ہوتا کہ وہ بیکار ہو جاتا ہے اور چل نہیں سکتا۔ اگر ٹینک کا کپولا کھلا ہو تو اس کے اندر گرنیڈ پھینک کر اسے تباہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اسی طرح سے ٹینک کے اندر رکھا ہوا اسلحہ بھی پھٹ جاتا ہے۔ مگر نور داد کے پاس گرنیڈ نہیں تھا۔

اگر کوئی آر آر جیپ وہاں قریب ہوتی تو وہ راکٹ لانچر سے دونوں ٹینک تباہ کر سکتا تھا۔

نور داد ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ٹینک سٹارٹ ہوئے اور تھوڑی ہی دور آگے چل کر رکے۔ ان کے ٹرٹ ایک طرف گھومے اور پھر گولے چلانے لگے۔ ظاہر ہے وہ پاک فوج کے مورچوں یا انفنٹری اور ٹینکوں پر گولے پھینک رہے تھے۔ نور داد دائیں جانب اپنے مورچوں کی طرف جانے ہی لگا تھا کہ ایک جوان کھسکتا ہوا اس کے قریب آکر بولا۔

"جوان پیچھے ہٹ جا۔"

یہ وہی گمنام سپاہی تھا جس کی آواز اب نور داد نے صاف پہچان لی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ زخمی تھی جس پر فیلڈ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں راکٹ لانچر تھا جسے وہ اپنے کاندھے پر رکھے رینگتا ہوا وہاں تک آیا تھا۔ نزدیک ہی توپ کا ایک گولا پھٹا اور اسکی ہلکی سی چمک میں نورداد نے اس گمنام جوان کو پہچان لیا۔ وہ پاک فوج کا گمنام جوان نہیں تھا بلکہ اس کا دشمن میاں خان تھا جس کو قتل کرنے وہ اس رات گاؤں گیا تھا۔ وہ اس وقت نور داد سے دو قدم دائیں جانب پر کھیت کی ادھڑی ہوئی مٹی میں لیٹا لانچر میں راکٹ ڈال رہا تھا۔ نور داد نے اپنی لائٹ مشین گن کا رخ اپنے دشمن میاں خان کی طرف کردیا۔ صرف ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھانے کی ضرورت تھی اور نور داد کے دشمن میاں خان کی لاش وہاں خون میں لت پت پڑی ہوتی۔ میاں خان نے ان کی زمین ہتھیا لی تھی۔ وہ اس کا دشمن تھا اور دشمن کو قتل کرنے کا اس سے اچھا موقع نور داد کو کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میاں خان کو نور داد نے ہلاک کیا ہے۔ وہاں تو ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں، لاشیں پڑی تھیں۔ نور داد ٹریگر دبانے ہی والا تھا کہ میاں خان کھسکتا ہوا پیچھے آگیا۔ اس نے نور داد کی طرف اندھیرے میں دیکھ کر کہا۔ "گرائیں میں نیا رنگروٹ ہوں۔ راکٹ ٹینک پر کس طرف سے ۔۔۔" پھر وہ رک گیا۔ اس نے بھی نور داد کو پہچان لیا تھا۔ وہ خوش ہو کر بولا۔

"نورداد! یہ تم ہو گرائیں؟"

اتنے میں دشمن کا ٹینک گھوم گیا۔ اس کی مشین گن نے ایک برسٹ فائر کیا جوان کے سروں کے اوپر سے نکل گیا۔ اس وقت نورداد کو احساس ہوا کہ اس کا اصل دشمن میاں خان نہیں بلکہ وہ ٹینک ہے جو اس کے وطن کی پاک سرزمین پر قبضہ کرنے کا ناپاک ارادہ لے کر گھس آیا ہے۔ اس نے اپنی لائٹ مشین گن نیچے رکھ دی اور میاں خان سے راکٹ لانچر لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میاں خاں! تم گولہ ضائع کردو گے۔"

میاں خان نے بڑی سختی سے نور داد کا ہاتھ پیچھے کردیا۔

"نہیں نور داد! گولہ ضائع نہیں ہو گا۔"

اور دیکھتے دیکھتے اس نے گھٹنوں کے بل ہو کر راکٹ فائر کر دیا۔ راکٹ ٹینک کے پہلو میں جا کر لگا اور ٹینک میں آگ لگ گئی۔ میاں خان دوسرے ٹینک کو ہٹ کرنے کے لئے لانچر میں راکٹ ڈالنے لگا تو دوسرے ٹینک کی مشین گن نے فائرنگ شروع کر دی۔ نور داد نے میاں خان کے اوپر گر کر اسے نیچے لٹا لیا اور اسے کھینچتا ہوا چند قدم پیچھے لے آیا۔ میاں خان کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ مشین گن کی گولیاں اس کی ایک ران کو چھلنی کرتی نکل گئی تھیں۔ دشمن نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ میاں خان چلایا۔

"نور داد! پیچھے ہٹ' جاؤ لانچر مجھے دو۔"

میاں خان کی ایک ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے لٹک رہی تھی جسے وہ کھینچتا ہوا نور داد کی طرف کھسک رہا تھا۔ اس دوران نور داد لانچر میں راکٹ ڈال چکا تھا۔ دشمن کا ٹینک گڑگڑاتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نور داد کے پاس تین چار سیکنڈ ہی تھے۔ وہ ایک ٹرینڈ سپاہی تھا۔ اس نے اللہ کا نام لیا اور راکٹ فائر کردیا۔ راکٹ ٹینک کے بالکل سامنے جا کر لگا۔ راکٹ دشمن کے ٹینک کی فولادی چادر کو پھاڑ کر ٹینک کے اندر گھس گیا اور ایک دھماکے سے پھٹا۔ اس کے ساتھ ہی ٹینک کے پرخچے اڑ گئے۔ نور داد نے میاں خان کو بچانے کے لئے اپنے آپ کو اس پر گرا دیا تھا۔ میاں خان بار بار کہہ رہا تھا۔

"نورے! دشمن کا ٹینک مار کر تو نے میرے سینے میں ٹھنڈ ڈال دی۔"

اب مجھے اپنے شہید ہونے کی بہت زیادہ خوشی ہے۔"

دشمن کے دونوں ٹینک جل رہے تھے۔ نور داد نے جلدی سے اپنی اور میاں خان دونوں کی فیلڈ پٹیاں نکال کر میاں خان کی لٹکتی ہوئی ٹانگ پر کس کر باندھ دیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"نورے مجھے شہید ہونے سے نہ روکو۔ آگے جاؤ، دشمن کے ٹینک ہٹ کرو۔ مجھے شہید ہونے سے نہ روکو۔"

نور داد اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا پیچھے کھیت میں لے گیا۔ ان کے پیچھے سے گولے آنے لگے۔ گولے چیختے ہوئے ان کے اوپر سے گزر کر آگے پسپا ہوتے دشمن کے ٹینکوں اور اس کی انفنٹری کے ٹکڑے اڑا رہے تھے۔ یہ اپنے توپ خانے کی گولہ باری تھی۔ میاں خان کو نور داد نے اپنے بازوؤں میں لے رکھا تھا۔ فیلڈ پٹی باندھنے سے پہلے میاں خان کا کافی خون ضائع ہو چکا تھا۔ اتنے میں اپنی میڈیکل کور کے کچھ جوان اپنے زخمیوں کی تلاش میں ادھر آگئے۔ وہ جھک کر چل رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ کون کون جوان زخمی ہے یہاں، آواز دو ۔۔۔ نور داد نے انہیں آواز دی۔ میاں خان نے تڑپ کر نورداد کا گریبان پکڑ لیا اور غصے سے بولا۔

"میں زخمی نہیں ہوں۔ میں شہید ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے چھوڑ دو دشمن کو مارو، دشمن کو مارو۔"

میڈیکل کور کے جوان زخمی میاں خان کو سٹریچر پر ڈال کر پیچھے لے گئے۔ اس کی آواز دشمن کو مارو دشمن کو مارو ابھی تک سنائی دے رہی تھے۔ پیچھے سے اپنے ٹینکوں کی مدد آگئی۔ ایک رائفل کمپنی کے جوان بھی آگئے۔ انہوں نے نور داد کو بتایا کہ دشمن کو چکنا چور کر دیا گیا ہے۔ اس وقت دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ نور داد نے دیکھا جگہ جگہ دشمن کے ٹینک جل رہے تھے۔ میدان دشمن کی لاشوں سے پٹ گیا تھا۔ اسے اپنی پلاٹون کے کچھ جوان نظر آگئے۔ اسے کمپنی حوالدار کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی کمپنی کے جوانوں کو پیچھے بلا رہا تھا۔ سپاہی میاں خان کو فیلڈ ہسپتال سے پیچھے شہر کے ہسپتال میں بھیج دیا گیا تھا۔ نور داد اس سے ملنے ہسپتال گیا۔ اس کی ٹانگ کاٹ دی گئی تھی۔ وہ ہوش میں تھا۔ نور داد کو دیکھا تو بولا۔

"نورے تم نے مجھے شہید کیوں نہیں ہونے دیا۔"

نورداد نے میاں خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

"میاں خان! تم غازی ہو۔ غازی کا رتبہ شہید سے کم نہیں ہوتا۔"

میاں خان نے آنکھیں بند کر لیں اور بولا۔

"نورے! مجھے ایک بات کا بڑا دکھ ہے۔ میری ٹانگ انہوں نے کاٹ دی ہے۔ اب میں دشمن کے ٹینک کو راکٹ سے ہٹ نہیں کر سکوں گا۔"

نور داد نے جھک کر میاں خان کی چمکتی ہوئی نورانی پیشانی کو چوم لیا اور کہا۔

"میاں خان! دشمن کے ٹینک کو ہٹ کرنے کے لئے کراچی سے پشاور تک پاکستان کا بچہ بچہ موجود ہے۔ ہم نے اپنے اصل دشمن کی شناخت کر لی ہے۔ پاکستان کا بچہ بچہ نور داد اور میاں خان ہے۔"

میں ان دونوں کے قریب کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ میں دو پاکستانی جیالوں کی عارضی دشمنی کو اصل حملہ آور دشمن کی شناخت کے بعد پکی اور اٹوٹ دوستی میں بدلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں پاک فوج کے ایک سپاہی کو سٹریچر پر لایا گیا۔ اس کے پیٹ سے مشین گن کا پورا برسٹ گزر گیا تھا۔ ڈاکٹر اور نرسیں اسے تیزی سے آپریشن روم کی طرف لے جا رہی تھیں وہ یاعلی کے نعرے لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میرا مورچہ خالی ہے۔ مجھے یہاں کیوں لے آئے ہو۔ مجھے فرنٹ پر جانے دو۔ میرے گرائیں لڑ رہے ہیں۔"

خدا جانے اس کے اندر اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ وہ سٹریچر پر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کی طرف بھاگا۔ "مجھے دشمن کو مارنا ہے۔ مجھے دشمن کو کچلنا ہے۔" اس کے جسم سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ نرسیں اور ڈاکٹر اس کی طرف دوڑے۔ پاک فوج کا یہ شیر جوان، یہ اللہ کا سپاہی دروازے کے قریب جا کر گر پڑا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے جوش اور جذبے کے آنسو۔ وہ اسے سٹریچر پر ڈال کر آپریشن روم میں لے

گئے۔ میاں خان نے بستر پر پڑے پڑے یا علی کا ایسا فلک شگاف نعرہ مارا کہ ہسپتال کا سارا کمرہ گونج اٹھا۔ نور داد کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ان کی چیخ نکل گئی اور وہ بے اختیار ہو کر اپنے دوست ' اپنے گرائیں میاں خان سے لپٹ گیا۔

سبز پوش نے میرا ہاتھ تھام لیا اور میرے کان میں کہا۔

"یہ کیا جذبہ ہے جو کافر دشمن کو اپنی سرزمین کی طرف بڑھتے دیکھ کر آپس کی چھوٹی دشمنیوں کو غیر فانی دوستی کے رشتے میں جکڑ دیتا ہے؟ یہ کونسا جذبہ ہے جو پیٹ میں سینکڑوں گولیاں لگنے کے بعد بھی جوانوں کو محاذ کی طرف لے جانے کے لئے بے تاب کرتا ہے؟"

خود میرے اندر اسی جذبے نے جیسے بجلیاں بھر دی تھیں۔ میرے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ جسم سے آگ سی نکل رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"یہ اللہ اور اس کے رسول پاک کے لئے اپنی جان قربان کر دینے ایک بار نہیں ہزار بار جان قربان کر دینے کا جذبہ ہے۔"

سبز پوش کی آواز آئی۔

"بس اسی جذبے کی زیارت کرنے ہم سبز پوش آسمانوں سے اتر کر پاکستان کی سرزمین پر آئے تھے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تمہاری وجہ سے مجھے ایک بار پھر اس جذبے کی زیارت کا موقع نصیب ہو رہا ہے۔"

سبز پوش نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ ابھی اس جذبے کی اور بھی زیارتیں کرنی ہیں ہمیں۔۔"

اور مجھے اپنا جسم سبز پوش کے نورانی جسم کے ساتھ ہوا میں اڑتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

سرینگر شہر دن کے وقت بھی سنسان پڑا ہے'۔

کرفیو کی وجہ سے کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ بھارتی فوجی شہر میں گشت لگا رہے ہیں۔ انہیں کسی بھی کشمیری کو سڑک یا گلی کوچے میں دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم ہے۔ مقبوضہ کشمیر پر بھارتی ظلم و ستم اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ کشمیری مسلمانوں کے گھر جلائے جا رہے ہیں۔ نوجوان کشمیری حریت پرستوں کو چن چن کر گولی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ انہیں شہید کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ آگ دبانے سے اور بھڑک رہی ہے۔ کشمیر کا بچہ بچہ حریت پرست ہے۔ وہ اسلام کے نام پر کفار سے مقابلے کے لئے بھارتی جبر و استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے سر پر کفن باندھ کر میدان جہاد میں نکل آیا ہے۔ کشمیری مجاہد جان ہتھیلی پر رکھ کر بھارتی فوجی چوکیوں پر کمانڈو اٹیک کر رہے ہیں۔ ڈوگرہ فوج کے ایمونیشن ڈپو اڑائے جا رہے ہیں۔ بانہال بوٹ والی واحد بھارتی فوجی سپلائی لائین پر حملے کئے جا رہے ہیں۔ بھارتی حکومت بوکھلا گئی ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں ڈیپلائے انڈین ڈویژن اور بریگیڈوں کو کشمیریوں پر ظلم توڑنے کا کھلا حکم دے دیا گیا ہے۔ کشمیر جل رہا ہے۔ چناروں میں آگ لگی ہے مگر مسلمان کشمیری حریت پرستوں کے دلوں میں جذبہ اسلام اور آزادی کا شعلہ ' چناروں کی آگ کے شعلوں سے بھی زیادہ بلند ' زیادہ تابناک ہے۔

بھارتی فوجیوں میں زیادہ تعداد ہندو ڈوگروں اور مرہٹہ رجمنٹ کی ہے۔ سکھ فوجیوں نے مسلمانوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا ہے۔ اسی لئے مقبوضہ کشمیر میں کوئی سکھ بریگیڈ یا بٹالین موجود نہیں ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت آباد چلی آ رہی ہے۔ بھارتی حکومت نے کشمیر کے راجہ کی ملی بھگت سے کشمیر پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ کشمیر کے مسلمان اپنی آزادی ' کافروں کی حکومت سے نجات اور اسلام کی سربلندی کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ کشمیری مجاہد بھارتی فوجیوں سے اسلحہ چھین کر انہی پر استعمال کر رہے ہیں۔ انہیں پاکستان سمیت کسی ملک سے کسی قسم کی فوجی یا مالی مدد نہیں مل رہی۔ وہ اپنے وسائل ' اپنے جذبہ آزادی کے ساتھ بھارتی استبداد کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ پاکستان کشمیری حریت پرستوں کو صرف اخلاقی مدد دے رہا ہے اور انہیں صرف اسی مدد کی ضرورت ہے۔

سرینگر میں کرفیو لگا ہے۔ دوپہر کے تین بج رہے ہیں۔ شہر کے گلی کوچے بازار خالی خالی ہیں۔ کبھی کبھی کوئی بھارتی فوجی ٹرک گزر جاتا ہے جس میں ڈوگرہ سپاہی رائفلیں تانے کھڑے نظر آ جاتے ہیں۔ سرینگر کی جھیل ڈل میں ہانجیوں کے شکارے کنارے کنارے لگے کھڑے ہیں۔ جب سے کشمیری حریت پرستوں کی تحریک نے زور پکڑا ہے۔ دنیا بھر کے سیاحوں نے مقبوضہ کشمیر کا رخ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جھیل ڈل کی سطح پر کوئی شکارا نہیں تیر رہا۔ سرینگر کا امیراں کدل پل بھی ویران ویران ہے۔ پل کی دونوں جانب بھارتی فوجی چوکیاں ہیں جہاں مشین گنیں لگی ہیں۔ پل کے درمیان بھی دو مرہٹہ فوجی چل پھر کر پہرہ دے رہے ہیں۔ سرینگر کے شمال جنوب میں جو چھوٹی سی پکی سڑک گلمرگ کو جاتی ہے وہاں سے گلمرگ کی برف پوش پہاڑیاں بڑی قریب دکھائی دیتی ہیں۔ کشمیر میں موسم بہار گزر چکا ہے اور موسم خزاں کی آمد آمد ہے۔ یعنی سردی اور برفباریاں شروع ہونے والی ہیں۔ موسم سرد ہوتا جا رہا ہے۔ چناروں نے اپنے پتے جھاڑنے شروع کر دیئے ہیں۔ رات کو بے برگ و بار درختوں میں سرد ہوا کے تھپیڑے چلتے ہیں۔ اسی سڑک کے دونوں جانب چنار کے درختوں کی قطاریں دور پہاڑیوں کے دامن تک چلی گئی ہیں۔ سرینگر سے نکلتے ہی اس سڑک کے بائیں جانب جگہ جگہ سڑک کی ڈھلان پر لکڑی کے مکان بنے ہوئے ہیں۔ ان مکانوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا پہاڑی نالہ بہتا ہے۔ اس نالے میں جہاں چنار کے ایک گھنے درخت کی شاخیں نالے کے شفاف پانی پر جھکی ہوئی ہیں وہاں اوپر پتھروں کی ایک ٹیرس پر کشمیری حریت پرست گل میر کا پرانا مکان ہے۔ لکڑی کی دیواریں، لکڑی کی پرانی چھت جس پر ساگ اور سرخ مرچیں گل میر کی بوڑھی ماں اور نوجوان بہن زینی نے سکھانے کے لئے ڈال رکھی ہیں۔ گل میر اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کا دل بھی دوسرے کشمیری نوجوانوں کی طرح اسلام اور آزادی کشمیر کے نام پر دھڑکتا ہے۔ اس کا تعلق کشمیر کی ایک خفیہ مزاحمتی جماعت سے ہے۔ یہ کشمیری نوجوان آزادئ وطن کے متوالے ہیں۔ ان کے سینے اسلام اور آزادئ کشمیر کے جذبوں سے معمور ہیں۔ ان میں سے سب نے کمانڈو ٹریننگ لے رکھی ہے۔ ان کا مقدس مشن کشمیر کی سرزمین سے بھارتی ظلم و استبداد کے نام و نشان کو مٹا کر کشمیر کو آزاد کرانا ہے۔ یہ حملہ آور بھارتی

فوجیوں کے ٹھکانوں پر راتوں کو چھپ کر کمانڈو اٹیک کرتے ہیں۔ ان کے ایمونیشن اور پٹرول ڈپو اڑاتے ہیں۔ اس مقدس مشن میں اس کمانڈو پارٹی کے کئی کشمیری جوان شہید ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کوئی شہید ہوتا ہے تو دوسرا مجاہد اس کی جگہ آن لیتا ہے۔

سرینگر کا شہر سنسان ہے۔ کرفیو لگا ہوا ہے۔

اس وقت گلمرگ جانے والی پکی سڑک سے تھوڑے فاصلے پر ڈھلان میں پہاڑی نالے پر گل میر کے پرانے گھر میں بھی خاموشی ہے۔ گل میر کا بوڑھا باپ چولانی میں ایک طرف دھسہ اوڑھے بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ گل میر کی والدہ کونے میں جازم پر بیٹھی پرانی شال کی مرمت کر رہی ہے۔ گل میر کی چھوٹی بہن زینی سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس کھڑی ہے۔ وہ کھڑکی کا تھوڑا سا پٹ کھولے سڑک پر دیکھ رہی ہے۔ یہ ڈیوٹی زینی کے کمانڈو بھائی گل میر نے لگائی ہے تاکہ اگر کوئی بھارتی فوجی، جیپ یا ٹرک اس طرف آتا نظر آئے تو وہ "فوراً" اطلاع کر دے۔ اس وقت مکان کے نیچے ایک چھوٹے سے تہہ خانے میں لکڑی کے کھوکھے پر موم بتی روشن ہے۔ اس کی روشنی میں کاغذ کا ٹکڑا سامنے رکھے کشمیری حریت پرست کمانڈو گل میر اور اس کا کشمیری حریت پرست کمانڈوں ساتھی اسد بٹ ایک دوسرے کے آمنے سامنے دری پر بیٹھے کاغذ پر بنی ہوئی آڑھی ترچھی لکیروں کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ دونوں خوبصورت ہیں۔ گورے چٹے جوان ہیں۔ گل میر کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں ہیں۔ اسد نے چھوٹی ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے۔ وہ پرانی گرم جیکٹوں میں ملبوس ہیں۔ گردنوں میں گرم مفلر لپیٹ رکھے ہیں کیونکہ تہہ خانے میں خاصی سردی ہے۔

اتنے میں تہہ خانے میں اترنے والی لکڑی کی سیڑھی والے دروازے پر خاص قسم کی دستک ہوتی ہے۔ اسد بٹ اشارہ کرتا ہے۔ گل میر اٹھ کر دروازہ کھولتا ہے۔ باہر گل میر کی بہن زینی ہاتھ میں اخروٹ کی لکڑی کا پرانا ٹرے لئے کھڑی ہے جس میں دو پیالیاں اور چھوٹا سماوار رکھا ہوا ہے۔ گل میر ٹرے پکڑ کر اس سے پوچھتا ہے۔

"باہر کیا پوزیشن ہے؟"

زینی اطمینان سے کہتی ہے۔ "سب ٹھیک ہے۔ ابھی تک کوئی انڈین ٹرک وغیرہ دکھائی

نہیں دیا"۔

"او کے۔ تم ہوشیار رہنا"۔

گل میر زینی کو رخصت کر کے دروازے کی کنڈی چڑھاتا ہے۔ اپنے ساتھی کمانڈو اسد بٹ کے پاس ٹرے رکھ کر ساوار میں سے گرم گرم کشمیری چائے نکال کر پیالیوں میں ڈالنے لگتا ہے۔ اسد بٹ کھوکھے پر رکھے کاغذ کو تہہ کر کے دری کے نیچے چھپا دیتا ہے اور چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہتا ہے۔

"ہماری اطلاع کے مطابق ساتویں ڈوگرہ بریگیڈ کے تیرہ ٹرک ایمونیشن لے کر آ رہے ہیں۔ ان میں مارٹر توپیں اور گولہ بارود لدا ہوا ہے۔ یہ سارا ایمونیشن آزادی کشمیر کے جانبازوں کو کچلنے کے لئے سرینگر کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں لایا جا رہا ہے"

گل میر نے چائے کے چند گھونٹ بھرنے کے بعد پیالی کھوکھے پر روشن موم بتی کے پاس رکھ دی اور اپنے گھٹنوں کو بازوؤں کے حلقے میں لیتے ہوئے بولا۔

"ان میں سے ایک بھی ٹرک سرینگر نہیں پہنچنا چاہیے"۔

اسد بٹ نے کہا۔

"یہ کام آسان نہیں ہے۔ پہاڑی سڑک پر ٹرک فاصلہ رکھ کر چل رہے ہوں گے۔ ہم زیادہ سے زیادہ دو چار ٹرک ہی تباہ کر سکیں گے"۔

کمانڈو گل میر سوچ میں پڑ گیا۔ اسد بٹ خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ گل میر نے بھی سبز چائے کی پیالی اپنے ہاتھ میں پکڑ لی اور چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد بولا۔

"ہمارے دوسرے حریت پرست ساتھی بارہ مولا کی طرف اپنے مشن پر گئے ہوئے ہیں۔ اگر ان میں سے دو چار بھی ہمارے ساتھ ہوتے تو ہم ڈوگرہ فوج کے تیرہ کے تیرہ ٹرک تباہ کر سکتے تھے"۔

اسد بٹ نے کہا۔

"اگر ہم پہاڑی سڑک پر بارودی سرنگیں بھی لگا دیں تب بھی دو ایک اگلے ٹرک ہی تباہ ہوں گے۔ ان کے دھماکے سے اڑنے

کے بعد بھارتی کمانڈر کا نوائے کو روک دے گا اور سڑک کی اگلی بارودی سرنگوں کو صاف کر دیا جائے گا"۔

گل میر ساوار میں سے مزید گرم چائے اپنی پیالی میں انڈیلنے لگا۔

"اگر یہ ایمونیشن اور مارٹر توپوں سے لدے ہوئے ٹرک سرینگر پہنچ گئے تو ان کے گولوں سے نہ جانے کتنے نہتے کشمیری مسلمان شہید ہو جائیں گے۔ کتنے کشمیری مسلمانوں کے گھر جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ بھارتی فوجی تو امن پسند مسلمان شہریوں کے گھروں پر بھی مارٹر گولوں سے فائر کرتے ہیں۔ اس وقت وادئ کشمیر کے ہر قصبے، ہر شہر میں مسلمانوں کے گھر جلائے جا رہے ہیں"۔

اسد بٹ نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

"ایک ترکیب ہو سکتی ہے"۔

گل میر نے اپنی نظریں اسد بٹ کے چہرے پر جما دیں۔

"کیا؟"

اسد بٹ نے پیالی دری پر رکھ دی اور بولا۔

"ہماری اطلاع کے مطابق ساتویں ڈوگرہ فوج کے ان تیرہ ٹرکوں کا کانوائے سری نگر کی وادی میں داخل ہونے کے بعد قاضی کنڈ کے پہاڑی چشموں پر کچھ دیر کے لئے رکے گا۔ وہاں ڈوگرہ ایم ٹی رجمنٹ کے سپاہی چائے وغیرہ پی کر تازہ دم ہوں گے۔ یہ ہمارے آدمیوں نے ہمیں پکی اطلاع دی ہے کہ یہ انڈین ملٹری کانوائے قاضی کنڈ کے چشموں پر ضرور رکے گا"۔

"وہاں پر کیا کر سکتے ہیں؟" گل میر نے بے نیازی سے پوچھا۔

اسد بٹ کی آنکھوں میں خاصی چمک تھی۔ وہ ذرا سا جھک کر بولا۔

"گل میر اگر ہم کسی طرح سے قاضی کنڈ میں ان ٹرکوں میں نمبر تھری ٹائم بم لگانے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ہم تیرہ کے تیرہ

فوجی ٹرکوں کو ایک ساتھ دھماکے سے اڑا سکتے ہیں"۔

اب گل میر کی آنکھیں بھی چمک اٹھی تھیں۔ پہلی بار سننے پر اسے یہ ترکیب بے حد پسند آئی تھی پھر اس کے چہرے پر فکر و تردد کے اثرات نمودار ہو گئے۔ وہ گہرا سانس بھر کر بولا۔

"لیکن یہ کام ہم دونوں اکیلے کیسے کر سکیں گے؟ پھر کسی سویلین کو ان ٹرکوں کے پاس آنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ ڈوگرہ فوج کا سخت پہرہ ہو گا۔ ذرا سا شک پڑنے پر یہ ڈوگرے کسی بھی کشمیری کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔ مرنے کی تو ہمیں کوئی پروا نہیں۔ اسلام اور آزادیٔ کشمیر پر ہم ایک لاکھ بار جان قربان کر دیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہمارا مشن ادھورا رہ جائے گا؟"

اسد بٹ بولا۔

"میں سوچتا ہوں کہ قاضی کنڈ میں قادری چائے والا ہماری مدد کر سکتا ہے"

گل میر اسد بٹ کا منہ تکنے لگا۔

"وہ تو چائے کی دکان کرتا ہے۔ وہ ہماری کیا مدد کرے گا؟"

اسد بٹ مسکرایا۔

"شاید ہمیں یاد نہیں رہا کہ بانہال سے جو لاری ٹرک قاضی کنڈ آتا ہے وہاں ان ٹرکوں اور لاریوں کے گرم ٹائروں کو چشمے کے پانی سے ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ ریڈی ایٹروں میں تازہ پانی ڈالا جاتا ہے اور یہ کام قادری کے نوکر کرتے ہیں جو ہر لاری والے سے پانچ روپیہ مزدوری وصول کرتے ہیں"

گل میر نے موم بتی کی پگھلتی ہوئی موم کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی تک تمہاری بات کو پوری طرح نہیں سمجھ سکا"

اسد بٹ پہلو بدل کر بولا۔

"قادری کے جو ملازم لڑکے ٹرکوں لاریوں کے ٹائر دھوتے ہیں۔

گرم ریڈی ایٹروں میں ٹھنڈا پانی ڈالتے ہیں۔ ان میں ہم دونوں بھی بھیس بدل کر شریک ہو سکتے ہیں"۔

اب گل میر کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ وہ چند سیکنڈ کے لئے اسد بٹ کو تکتا رہا۔

اسد بٹ نے مسکرا کر پوچھا۔

"میرا خیال ہے اب تم میری سکیم سمجھ گئے ہو؟"

گل میر نے دری کے نیچے سے تہہ کیا ہوا کاغذ کا ٹکڑا نکالا۔ اسے کھوکھے پر موم بتی کی روشنی میں بچھایا اور غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ڈوگرہ کانوائے قاضی کنڈ کب پہنچے گا؟"

اسد بٹ نے کاغذ پر ایک جگہ انگلی رکھ دی۔ یہاں ایک گول نشان بنا ہوا تھا۔

"یہ قاضی کنڈ کے پہاڑی چشموں کا مقام ہے۔ میری اطلاع کے مطابق پرسوں شام چار بجے ڈوگرہ فوج کا یہ ملٹری کانوائے قاضی کنڈ پہنچ رہا ہے۔ وہ کل شام جموں سے روانہ ہونے والا ہے"

کمانڈو گل میر نے کاغذ تہہ کر کے دری کے نیچے اسی طرح چھپا دیا۔ سیڑھیوں کے اوپر دروازے پر زینی نے دستک دی۔ گل میر لپک کر دروازے پر گیا۔

"کیا بات ہے زینی؟"

گل میر نے زینی کی خفیہ دستک کو پہچان لیا تھا۔ زینی نے بند دروازے کی دوسری طرف سے جواب دیا۔

"ایک فوجی جیپ ادھر آ رہی ہے"

یہ سنتے ہی اسد بٹ نے موم بتی پھونک مار کر بجھا دی۔ سماوار پیالیاں ٹرے میں رکھیں اور دونوں تہہ خانے سے باہر نکل آئے۔ گل میر کا بوڑھا باپ اسی طرح کونے میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی طرف ایک پل کے لئے نگاہ اٹھائی اور کشمیری میں بولا۔

"ہو سکتا ہے یہ بھارتی فوجی گھر کی تلاشی لینے آئے ہوں۔ سوچ سمجھ کر وار کرنا"

گل میر کی والدہ بھی گل میر کو تک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ کچھ خون سا چھا

رہا تھا۔ فوجی جیپ کی آواز قریب آ رہی تھی۔

اسد نے کہا۔ "کسی نے مخبری نہ کر دی ہو" گل میر کھڑکی کی درز میں سے باہر دیکھ رہا تھا جہاں اسے بھارتی فوجی جیپ اپنے مکان کی طرف آتی اب صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"فوراً ہائیڈ آوٹ میں چھپ جاؤ"

اس کے ساتھ ہی دونوں کشمیری حریت پرست کمانڈو لپک کر مکان کے عقبی دروازے کی طرف بڑھے اور چبوترے کے نیچے جھاڑیوں میں کود گئے۔ پہاڑی نالے کے اوپر جہاں چنار کا گھنا درخت تھا اس کے کھوکھلے تنے میں انہوں نے ایک خفیہ جگہ بنا رکھی تھی، جہاں دو بھرے ہوئے پستول، دو کمانڈو چاقو اور چار دستی بم ہر وقت موجود رہتے تھے۔ دونوں جھاڑیوں میں سے تیزی سے گزرتے ہوئے درخت کے تنے کے اندر بنے ہوئے خفیہ ٹھکانے میں آ کر چھپ گئے۔ یہاں ایک جگہ دو گول سوراخ بنا دیئے گئے جہاں سے مکان کا صدر دروازہ اور چبوترے والا آنگن صاف نظر آتا تھا۔ دونوں کشمیری کمانڈو ان سوراخوں کے ساتھ آنکھیں لگا کر بیٹھ گئے۔

اس کے ساتھ ہی ایک انڈین ملٹری جیپ سبزیوں ترکاریوں والی باڑھ کا چکر گھوم کر مکان کے دروازے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

گل میر نے آہستہ سے کہا۔

"اسد بٹ! ضرور یہ ہماری تلاش میں آئے ہیں۔ کسی نے مخبری کر دی ہے"

اسد بٹ نے بھرا ہوا ایک پستول گل میر کو تھما دیا اور دوسرا پستول اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"یہ چار فوجی ہیں۔ اگر ایسی ویسی بات ہوئی تو ان میں سے ایک بھی زندہ واپس نہیں جائے گا"

فوجی جیپ میں مرہٹہ رجمنٹ کے چار فوجی سوار تھے۔ ان میں سے تین لانس نائیک تھے اور ایک صوبیدار میجر تھا۔ چاروں کے رنگ کالے تھے کیونکہ وہ بھارت کے صوبہ مہاراشٹر کے رہنے والے تھے۔

صوبیدار میجر نان کمشنڈ آفیسر تھا اور ذرا ادھیڑ عمر کا تھا۔ ایک فوجی جیپ کے پاس ہی کھڑا رہا۔ باقی تینوں فوجی گل میر کے مکان کے آنگن میں آ گئے۔ ان کو دیکھ کر گل میر کا باپ اور ماں باہر آ گئے تھے۔ زینی کو انہوں نے غسل خانے میں بھیج دیا تھا۔

مرہٹہ صوبیدار میجر نے مکان کا ایک جائزہ لیا اور کرخت آواز میں بولا "تم ادھر کتنے لوگ رہتا ہے"

بوڑھے کشمیری نے کہا۔

"ہم دو میاں بیوی ہیں۔ ایک بیٹا ہے وہ کھیتوں میں کام کرنے گیا ہوا ہے"

مرہٹہ فوجی افسر نے اشارہ کیا۔ دونوں فوجی مکان میں گھس گئے۔ گل میر نے اسد بٹ کے کان میں سرگوشی کی۔

"وہ گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔ زینی کو امی نے غسل خانے میں چھپا دیا ہو گا"

اسد بٹ نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں۔ ایسی ویسی کوئی بات ہوئی تو ان چاروں فوجیوں کی لاشیں یہیں پڑی ہوں گی"

زینی نے یہ عقلمندی کی تھی کہ تہہ خانے میں خشک چارے کی ایک بوری لے جا کر پھینک دی تھی۔ زینی غسل خانے میں تھی۔ وہ یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ نہا رہی ہے۔ زینی کی ماں آنگن میں ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ زینی کا باپ دونوں فوجیوں کے ساتھ اندر تلاشی دلوا رہا تھا۔ ایک فوجی نیچے تہہ خانے میں اتر گیا۔ اوپر کھلے دروازے میں سے ڈوبتے دن کی روشنی نیچے آ رہی تھی۔ اس نے تہہ خانے میں چارے کی بوری کو ٹھوکر ماری۔ اوپر سے گل میر کے باپ نے کہا۔

"ادھر ہم گائے کے لئے چارہ رکھتے ہیں"

مرہٹہ فوجی اوپر آ گیا۔ انہوں نے سارے گھر کی تلاشی لی۔ وہ گل میر کے بوڑھے باپ

کے ساتھ باہر آنگن میں آ گئے۔ صوبیدار میجر نے پوچھا۔

"کچھ ملا؟"

"نو سر۔ اندر کوئی نہیں ہے"۔

تب مرہٹہ فوجی افسر بوڑھے کشمیری کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس کے قریب چل کر آیا اور حاکمانہ لہجے میں بولا۔

"ہمیں خبر ملی ہے تمہارے ہاں باغی لوگ آ کر جمع ہوتے ہیں"

گل میر کے بوڑھے باپ نے کہا۔

"جناب آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ ہمارا کسی باغی سے کوئی تعلق نہیں ہے"

مرہٹہ صوبیدار میجر نے مکان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری بیٹی کہاں ہے؟"

گل میر کی ماں نے جلدی سے کہا۔

"وہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے گئی ہے"

مرہٹہ فوجی افسر پر اس جملے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے اپنے لانس نائیک کو حکم دیا۔

"سامنے غسل خانے کا دروازہ توڑ ڈالو"۔

اسی وقت لانس نائیک غسل خانے کی طرف لپکا اور رائفل کا بٹ مار کر دروازے کو توڑ دیا۔ اندر زینی سہمی کھڑی تھی۔

"اسے ساتھ لے چلو۔ یہ بوڑھا لوگ اس طرح باغی لوگ کا نہیں بتائے گا"

مرہٹہ لانس نائیک نے زینی کو پکڑ کر غسل خانے سے باہر کھینچ لیا۔ گل میر نے یہ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس کا حلق کڑوا ہو گیا۔ وہ آہستہ سے بولا۔

"اسد بٹ! وقت آ گیا ہے۔ تم جانتے ہو تمہیں جو کرنا ہے"

اسد بٹ کے جواب کا انتظار کئے بغیر گل میر درخت کے تنے کی خفیہ کھوہ میں سے نکلا

اور بجلی ایسی تیزی کے ساتھ جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اسد بٹ بھی اس کے پیچھے وہاں سے نکل گیا۔ مرہٹہ فوجی زینی کو گھسیٹتے ہوئے صحن سے باہر لے جا رہا تھا۔ زینی کی بوڑھی ماں اور باپ دونوں صوبیدار میجر سے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے مگر ہندو فوجی انہیں اپنی مرہٹی زبان میں گالیاں بک رہا تھا۔ ایک بار زینی کی ماں اپنی بیٹی کی چیخ و پکار پر آگے بڑھی تو مرہٹہ صوبیدار نے اسے گردن سے پکڑ کر پیچھے فرش پر پھینک دیا اور اس پر اپنی رائفل تان کر فائر کرنے ہی والا تھا کہ پستول کا فائر ہوا اور مرہٹہ صوبیدار میجر اپنی جگہ پر ساکت سا ہو گیا پھر اس کے منہ سے خون ابل پڑا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ منہ کے بل صحن کے فرش پر دھڑام سے گر گیا۔

یہ پستول کا فائر کمانڈو گل میر نے کیا تھا جو پیچھے سے ہو کر مکان کی ڈھلانی چھت پر پہنچ چکا تھا۔ اپنے کمانڈر کو گرتے ہوئے دیکھ کر دوسرے مرہٹہ فوجی نے رائفل سے ہوائی فائر کیا اور باہر کی طرف دوڑا۔ ابھی وہ صحن سے باہر ہی نکلا تھا کہ سامنے سے پستول کا ایک اور فائر ہوا اور یہ مرہٹہ فوجی بھی گر پڑا۔ اسد بٹ کی گولی اس کے دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ان دونوں تربیت یافتہ کشمیری کمانڈوز کا نشانہ خطا جاتا۔ جیپ کے پاس جو فوجی پہرہ دے رہا تھا فائرنگ کی آواز سن کر اس نے بھی رائفل تان لی اور صحن کی طرف دوڑا۔ تیسرے فوجی نے چلا کر کہا۔

"کمانڈو ہیں، کشمیری کمانڈو ہیں"

زینی اس کی ماں اور باپ نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ مکان کے ایک کمرے میں گھس گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ کام سوائے ان کے بیٹے گل میر اور اسد بٹ کے اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ دونوں ہندو فوجی اپنے افسر کی لاش کی طرف لپکے۔ ایک زمین پر رائفل لئے پوزیشن بنا کر اوندھا لیٹ گیا۔ دوسرے نے چیخ کر کہا۔

"میجر صاحب مر گئے ہیں۔ لانس نائیک پوار بھی مر گیا ہے"

اب دونوں دوڑ کر جیپ کی طرف بڑھے۔ گل میر مکان کی چھت پر ان دونوں کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ جونہی دونوں فوجی جیپ کے قریب آئے تو وہ گل میر کی زد میں تھے۔ اس بہادر کشمیری کمانڈو نے پہلے ایک کو نشانے میں لے کر فائر کیا اور اس کے ساتھ

دوسرے پر فائر کر دیا۔ دونوں وہیں ڈھیر ہو گئے۔

اسد بٹ غسل خانے کی دیوار کے پیچھے سے نکل آیا۔ گل میر نے بھی مکان کی چھت سے صحن میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے بوڑھے ماں باپ اور زینی کمرے میں سہمے ہوئے تھے۔ گل میر نے اسد بٹ سے کہا۔

"سب سے پہلے ان لاشوں کو ٹھکانے لگانا ہے"

گل میر نے کمرے میں جا کر اپنے والد سے کشمیری میں کہا۔

"ابا تم سب کو لے کر گاؤں چلے جاؤ۔ ابھی۔ میں وہاں آ جاؤں گا۔ جلدی کرو"

ماں نے کہا۔ "بیٹا تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ یہ لوگ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے اب"۔

گل میر نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ماں! جب تک میں زندہ ہوں میرے خون کا ایک ایک قطرہ آزادیٔ کشمیر کے لئے وقف ہے۔ تم دیر نہ کرو۔ زینی۔ تم امی ابا کا خیال رکھنا"۔

زینی نے گردن بلند کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بھائی جان۔ تم فکر نہ کرو۔ اللہ ہماری مدد کرے گا"

زینی جلدی جلدی ضروری سامان کو ایک جگہ جمع کرنے لگی۔ گل میر اور اسد بٹ نے چاروں بھارتی فوجیوں کی لاشوں کو جیپ میں ڈال کر اوپر ایک پرانا لحاف ڈال دیا اور وہ جیپ کو سٹارٹ کر کے گل مرگ جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ نیچے کچے راستے پر جھاڑیوں کی اوٹ میں رہتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ جیپ کچے راستے پر تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ یہ فوجی جیپ تھی جس میں سویلین سوار تھے۔ انہیں یہ بھی خطرہ تھا کہ سامنے سے کوئی دوسری بھارتی فوجی جیپ یا ٹرک نہ آ جائے۔ گل میر خود جیپ چلا رہا تھا۔

اسد بٹ بار بار پیچھے دیکھ لیتا تھا۔

ایک جگہ چنار کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ یہاں سے کچا راستہ بائیں طرف پہاڑی

ڈھلانوں کی طرف نکلتا تھا جہاں آگے دریائے جہلم بہہ رہا تھا۔ وہ اس مقام کی طرف جا رہے تھے۔ اب دن ڈھلنے لگا تھا۔ سورج گل مرگ کے پہاڑیوں کی پیچھے جھک گیا تھا اور وادی میں ہلکا ہلکا اندھیرا اتر آیا تھا۔ گل میر جیپ کو ایک جگہ سے گھما کر ایک بہت بڑی چٹان کے پیچھے لے آیا۔ نیچے سو ڈیڑھ سو فٹ کی گہرائی میں دریا تیزی سے بہہ رہا تھا۔

گل میر اور اسد بٹ چھلانگیں لگا کر جیپ سے اتر آئے۔ پھر انہوں نے جیپ کو دھکیل کر کھائی کے کنارے تک پہنچایا جونہی جیپ کے اگلے پہیئے کھائی کے کنارے سے پھسلے انہوں نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ بھارتی فوجی جیپ چاروں بھارتی فوجیوں کی لاشوں کو لئے کھائی میں لڑھک گئی۔ لڑھکنے کے ساتھ ہی جیپ میں سے بھارتی فوجیوں کی لاشیں نکل کر نیچے گریں۔ جہاں لاشیں گری تھیں وہی جیپ ایک دھماکے سے ٹکرائی اور شعلہ بلند ہوا اور پھر شعلوں میں بھڑکتی ہوئی فوجی جیپ دریا میں اتر گئی۔

گل میر اور اسد بٹ کھائی کی دوسری جانب اتر کر پتھریلے پہاڑی راستہ سے واپس اپنے مکان کی طرف چل پڑے۔ پستول ان کی جیبوں میں تھے۔ ان کا رخ اپنے گھر کی طرف تھا۔ گھر خالی پڑا تھا۔ زینی اپنے ماں باپ کو لے کر گھر سے گاؤں کی طرف جا چکی تھی۔ وہاں صرف چار پائیاں اور خالی برتن ہی پڑے تھے۔ گل میر تیزی سے تہہ خانے میں گیا۔ دری اٹھا کر نیچے سے وہ کاغذ نکالا جس پر قاضی کنڈ کی پہاڑی سڑک کا نقشہ آڑھی ترچھی لکیروں کی شکل میں بنا ہوا تھا۔

نقشہ جیب میں ڈال کر وہ صحن میں آ گیا جہاں اسد بٹ زمین پر بکھرے ہوئے بھارتی فوجیوں کے خون پر مٹی ڈال رہا تھا۔ انہوں نے خون کے دھبوں کو پاؤں سے رگڑ رگڑ کر مٹا دیا۔

اسد بٹ بولا۔ "اب ہمیں بھی یہاں سے نکل جانا چاہیے"۔

گل میر نے اپنے خالی مکان پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور اسد بٹ سے کہا۔

"اسد! ابھی نہ جانے کتنے کشمیری گھرانوں کے آنگن ویران ہوں گے"۔

اسد بٹ نے جواب میں کہا۔

"بلکہ یہ کہوں کہ ابھی نہ جانے کتنے گھروں کے آنگنوں کو ہمیں
دشمن کے خون سے سیراب کرنا ہو گا۔ آؤ اب چلو۔ ہو سکتا ہے
دشمن اپنے ساتھیوں کی تلاش میں ادھر آ جائے"

وہ ڈھلان پر تیزی سے اترنے لگے اور پھر پہاڑی نالے کو پار کر کے سامنے مکئی کے کھیتوں میں غائب ہو گئے۔

رات گہری ہو گئی تھی۔

پہاڑی ڈھلانوں پر چیڑھ اور چنار کے درخت اندھیری رات کے سناٹے میں خاموش کھڑے تھے ۔ ان چناروں کے آگے ایک جگہ بہت بڑی چٹان کا کنگورا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ اس نے اوپر ایک چھت سی ڈال دی تھی۔ اس کے نیچے جنگلی جھاڑیوں کی بھرمار تھی ان جھاڑیوں میں کہیں کہیں کسی وقت ایسی آواز آ جاتی جیسے کوئی سردی میں ٹھٹھرتی ہوئی بلی کراہ رہی ہو۔ آسمان پر ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ ایسے میں دو انسانی سائے چٹان کی طرف بڑھ رہے تھے جونہی وہ جھاڑیوں کے قریب سے گزرے پیچھے سے اچانک دو انسانی سائے جنگلی درندوں کی طرح نکلے اور پہلے والے انسانی سایوں کی گردنوں پر پستول رکھ دیئے۔

"کون ہو تم ؟"

اسد بٹ اور گل میر نے خاص کمانڈو خفیہ کوڈ ورڈ بتایا۔ حملہ آور سائے پیچھے ہٹے اور جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ گل میر نے اسد بٹ سے کہا "سبحان بٹ یہیں ہو گا۔ میرے ساتھ آؤ"۔

وہ چٹان کی چھت کے نیچے آ کر رک گئے۔ گل میر نے ایک جگہ سے جھاڑیاں ہٹائیں تو نیچے ایک تنگ زینہ زمین میں اتر گیا تھا۔ گل میر زینہ اتر گیا۔ اسد بٹ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ آگے لکڑی کا دروازہ بند تھا۔ گل میر نے دروازے پر خاص دستک دی اندر سے آواز آئی۔

"کون ہے بابا! مجھ غریب فقیر کو خدا کی عبادت کیوں نہیں کرنے دیتے ؟"

گل میر نے حاتم کی آواز پہچان لی اور کہا۔

"حاتم میں ہوں گل میر۔ میرے ساتھ اسد بٹ بھی ہے"۔

دروازہ کھل گیا یہ کشمیری حریت پرستوں کا ایک خفیہ ٹھکانہ تھا۔ لالٹین جل رہی تھی۔ اس کی روشنی میں اسد بٹ نے دیکھا کہ پانچ چھ حریت پرست کشمیری کمبل اوڑھے سو رہے ہیں۔ دیواروں کے ساتھ رائفلیں لگی ہیں۔

ایک مارٹر توپ بھی پڑی تھی جو ان کشمیری مجاہدوں نے بھارتی فوج کی کسی بٹالین سے چھینی تھی۔ حاتم نے گل میر اور اسد بٹ کو پہچان لیا۔ وہ بولا۔

"اس وقت تم کہاں سے آ رہے ہو ؟"

گل میر نے وہیں کھڑے کھڑے حاتم کو سارا قصہ بیان کر دیا۔ پھر پوچھا۔

"سبحان بٹ کہاں ہے۔ ہم اس سے ملنے آئے ہیں۔ اس سے ملنا بہت ضروری ہے"۔

سبحان بٹ اس کشمیری کمانڈو پارٹی کا سردار تھا۔ حاتم نے انہیں چائے ساوار میں سے نکال کر پیش کی۔ وہ دونوں وہاں بیٹھ گئے۔

حاتم کہنے لگا۔

"سبحان ! ایک ضروری مشن پر گیا ہوا ہے۔ شاید صبح تک آ جائے۔ تم آرام کرو۔ بہت دور سے پیدل چل کر آ رہے ہو"

اسد بٹ بولا۔ "ہم کافروں کے ساتھ جہاد کر رہے ہیں۔ ہم نہیں تھک سکتے۔ بہرحال اپنے آپ کو پھر سے تازہ دم کرنے کے لئے باقی رات آرام کر لیں گے"

گل میر اور اسد بٹ وہیں کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند سو گئے۔ رات گزرتی چلی گئی۔ کشمیری غازی حاتم جاگ کر پہرہ دیتا رہا۔ باہر جھاڑیوں میں دوسرے کشمیری مجاہد بھی اپنے پہرے پر موجود رہے۔ صبح اذان کے وقت سبحان بٹ آ گیا۔ اس کے ہمراہ چار حریت پرست کشمیری بھی تھے۔ وہ گل میر اور اسد بٹ سے گلے ملا۔

کہنے لگا۔

"ہمارے تین جوان شہید ہو گئے ہیں ' مگر ہم نے چار بھارتی گن پوسٹوں کو اڑا دیا ہے۔ یہ فوجی چوکیاں ہمارے لئے سب

سے بڑا خطرہ ہیں۔ پہاڑی کی چوٹی پر ان چوکیوں کو دوبارہ بنانے میں
بھارتیوں کو پندرہ دن لگ جائیں گے۔ تب تک ہم دوسرے سپلائی
روٹ کا بندوبست کرلیں گے۔ تم سناؤ۔ تمہارے سرینگر والے محاذ
کا کیا حال ہے؟"۔

گل میر نے کہا۔

"ہم اپنے محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ بھارتی فوجی کرفیو میں گھروں کی
تلاشیاں لیتے ہیں۔ آگ لگا دیتے ہیں۔ بے گناہ مسلمانوں کو پکڑ کر
لے جاتے ہیں۔ وہیں گولیوں سے بھون ڈالتے ہیں۔ وہ بچوں کو بھی
نہیں بخشتے۔ مگر ہم بھی موقع ملنے پر ان سے پورا پورا بدلہ لے لیتے
ہیں"۔

پھر اس نے اپنے گھر پر چار بھارتی فوجیوں کے چھاپے اور انہیں ہلاک کر دینے کا واقعہ
سنایا۔ تمام حریت پرستوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ سوئے
ہوئے کشمیری مجاہد بھی جاگ پڑے تھے۔ انہوں نے خفیہ تہہ خانے سے باہر آ کر باجماعت
نماز ادا کی۔ نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور آزادیٔ کشمیر کی دعا مانگی۔ وہیں ناشتہ تیار
ہونے لگا۔ گل میر نے سجان بٹ کو ساتھ لیا اور تہہ خانے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسد بٹ بھی
اس کے ساتھ تھا۔ سجان بٹ ڈائنامیٹ لگانے میں بڑا ماہر تھا۔ ویسے تو اسد بٹ اور گل
میر کو بھی ڈائنامیٹ لگانے کی خاصی ٹریننگ ملی ہوئی تھی مگر سجان بٹ نے اس کام میں بڑی
مہارت حاصل کر رکھی تھی۔

گل میر نے سجان بٹ سے کہا۔

"سرینگر میں بھارتی فوج کا دباؤ زیادہ ہے۔ اس لئے بھی کہ وہ کشمیر
کا صدر مقام ہے اور وہاں اخباری نمائندے بھی موجود رہتے ہیں۔
بھارتی حسب سابق کرفیو کے دوران مسلمانوں کے گھروں کو آگ
لگاتے ہیں اور ان کی گرفتاریاں کرتے اور انہیں شوٹ کرتے ہیں۔

جموں سے انہیں برابر اسلحہ پہنچتا رہتا ہے۔ ہمارے آدمیوں نے
ہمیں اطلاع دی ہے کہ جموں سے ساتویں ڈوگرہ بریگیڈ کے تیرہ
ٹرکوں کا ایک کانوائے آج رات کسی وقت سرینگر کی طرف چلنے والا
ہے۔ وہ بہرحال کل دوپہر کے بعد کسی وقت قاضی کنڈ کے چشموں
پر رکے گا۔ صرف یہی ایک مقام ایسا ہے' جہاں ہم ان تیرہ کے تیرہ
بھارتی ایمونیشن ٹرکوں کو صاف کر سکتے ہیں"۔

سجان بٹ بڑی توجہ سے گل میر کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے آگے اسد بٹ نے اپنی
پوری سکیم سجان بٹ کو بیان کی تو وہ مسکرایا۔ اس نے اسد بٹ کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے
ہوئے کہا۔

"اچھی سکیم ہے"۔

"پھر کیا خیال ہے؟"۔ گل میر نے سوال کیا۔

سجان بٹ بولا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میرا اپنا ایک مشن مکمل ہو چکا ہے۔
میں کل کے مشن کے لئے تیار ہوں"۔

اسد بٹ نے کہا۔

"ہمیں چھوٹے پنسل سائز کے ٹائم بموں کی ضرورت ہو گی"۔

سجان بٹ نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"سب انتظام ہو جائے گا۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ بھارتی فوجیوں
سے چھینے ہوئے ٹائم بم انہی کا صفایا کرنے کے لئے استعمال کریں
گے"۔

حاتم بٹ چائے سے بھری ہوئی چینک اور پیالیاں لے کر آ گیا۔ گل میر نے جب سجان
بٹ سے یہ پوچھا کہ کیا قاضی کنڈ کا چائے والا قادری ہمارا آدمی ہے تو سجان بٹ نے کسی
قدر جوشیلے انداز میں کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہم اپنے دین اسلام اور آزادیٔ کشمیر کی
جنگ لڑ رہے ہیں۔ وادیٔ کشمیر کا ہر بچہ' جوان بوڑھا ہمارے ساتھ

ہے۔ ہمارا اپنا آدمی ہے۔ ہم آزادئ وطن اور ناموس دین کی خاطر
اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ قادری بھی محب وطن
کشمیری ہے۔ مسلمان ہے۔ وہ ہمارا اپنا آدمی کیوں نہیں ہے؟ کیسے
نہیں ہے؟"۔

گل میر کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ اس نے ایک ایسی بات کہہ دی ہے جو اسے نہیں
کرنی چاہیے تھی مگر وہ بھی مجبور تھا کیونکہ اس وادئ کشمیر میں بعض گمراہ مسلمان ایسے
بھی تھے جو بھارتی حکومت کے لئے کام کر رہے تھے۔ اس نے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے
کہا۔

"سجانا! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ہم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ
کشمیر کا ہر مسلمان اسلام کی خاطر بھارتی حکومت کے جبر و استبداد کی
دیوار سے ٹکرانے اور اسے پاش پاش کرنے پر تلا ہوا ہے اور
حالت جنگ میں ہے۔ پھر بھی ہمیں قادری سے پہلے بات کر لینی
چاہیے"۔

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں پہلے قادری سے جا کر بات کر لوں گا
لیکن اس مشن کے لئے ہمیں آج بعد دوپہر یہاں سے قاضی کنڈ
کے چشموں کی طرف کوچ کر دینا ہو گا۔ سفر دشوار گذار اور طویل
ہے"۔

اسد بٹ بولا۔

"سوال ڈائنامائیٹ کے پنسل بموں کا ہے"۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ میں ابھی جاتا ہوں۔ دوپہر سے پہلے پہلے سارا
ضروری ایمونیشن لے کر واپس آ جاؤں گا"۔

یہ کہہ کر سجان بٹ چائے پینے لگا۔

چائے پینے کے بعد سجان بٹ چلا گیا۔ دوپہر کو سب کشمیری مجاہدوں نے تہہ خانے میں مل
کر کھانا کھایا۔ کھانا کیا تھا۔ وہی جوار کی موٹی روٹی گڑ کے ساتھ کھائی اور اپنے اپنے طے
شدہ مشن پر روانہ ہو گئے۔ چٹان والی خفیہ کمین گاہ میں صرف حاتم بٹ، اسد بٹ اور گل

میر ہی رہ گئے تھے۔ دو مجاہد کمین گاہ کے باہر جھاڑیوں میں نگرانی کر رہے تھے۔

دوپہر کے بعد سجان بٹ آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ تین ٹٹو لایا تھا۔ ایک تھیلا بھی تھا۔ ٹٹو اس
نے کمین گاہ کے باہر باندھے اور تھیلا کاندھے پر ڈالے تہہ خانے میں آ گیا۔ تھیلے میں دو
درجن پنسل بم، تین آٹومیٹک رائفلیں اور بے شمار راؤنڈ تھے۔ یہ سارا اسلحہ نمبر دس
کماؤں رجمنٹ کے ڈپو سے لوٹا ہوا تھا۔

اسد بٹ اور گل میر پنسل بموں کو غور سے دیکھنے لگے۔ یہ بم بالکل ایک بال پوائنٹ کی
طرح کے تھے۔ ان کی ٹوپی کے پہلو میں ایک ننھا سا سرخ نقطہ یا بٹن لگا تھا۔

سجان بٹ کہنے لگا۔

"ہر پنسل بم کا ٹائم پچیس منٹ طے ہے۔ اس کی ٹوپی کا یہ سرخ
بٹن دبانے سے اس کے اندر لگا ہوا ننھا سا کلاک چل پڑے گا اور
پچیس منٹ بعد بم پھٹ جائے گا"۔

اسد بٹ نے سوال کیا کہ کیا اس کے دھماکے سے ایک فوجی ٹرک اڑ سکے گا؟ اس پر سجان
بٹ مسکرایا۔

"اسد! یہ تم کہہ رہے ہو؟ شاید تم نے اس بم کی تباہ کاریاں دیکھی
نہیں ہیں۔ ہے تو یہ بڑا چھوٹا سا مگر اس قدر طاقتور بم ہے کہ اس
کے پھٹنے سے سرینگر کی پوری عمارت تباہ ہو سکتی ہے۔ یہ پنسل بم
بھارت کے شہر مدراس کی آرڈیننس فیکٹری میں تیار ہوتے ہیں اور
بھارتی تخریب کاروں کو دیئے جاتے ہیں جو پاکستان اور سری لنکا میں
جا کر تخریب کاری کر رہے ہیں"۔

گل میر بولا۔ "یہ دو درجن ہیں"۔

"ہاں"۔ سجان بٹ نے کہا۔ "فوجی ٹرک تیرہ ہیں۔ ایک ٹرک
کے لئے ایک بم کافی ہو گا۔ میں احتیاط کے طور پر دو درجن لے آیا
ہوں۔ اب ہمیں یہاں سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جانا
چاہیے۔

پندرہ منٹ کے بعد یہ تینوں کشمیری حریت پسند مجاہد کمانڈو یعنی اسد بٹ، سجان

بٹ اور گل میر ٹٹوؤں پر سوار پہاڑی جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ ان کی منزل اوپر بانہال سے سرینگر آتی پہاڑی سڑک پر قاضی کنڈ کے چشمے تھے۔

یہ خفیہ جنگلی راستے ان کے دیکھے بھالے تھے۔ یہ بڑے خطرناک پہاڑی راستے تھے۔ ڈھلان اتنی تھی کہ انہیں ٹٹوؤں کو بڑی احتیاط اور مہارت کے ساتھ پہاڑی پگ ڈنڈیوں پر سے گزارنا پڑتا تھا۔ سفر لمبا تھا۔ ان کا مشن اگلے روز دوپہر سے پہلے شروع ہونے والا تھا۔ پھر بھی وہ رکے بغیر چلے جا رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے بہت کم بات کر رہے تھے۔ کمانڈوز کو خاص ہدایت ہوتی ہے کہ وہ مشن پر روانہ ہونے کے بعد راستے میں فاصلہ رکھ کر چلیں اور اشد ضرورت کے وقت ہی ایک دوسرے سے بات کریں اور یہ تینوں کشمیری مجاہد بڑے تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔ وہ کئی دنوں تک جنگل میں صرف فاضل جڑی بوٹیاں اور پتے کھا کر زندہ رہ سکتے تھے مگر ابھی ان کے پاس جوار کی روٹیاں اور گڑ موجود تھا۔

چلتے چلتے جب شام ہونے لگی تو وہ ایک پہاڑی سے اتر کر وادی میں آ گئے تھے۔ یہاں سے آگے پھر ایک پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ انہیں اس طرح دو پہاڑوں کو عبور کر کے اپنی منزل قاضی کنڈ پر پہنچنا تھا۔ رات انہوں نے دوسرے پہاڑ کی چوٹی پر ایک جگہ بسر کی۔ رات کے پہلے پہر گل میر نے گارڈ کی ڈیوٹی دی۔ دوسرے پہر اسد بٹ اور پچھلے پہر سے سورج نکلنے تک سبحان بٹ نے پہرے داری کی۔ صبح صبح انہوں نے ایک چشمے پر وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ اللہ کے حضور اپنے مشن کی کامیابی کی دعا مانگی۔ گڑ کے ساتھ تھوڑی تھوڑی روٹی کھائی اور اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ اب ان کے راستے میں صرف ایک پہاڑ تھا جس کے پہلو سے سرینگر سے بانہال بٹوت جانے والی اور ادھر سے سرینگر آنے والی پہاڑی سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی گزرتی تھی۔ پہاڑی ٹٹو لگی بندھی رفتار کے ساتھ پتھریلے راستوں پر سے گزر رہے تھے۔

سبحان بٹ مختصر ترین پہاڑی راستے سے انہیں لے جا رہا تھا۔ ابھی دن کے بارہ نہیں بجے تھے کہ انہیں اپنی بائیں جانب قاضی کنڈ کے چشموں والا لاری اڈہ اور وہاں کی دکانوں کی چھتیں نظر آنے لگیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سبحان بٹ نے کہا۔

"ہم عقب کی طرف سے سڑک پر نکلیں گے لیکن تمہیں نیچے ہی ٹھہرنا ہو گا۔ قادری سے میں خود جا کر بات کروں گا"۔

اور ایسا ہی ہوا۔ جب تینوں کشمیری کمانڈو قاضی کنڈ کی سڑک کے نیچے ڈھلان پر پہنچ گئے تو انہوں نے اخروٹ کے ایک گھنے درخت کے نیچے اپنے ٹٹو باندھے۔ سبحان بٹ نے کہا۔

"میں اوپر قادری کے پاس جاتا ہوں۔ تم دونوں میرے واپس آنے تک یہیں بیٹھے رہو۔ اسلحہ والے تھیلے کا خیال رکھنا"۔

یہ کہہ کر سبحان بٹ چڑھائی چڑھ کر قاضی کنڈ کی سڑک پر نکل آیا۔ سامنے لاری اڈہ تھا جہاں بٹوت سے آنے والی ایک لاری کھڑی تھی۔ پیچھے ایک فوجی جیپ بھی کھڑی تھی جس میں ایک ڈوگرہ فوجی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ پہاڑ کی دیوار میں سے قدرتی چشموں کا پانی تین شگافوں میں سے ابل ابل کر نیچے ایک حوض میں گر رہا تھا۔ دو لڑکے اس حوض میں سے بالٹیاں بھر بھر کر لاری کو دھو رہے تھے۔

سبحان بٹ نے کمبل کی بکل ماری ہوئی تھی۔ سر پر گرم اونی ٹوپی تھی جو کانوں سے بھی نیچے تک آئی ہوئی تھی۔ قادری اپنی چائے کی دکان پر بیٹھا چائے بنا رہا تھا۔ اس کے نوکر گاہکوں کو چائے اور بسکٹ پیسٹری دے رہے تھے۔ چھوٹی سی دکان تھی جہاں پرانی بوسیدہ میزوں کے گرد کچھ گاہک بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی۔ قادری نے دور سے سبحان بٹ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ سبحان بٹ ضرور کسی خاص مشن پر وہاں آیا ہے۔ قادری ایک سیدھا سادا سچا کشمیری محب وطن مسلمان تھا۔ اسے بھی دوسرے کشمیری مسلمانوں کی طرح اس حقیقت کا شدت سے احساس تھا کہ بھارتی حکومت نے وادی کے مسلمانوں کی مرضی کے خلاف زبردستی کشمیر پر قبضہ کر رکھا ہے اور وہ فوجی قوت کے بل بوتے پر کشمیری مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں۔ قادری بھی کشمیر کو بھارتی فوجی قبضے سے نجات دلانے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے کو ہر لمحے تیار تھا۔ اس کا احساس سبحان بٹ کو بھی تھا۔ اس لئے وہ پورے اعتماد کے ساتھ قادری کے پاس آیا تھا۔

قادری سبحان بٹ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ سبحان بٹ نے جان بوجھ کر قادری سے زیادہ بات نہ کی۔ صرف رسمی سا سلام علیک لے کر وہ میز کے پاس بوسیدہ سی کرسی پر

بیٹھ گیا اور اپنی ہتھیلیوں کو رگڑتے ہوئے گرم کرتے ہوئے بولا۔

"چائے پلا دو قادری بھائی"۔

قادری نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ ایک لڑکا سبحان بٹ کے آگے چائے کا کپ رکھ کر چلا گیا۔ سبحان بٹ خاموشی سے چائے پینے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ ماحول کا جائزہ بھی لینے لگا۔

چشموں کے حوض کی ایک طرف جو فوجی جیپ کھڑی تھی اس کے فوجی ڈرائیور نے چائے پی کر کپ لڑکے کو دیا اور جیپ سٹارٹ کر کے بانہال کی طرف اوپر کی جانب روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ گاہک بھی اٹھ کر اپنی اپنی منزلوں کی طرف چل دیئے۔ اب چائے کی دکان میں صرف دو تین کشمیری گاہک ہی بیٹھے تھے جو کسان یا مزدور قسم کے لوگ تھے۔ پھر بھی سبحان بٹ بے حد احتیاط سے کام لے رہا تھا اور اس نے ابھی تک قادری سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

چائے کے دو چار گھونٹ لینے کے بعد وہ یہ کہہ کر اٹھا کہ قادری بھائی چائے میں میٹھا کم کیوں ڈالا ہے اور قادری کے قریب جو چینی کا ڈبہ پڑا تھا' اس میں سے چینی نکال کر کپ میں ڈال کر ہلانے لگا۔ ساتھ ہی سرگوشی کی۔

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے نیچے اخروٹ کے درخت کی چھاؤں میں آ جاؤ۔ بڑا اہم کام ہے"۔

پھر اونچی آواز میں بولا۔

"قادری تمہاری چائے بڑی دور سے ہمیں کھینچ لاتی ہے"۔

سبحان بٹ واپس بوسیدہ کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ چائے کا کپ خالی کیا۔ اٹھ کر قادری کو پیسے دیئے اور کمبل کی بکل مارتے ہوئے دکان سے باہر نکل گیا۔ وہیں سے ڈھلان اترنے کی بجائے سبحان بٹ کافی آگے سڑک پر چلتا گیا پھر ایک جگہ سے نیچے ڈھلان اترنے لگا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی بے شمار جنگلی جھاڑیاں تھیں ان کے اندر کوئی آدمی چل رہا ہو تو اوپر سڑک پر سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اخروٹ کے درخت تلے اسد بٹ اور گل میر یوں بیٹھے تھے۔ جیسے سفر کرتے کرتے تھک گئے ہوں اور ستا رہے ہوں۔ سبحانی بٹ نے جاتے ہی کہا۔

"قادری آ رہا ہے۔ میں نے اسے نیچے بلایا ہے"۔

اسد بٹ اور گل میر نے کوئی بات نہ کی۔ اخروٹ کی شاخوں میں سے سرد ہوا کے جھونکے پتوں کو گراتے گزر رہے تھے۔ اتنے میں قادری بھی آ گیا۔ اس نے اسد بٹ اور گل میر کے ساتھ بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور بولا۔

"مجھے شک تھا کہ تم بھی سبحانے کے ساتھ ہی ہو گے۔ لگتا ہے کوئی بڑا زبردست کام کرنے والے ہو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں میرے بچو"۔

سبحان بٹ نے کہا۔

"قادری ہمیں تمہاری دعاؤں کے ساتھ تمہارے تعاون کی بھی ضرورت ہے"۔

قادری نے سینے پر ہاتھ رکھا اور جذباتی لہجے میں بولا۔

"اسلام کے لئے کشمیر کے لئے میری جان بھی حاضر ہے"۔

سبحان بٹ نے جھاڑیوں کے نیچے قادری کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اسد بٹ اور گل میر بھی ساتھ تھے۔ گل میر نے قادری کو اپنے مشن کی تمام تفصیلات بتا دیں۔ قادری بڑے غور سے سنتا رہا۔

سبحان بٹ نے کلائی پر لگی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہمارے اندازے کے مطابق بھارتی فوجی ٹرکوں کا کانوائے چار بجے تک یہاں پہنچ جائے گا۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنی دکان کے دو آدمیوں کو کسی کام سے شہر بھجوا دو۔ ان کی جگہ ہم تینوں نوکروں کا بھیس بنا کر تمہاری دکان پر آ جائیں گے اور اڈے پر کھڑی ہونے والی لاریوں اور فوجی گاڑیوں کو بھی ہم ہی پانی ڈالیں گے"۔

قادری بولا۔

"میں ابھی اپنے دو آدمیوں کو شہر بھجوائے دیتا ہوں۔ تم دو بجے کے بعد میرے ہاں پہنچ جانا۔ میرے گاہک بدلتے رہتے ہیں۔ تمہیں یہاں کوئی جانتا بھی نہیں ہے"۔

سجان بٹ نے کہا۔

"میں اپنا حلیہ تھوڑا بدل لوں گا کیونکہ مجھے تمہارے دو ایک گاہکوں نے دکان پر دیکھ لیا ہے"۔

قادری نے پوچھا۔

"ٹرکوں میں دھماکے کہاں جا کر ہوں گے؟"۔

گل میر نے کہا۔

"تمہارے اندازے کے مطابق فوجی کانوائے اڈے پر کتنی دیر کھڑا رہتا ہے"۔

قادری نے تھوڑا سوچ کر جواب دیا۔

"فوجی کانوائے اکثر گزرتے رہتے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ گاڑیاں چشموں کے پاس کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ ہمارے لڑکے ان کے ریڈی ایٹروں اور ٹائروں پر پانی ڈالتے ہیں۔ سامنے والے شیشوں کی صفائی کرتے ہیں۔ اتنی دیر میں فوجی دکان کے باہر یا اندر بیٹھ کر یا باہر کھڑے ہو کر چائے وغیرہ پیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کانوائے آدھ گھنٹے تک رکا رہتا ہے"۔

اسد بٹ اور گل میر نے سجان بٹ کی طرف دیکھا۔ سجان بٹ اپنی خشخشی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم آخری وقت بم لگائیں گے تاکہ ٹرک قاضی کنڈ کے چشموں سے کافی آگے جا کر پھٹیں"۔

قادری نے کسی قدر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اگر آخری وقت میں تم لوگوں کو موقع نہ مل سکا تو؟"۔

اسد بٹ مسکرایا۔

"یہ تم ہم پر چھوڑ دو کاکا۔ ہم موقع نکال لیں گے"۔

قادری اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔ مجھے دو نوکروں کو شہر بھجوانا ہے"۔

قادری کے جانے کے بعد سجان بٹ نے تھیلے میں سے وہ پرانے اور میلے کچیلے کپڑے نکالے جو عام طور پر کشمیر کے پہاڑی چائے خانوں میں نوکر پہنے ہوتے ہیں۔ سجان بٹ کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اس نے قینچی سے انہیں کتر کر چھوٹا کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ان تینوں کے حلیے بدلے ہوئے تھے۔ وہ تینوں نوکروں والے پرانے بوسیدہ لباس میں تھے۔ ان کے گھٹنوں سے نیچے تک آتے فرن کافی پرانے لگتے تھے۔ اس قسم کے فرن کشمیر میں عام طور پر پہنے جاتے ہیں۔ سجان بٹ نے اس لباس کا انتخاب اس لئے بھی کیا تھا کہ ان کی لمبی لمبی جیبیں تھیں جن میں ہر کمانڈو دو دو پنسل بم چھپا سکتا تھا۔ سروں پر انہوں نے میلی کچیلی کشمیری ٹوپیاں جمالی تھیں۔ ٹھیک وقت پر وہ الگ الگ ہو کر پہاڑی چڑھائی چڑھنے لگے۔ تینوں الگ الگ جگہوں پر سے سڑک پر نکلے۔ قادری کے چائے خانے میں صرف ایک بوڑھا کشمیری گاہک بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ لاری اڈہ بھی خالی تھا۔ تینوں کمانڈو بڑی تیز تیز چلتے قادری کی دکان میں گھس گئے اور اندر آتے ہی انہوں نے نوکروں کی طرح کام کرنا شروع کر دیا۔ سجان بٹ میز صاف کرنے لگا۔ اسد بٹ بالٹی کے پاس پڑی چینکیں دھونے لگا اور گل میر انگیٹھی میں پنکھے سے ہوا دینے لگا۔ قادری گدی پر بیٹھا دودھ کے پتیلے میں خوانچہ چلاتا رہا۔

کسی کو پتہ نہ چلا کہ قادری کی دکان کے نوکر بدلے جا چکے ہیں اور اب جو تین نوکر وہاں بڑی بے نیازی سے کام کر رہے ہیں وہ کشمیر کے تربیت یافتہ کمانڈو ہیں۔ ٹٹوؤں کو سجان بٹ نے چھوڑ دیا تھا کہ وہ جدھر چاہیں نکل جائیں۔۔ ہر کمانڈو کی جیب میں پانچ پانچ پنسل بم اور ایک ایک پستول موجود تھا۔ یہ پستول ایسے تھے کہ ان کے آگے سائی لینسر لگے تھے۔ جس کی وجہ سے گولی چلنے سے دھماکے کی آواز نہیں آتی تھی۔ ان میں سے ہر کمانڈو اپنے اپنے کام میں لگا تھا۔ کوئی ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہا تھا۔ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ اتنے میں جموں کی طرف سے ایک لاری آ کر اڈے پر چشموں کے پاس رکی۔ یہ بہار کا سیزن نہیں تھا۔ اس لئے جموں کی طرف سے لاریاں اکثر خالی آتی تھیں۔ زیادہ تر ان میں مقامی کسان اور مزدور ہی سوار ہوتے تھے۔ قادری نے سجان بٹ اور گل میر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ دونوں کمانڈوؤں نے ٹین کی بالٹیاں اٹھائیں اور لاری کے پاس آ کر ان کے ٹائروں پر پانی ڈالنا شروع کر دیا۔ اسد بٹ بھی بالٹی

لے کر آ گیا۔ وہ لاری کے بونٹ پر چڑھ گیا اور گیلا کپڑا نچوڑ کر لاری کی ونڈ سکرین کی صفائی کرنے لگا۔ لاری ڈرائیور سکھ تھا۔ اس نے ہنس کر کہا۔

"اوئے دھیان سے اوئے جواناں ---- وائپر تو اوپر اٹھالو"۔

اسد بٹ وائی پر اوپر اٹھانا بھول گیا تھا۔ اس نے جلدی سے وائی پر کا اندر سے بٹن دبا کر اسے اوپر اٹھا دیا اور جلدی جلدی بڑی محنت سے شیشے کو رگڑنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد لاری سرینگر کی طرف روانہ ہو گئی۔ تینوں کمانڈو قادری کے چائے خانے میں آ کر گاہکوں کو چائے وغیرہ دینے لگے۔ ایک گاہک نے قادری سے پوچھا ہی لیا۔

"کاکا! یہ نئے نوکر رکھے ہیں؟"۔

قادری نے فوراً جواب دیا۔

"دونوں لڑکے شہر گئے ہوئے ہیں۔ یہ اپنے گاؤں کے ہیں۔ کہنے لگے ہم دیہاڑی لگا دیتے ہیں"۔

دو فوجی جیپیں دکان کی سامنے چشموں کے پاس آ کر رکیں۔ ان میں چھ سات انڈین فوجی بیٹھے تھے۔ گل میر نے بالٹی اٹھائی اور جیپوں کی طرف بڑھا۔ اسد بٹ بھی اس کے پیچھے چلا۔ سجان بٹ دکان میں ہی رہا۔ یہ ڈوگرہ فوجی تھے۔ گل میر نے بالٹی میں پانی ڈالا اور جیپ کے ٹائروں کو کپڑے سے صاف کرنا شروع کر دیا۔ دوسری جیپ کی اسد بٹ نے صفائی شروع کر دی۔

فوجی ڈرائیور نے ریڈی ایٹر کا کیپ کھول دیا اور بولا۔

"او جانگلی ادھر پانی ڈالو۔ دیکھتے نہیں، ریڈی ایٹر ابل رہا ہے"۔

"اچھا جی۔ اچھا جی"۔

یہ کہتا اسد بٹ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے لگا۔ یہ ڈوگرہ فوجی ساتویں ڈوگرہ رجمنٹ کے تھے اور جو تیرہ ٹرک پیچھے آ رہے تھے۔ یہ ان کے پائیلٹ تھے۔ اس بات کو گل میر نے بھی سمجھ لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گل میر نے ڈوگرہ فوجیوں کے کاندھوں کی پٹیوں پر انگریزی میں سات ڈوگرہ رجمنٹ لکھا ہوا پڑھ لیا تھا۔ وہ بالٹی میں پانی لینے چشمے کے حوض پر آیا تو گل میر بھی وہاں پانی بھر رہا تھا۔ اسد بٹ نے سرگوشی میں کہا" -- یہ کانوائے کی جیپیں ہیں"۔

گل میر نے سن لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ پانی کی بالٹی لے کر جیپ کے پاس آ کر اور اس کا بونٹ گیلے کپڑے سے چمکانے لگا۔

ڈوگرہ فوجی چائے پیتے ہوئے ایک دوسرے سے مذاق بھی کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر وہاں رکنے کے بعد وہ آگے روانہ ہو گئے۔ اب تینوں کمانڈو الرٹ ہو گئے تھے۔ کیونکہ ساتویں ڈوگرہ رجمنٹ کے تیرہ فوجی ٹرک کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی نظریں جموں والی سڑک کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ آگے سڑک کی چڑھائی شروع ہوتی تھی اور ایک پہاڑی موڑ بھی تھا۔ اسی موڑ پر فوجی ٹرکوں کو نمودار ہونا تھا۔ سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ کانوائے ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ سجان بٹ کونے میں زمین پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ گل میر میز پر سے پیالیاں اٹھا رہا تھا۔ اسد بٹ دکان کے آگے جھاڑو دے رہا تھا کہ دور اوپر پہاڑی کے موڑ پر اسے ایک فوجی ٹرک نظر پڑا۔ اس کے پیچھے دوسرا اور پھر تیسرا ٹرک بھی دکھائی دیا۔ وہ جھاڑو دیتے ہوئی سجان بٹ کے قریب آیا اور آنکھوں سے اوپر سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

سجان بٹ سمجھ گیا۔ اس نے اٹھ کر حمام کی ٹونٹی کھول کر پیالی دھوتے ہوئے پیچھے پہاڑی کی طرف دیکھا۔ سڑک پر فوجی ٹرکوں کی ایک قطار آہستہ آہستہ چلتی قاضی کنڈ کی طرف آ رہی تھی۔ اب گل میر نے بھی ٹرک دیکھ لئے۔ ڈوگرہ رجمنٹ کے ایمونیشن اور مارٹر توپوں سے لدے تیرہ فوجی ٹرکوں کا کانوائے پہنچ گیا تھا جس گھڑی کا انہیں انتظار تھا آخر وہ گھڑی آ گئی تھی۔

قادری نے بھی گدی پر بیٹھے بیٹھے ٹرکوں کو دیکھا اور پھر جلدی جلدی چائے کی خالی چینکیں اوپر سے اتارنے لگا اور سجان بٹ سے کہا۔

"جلدی کرو بھئی۔ ہمارے فوجی بھائی آ رہے ہیں۔ پیالیاں لگا دو یہاں۔"

سجان بٹ نے فوراً پندرہ بیس پیالیاں میزوں پر سجا دیں۔ قادری چائے کے پتیلے میں دودھ ڈال کر کفگیر چلانے لگا جونہی ایک ایک کر کے فوجی ٹرک سامنے چشموں کے حوض کے آگے ایک قطار میں آ کر کھڑے ہوئے، قادری نے چینکوں میں گرم گرم چائے ڈالنی شروع کر دی۔ لکڑی کے طشتوں میں کیک پیسٹری کی تھالیاں بھی سجا دی گئی تھیں۔ ڈوگرہ

فوجی ٹرکوں سے اتر کر ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ان کے کمانڈنگ افسر نے ایک نظر انہیں دیکھا اور اپنی گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔

"صرف بیس منٹ ہم یہاں چائے پانی کے لئے رکیں گے"۔

ڈوگرہ فوجی چائے کی دکان کی طرف بڑھے۔ کچھ اندر بیٹھ گئے۔ کچھ باہر لکڑی کے کھوکھوں اور چارپائیوں پر بیٹھ گئے اور چائے پینے' پیسٹریاں کھانے اور سگریٹ اڑانے اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ اتنی دیر میں اسد بٹ اور گل میر بالٹیاں گیلے رومال وغیرہ لے کر چشمے کے حوض پر پہنچ گئے تھے۔ ان کے خطرناک مشن کا ایکشن شروع ہو چکا تھا۔ فوجی ٹرک کافی بڑے بڑے تھے۔ ایک طرف آدمی چلا جائے تو دوسری طرف سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اسد بٹ اور گل میر ٹرکوں کے بونٹ اور ٹائر صاف کرنے لگے۔ ٹرکوں میں کوئی ڈرائیور نہیں تھا۔ صرف ایک ایک سپاہی ہر ٹرک کے آگے رائفل لئے پہرہ دے رہا تھا۔ ٹرکوں کو ترپالوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں سبحان بٹ بھی بالٹی لے کر وہاں آ گیا۔ تینوں کمانڈو بڑے فرمانبردار اور انجان نوکروں کی طرح فوجی ٹرکوں کے ٹائر بونٹ اور ونڈ سکرینیں صاف کر رہے تھے۔ کوئی ان کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ یہ تو روز کی بات تھی۔ فوجی ٹرک وہاں آ کر رکتے تھے اور چائے خانے کے نوکر حوض کے پانی سے ٹرکوں کو دھو ڈالتے' ریڈی ایٹروں کا پانی بدلتے' بونٹ صاف کرتے' شیشے چمکاتے۔ گویا ٹرکوں' لاریوں کو پھر سے تازہ دم کر دیتے۔ چائے خانے میں ڈوگرہ فوجی چائے وغیرہ پینے میں مشغول تھے۔ قادری خود ان کے آگے چیزیں رکھ رہا تھا۔ ڈوگرہ کمانڈنگ افسر دکان کے باہر ایک طرف لوہے کی کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں چائے سے بھرا ہوا کپ تھا۔ اس کا ساتھی جو کیپٹن تھا اس کے پاس ہی ایک کھوکھے پر بیٹھا چائے پیتے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔

یہ کل تیرہ فوجی ٹرک تھے۔ ان میں ایمونیشن اور مارٹر گنیں لدی ہوئی تھیں۔ تینوں کمانڈوز نے لاریاں دھونے والوں کے بھیس میں ان کے تین حصے بنا لئے تھے۔ اسد بٹ سب سے پچھلے ٹرک کی طرف سے شروع ہوا۔ گل میر درمیان والے ٹرک کو دھونے لگا اور سبحان بٹ نے سب سے آگے کے ٹرک کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس

نے سب سے پہلے ٹرک کے بونٹ کو گیلے کپڑے سے صاف کیا پھر اس کے ونڈ سکرین کو رگڑ رگڑ کر چمکایا۔ ٹرک کے پہلو کی جانب کھڑا ڈوگرہ فوجی اسے دیکھ رہا تھا۔ سبحان بٹ نے بھی ڈوگرے کو دیکھا اور نوکروں کی طرح سلام کر کے بولا۔

"صاحب بخشش زیادہ ملے گا ناں؟"۔

ڈوگرے فوجی کا چہرہ کرخت تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سبحان بٹ خود احمقوں کی طرح ہنسا اور بالٹی میں گیلا کپڑا بھگو بھگو کر ٹرک کے ٹائروں کو دھونا شروع کر دیا۔ یہی نازک گھڑی تھی۔ سبحان بٹ ٹرک کی اوٹ میں تھا۔ اسے ڈوگرہ فوجی نظر نہیں آ رہا تھا سبحان بٹ کام کرتے ہوئے پرانا کشمیری لوک گیت بھی گا رہا تھا۔

ٹرک میں بہت سے ٹائر لگے تھے۔ یہ کافی ہیوی ٹرک تھے۔ جونہی سبحان بٹ ایک ٹائر کو دھو کر دوسرے ٹائر کے پاس آیا اس نے ایک نظر دائیں بائیں ڈالی اور بجلی ایسی تیزی کے ساتھ اپنے فرن یعنی لمبے کرتے کی جیب سے پنسل بم نکالا اور ٹائروں کے اوپر مڈگارڈ کے اندر لگا دیا۔ پنسل بم میں میگنٹ تھا جو مڈگارڈ سے لگتے ہی چپک گیا۔ بم لگانے سے پہلے سبحان بٹ نے اس کی کیپ کا ننھا سا سرخ نقطہ دبا دیا تھا۔ ایک ٹرک میں بم لگانے کی بعد وہ دوسرے ٹرک کی طرف چلا گیا۔ یہاں بھی ٹرک کی دوسری طرف یعنی سڑک کی جانب ڈوگرہ سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ سبحان بٹ نے اسے سلام کیا اور کشمیری گیت گنگناتا ہوا دوسرے ٹرک کا بونٹ صاف کرنے لگا۔ پھر شیشے کو چمکایا۔ اس کے بعد نیچے اتر کر ٹرک کے ٹائر دھونے لگا۔ جونہی ڈوگرہ سپاہی اس کی نظروں سے اوجھل ہوا سبحان بٹ نے دو پنسل بم ٹائروں کے اوپر مڈگارڈ میں چپکا دیئے۔ دوسری طرف اسد بٹ اور گل میر بھی اپنا کام بڑی احتیاط کے ساتھ کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی عقبی اور درمیان والے ٹرکوں کے مڈگارڈوں کے اندر پنسل نما بم چپکا دیئے تھے۔ کسی کو ان پر ذرا سا بھی شک نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ روز کا معمول تھا کہ لاریاں اور فوجی ٹرک جموں سے آ کر وہاں رکتے تھے اور یہ ملازم ٹرکوں کے ٹائروں کو دھوتے تھے۔ اسد بٹ' سبحان بٹ اور گل میر نے بھی ٹرکوں کے ریڈی ایٹروں کا گرم پانی بدل دیا تھا۔

گل میر اور اسد بٹ نے اپنا کام ختم کر دیا تھا۔ ان کی جیبوں میں جتنے پنسل بم تھے انہوں نے سب کے سب اپنے حصے کے فوجی ٹرکوں میں لگا دیئے تھے۔ سبحان بٹ کی جیب

بھی بموں سے خالی ہو چکی تھی۔ صرف ایک پستول اس کی جیب میں تھا۔ ایسا ہی ایک ایک پستول اسد بٹ اور گل میر کی جیبوں میں بھی تھا۔ گل میر اور اسد بٹ اب گیلے کپڑے کو نچوڑ کر ٹرکوں کے بونٹوں کو چمکا رہے تھے۔ فوجی چائے وغیرہ پی کر دکان سے باہر نکل آئے تھے۔ کوئی انگڑائیاں لے رہا تھا۔ کوئی سگریٹ پی رہا تھا۔ کوئی اپنے ساتھی کو آواز دے رہا تھا۔ کمانڈنگ آفیسر بھی کرسی چھوڑ کر اپنے ٹرک کے قریب آگیا تھا۔ سجان بٹ دوسرے ٹرک کے بونٹ کو صاف کر رہا تھا کہ اس کے کھلے کرتے میں چھپایا ہوا پستول جھول کھاتا ہوا بونٹ سے ٹکرایا۔ اس سے آواز پیدا ہوئی۔ اس آواز نے ڈوگرہ فوجی کو اس کی طرف متوجہ کر دیا۔

"تمہاری جیب میں کیا ہے؟؟"

ڈوگرہ سجان بٹ کے قریب آگیا۔ سجان بٹ نے حواس کو اپنے قابو میں رکھا۔ احمقوں کی طرح ہنستے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں صاحب، کچھ نہیں"

ڈوگرہ فوجی نے اس پر رائفل تان دی۔

"نکالو جیب میں کیا ہے۔"

گل میر اور اسد بٹ نے دیکھ لیا کہ ڈوگرہ سجان بٹ پر رائفل تانے ہوئے ہے۔ جب ڈوگرہ سپاہی نے آگے بڑھ کر سجان بٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو گل میر نے اسد بٹ کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ دونوں کھسکتے ہوئے پیچھے ہو گئے۔ پیچھے چشمے والی دیوار تھی جہاں تین شگافوں میں سے پانی نیچے حوض میں گر رہا تھا۔ اس دیوار کی ساتھ جنگلی گھاس میں سے تنگ راستہ اوپر کو جاتا تھا۔ اسد بٹ اور گل میر جانتے تھے یہ راستہ آگے کدھر جاتا ہے۔ وہ گیلا کپڑے کو نچوڑتے ہوئے اس تنگ راستے پر چڑھ گئے جیسے جھاڑیوں پر گیلے کپڑے ڈالنے جا رہے ہوں۔ اتنی دیر میں آگے کے ٹرکوں سے اونچی اونچی کرخت فوجی آوازیں آنے لگیں۔

"ہینڈز اپ۔ ہاتھ اوپر۔ پستول ہے سر اس کے پاس"۔

سجان بٹ کی جیب سے سائی لینسر لگا پستول برآمد ہو گیا تھا۔ سجان بٹ کو اب صرف یہ فکر تھی کہ کہیں فوجیوں کو یہ علم نہ ہو جائے کہ ان کے ٹرکوں کے مڈگارڈوں کے اندر

پنسل بم لگے ہیں۔ سجان بٹ نے اداکاری کرتے ہوئے ہاتھ باندھ لئے اور ڈوگرہ کمانڈنگ آفیسر کے قدموں میں گرتے ہوئے گڑگڑایا۔

"صاحب جی! مجھے نہیں پتہ میری جیب میں کس نے پستول ڈال دیا ہے۔ کسی نے میرے ساتھ دشمنی کی ہے صاحب جی! مجھے تو پستول چلانا بھی نہیں آتا۔"

اتنی دیر میں اسد بٹ اور گل میر پہاڑی کی چڑھائی چڑھتے ہوئے اس کی چوٹی پر پہنچ چکے تھے انہوں نے جھاڑیوں کی اوٹ سے نیچے دیکھا۔ سڑک پر قادری کی دکان سے ذرا آگے ڈوگرہ فوجیوں نے سجان بٹ کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ڈوگرہ کیپٹن اسے گھونسوں اور لاتوں سے مار رہا تھا اس نے فوراً" قادری چائے والے کو وہاں بلوایا اور پوچھا کہ یہ کون ہے؟ قادری نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"صاحب مجھے تو کچھ معلوم نہیں یہ کون ہے اور کس سے بالٹی لے کر آگیا ہے۔ میرے نوکر لڑکے تو شہر گئے ہوئے ہیں۔ میں خود آپ لوگوں کو چائے بنا بنا کر دے رہا تھا۔ آپ نے خود دیکھ لیا ہو گا۔"

ڈوگرہ کیپٹن نے حکم دیا۔

"اسے اوپر ٹرک پر باندھ دو۔ سرینگر چل کر اس سے پوچھ گچھ ہو گئی۔ یہ کسی خطرناک گینگ کا آدمی ہے۔ لے چلو اسے۔"

اسی وقت سجان بٹ کو ایک ٹرک کے اوپر رسیوں سے باندھ کر ڈال دیا گیا۔ اس کی ٹانگوں اور بازوؤں کو آگے پیچھے کی جانب ٹرک کے لوہے کی سلاخوں سے کس کر باندھا گیا تھا۔ سجان بٹ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈوگرہ کیپٹن نے اشارہ کیا۔ ٹرک سرینگر کی طرف سڑک پر رینگنے لگے۔

پہاڑی ٹیلے کے اوپر جھاڑیوں کی اوٹ سے اپنے ساتھی کمانڈو سجان بٹ کی آخری جھلک دیکھی۔ وہ آگے سے دوسرے فوجی ٹرک کے اوپر ترپال کی رسیوں کے ساتھ بندھا بالکل

سیدھا لیٹا تھا۔ گل میر نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"اس نے بم لگا دیئے ہوں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ ڈوگروں کو بموں کے بارے میں شک نہیں پڑا ورنہ ہمارا مشن بری طرح فیل ہو جاتا۔"

اسد بٹ اپنی کلائی پر لگی گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔

"گل میر! میرے حساب سے دھماکوں میں صرف سات منٹ باقی رہ گئے ہیں۔"

گل میر نے اپنے ہونٹ سیکڑتے ہوئے تلخی سے کہا۔

"ہمارے ساتھی کی قسمت میں شہادت کا درجہ لکھا تھا۔ دھماکے ضرور ہوں گے۔"

سجان بٹ ساتویں ڈوگرہ رجمنٹ کے تیرہ ٹرکوں کے قافلے میں آگے سے دوسرے ٹرک کے اوپر رسیوں سے بندھا ہوا ترپال پر پڑا آنکھیں بند کئے خدا کو یاد کر رہا تھا۔ اس نے اپنے حصے کی یعنی اگلے چار فوجی ٹرکوں کے مڈگارڈوں میں قیامت خیز دھماکوں سے پھٹنے والے انتہائی طاقتور پنسل بم لگا دیئے تھے۔ وہ خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ ڈوگروں کو یہ شک نہیں ہوا کہ ٹرکوں کے نیچے بم لگائے گئے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہ زندہ نہیں رہے گا۔ اس کے ٹرک کے نیچے ایک دھماکہ ہو گا۔ پنسل بم پھٹے گا اور اس کے ساتھ ہی ٹرک پر لدا ہو ایمونیشن بھی پھٹے گا اور اس کے جسم کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ مگر اسے خوشی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے شہادت کا رتبہ بخشا ہے اور وہ اسلام اور آزادیٔ کشمیر کی نام پر اپنی جان قربان کر رہا ہی۔ اس سے بڑھ کر اس کی اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی۔ وہ دل میں صرف ایک ہی دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا! میرے ساتھیوں نے باقی ٹرکوں میں بم لگا دیئے ہوں۔ میرے ٹرک کے ساتھ دشمن کے باقی ٹرک بھی تباہ ہو جائیں۔

ٹک ٹک ٹک۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ سیکنڈ کی سوئیاں ہر فوجی کی گھڑی میں آگے کو حرکت کر رہی تھیں۔ تمام ٹرکوں کے نیچے لگے بموں کے اندر بھی ایک نظر نہ آنے والی گراری آگے کو حرکت کر رہی تھی۔ اس گھڑی کو ایک خاص مقام پر پہنچ کر اپنی سوئی کی نوک سے ایک ننھی سی ٹیوب میں سوراخ کر دینا تھا جس کے ساتھ ہی ہیبت ناک

دھماکے سے بم کو پھٹ جانا تھا۔ ٹیلے کی چوٹی پر جھاڑیوں کی اوٹ میں اسد بٹ کی کلائی پر لگی سوئی بھی ایک ایک سیکنڈ پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔ ایک ایک سیکنڈ آگے بڑھ رہی تھی۔ گل میر کی آنکھیں سڑک پر لگی تھیں۔ ٹیلے پر سے اسے ڈوگرہ فوجی کانوائے پہاڑی بل کھاتی سڑک پر آگے کو رینگتا ابھی تک صاف نظر آ رہا تھا۔

پھر کانوائی کے ٹرک پہاڑی کا موڑ کاٹتے ہوئے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ گل میر نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"اسد بٹ بم کیوں نہیں پھٹ رہے؟ ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی؟"

اسد بٹ نے گھڑی پر نظریں جما رکھی تھیں بولا۔

"کاکا کیا کہہ رہے ہو۔ ابھی ٹائم نہیں ہوا۔ ابھی تین منٹ رہتے ہیں۔"

"اف" گل میر نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ "یہ تین منٹ کیوں ختم نہیں ہوتے۔"

پھر ایک آہ بھری اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میرے مولا کریم! سجان بٹ کی قربانی قبول کر لینا۔"

سجان بٹ ڈوگرہ فوجی ٹرک کے اوپر 'بارود کے اوپر' رسیوں سے بندھا لیٹا آنکھیں بند کئے اس دھماکے کا انتظار کر رہا تھا جس کی خاطر وہ اپنی جان قربان کر رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دھماکہ اس قدر قیامت خیز ہو گا کہ وہ اس کی آواز سننے سے پہلے ہی فضا میں منتشر ہو کر جام شہادت پی چکا ہو گا۔

ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ دشمن کے ٹرک پہاڑی ڈھلان سڑک پر آگے پیچھے ایک خاص رفتار سے چلے جا رہے تھے۔ ہر ٹرک میں تین تین ڈوگرہ فوجی سوار تھے جن کی نگاہیں ادھر ادھر کشمیر کے دلفریب مناظر کو دیکھ رہی تھیں۔

گل میر اور اسد بٹ تیزی سے ٹیلے کی مغربی جانب جھاڑیوں کی اوٹ میں آ گئے۔ ٹرک پہاڑی موڑ کے پیچھے سے نکل رہے تھے۔ سارے کے سارے ٹرک اب سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک پر سرینگر کی طرف بڑھ رہے تھی۔ ان کی ایک جانب اونچے پہاڑ کی

دیوار تھی اور دوسری طرف نیچے گہری گھاٹی تھی۔ اسد بٹ نے گھڑی پر سے نظریں ہٹالیں اور بولا۔

"کاکا۔ ٹائم ہوگیا ہے۔"

ٹائم ہوگیا تھا۔ پہلا ٹائم بم اس ٹرک کے ڈگارڈ کا پھٹا جس کے اوپر ترپال پر کشمیری مجاہد سبحان بٹ رسیوں میں جکڑا پڑا تھا۔ سبحان بٹ کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے چہرے پر شہادت سے پہلے نور تھا۔ وہ تصور میں اپنے خدا کے حضور سربہ سجدہ ہو کر اپنی مغفرت اور آزادی کشمیر کی دعا مانگ رہا تھا کہ بم پھٹ گیا۔ سبحان بٹ دھماکے کی پوری آواز نہ سن سکا جیسے ایک آہٹ سی ہوئی۔ اسے ایک جھٹکا سا لگا اور اس کا جسم ٹرک کا ایمونیشن پھٹنے سے نورانی ذرات بن کر فضا میں منتشر ہوگیا اور اس کی پاک روح شہادت کا رتبہ حاصل کرنے کے بعد جنت الفردوس میں پہنچ گئی۔

اس کے ساتھ ہی دوسرے ٹرک میں اور پھر تیسرے فوجی ٹرک میں دھماکہ ہوا۔ اسد بٹ اور گل میر ٹیلے پر سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ پہلے سبحان بٹ والا ٹرک پھٹا تھا۔ گل میر نے آنکھیں بند کرلیں۔ اسد بٹ نے دعائے مغفرت کے لئے ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ سبحان بٹ شہید ہوگیا تھا۔ پھر دس دس سیکنڈ کے وقفوں کے بعد پہاڑی سڑک پر رینگتے ڈوگرہ فوج کے ٹرک پھٹتے چلے گئے۔ ان ٹرکوں میں بھرا ہوا۔ ایمونیشن اور مارٹر توپوں کے گولے جب پھٹے تو آس پاس کی پہاڑیوں کے دل دہل گئے۔ سڑک پر آگ اور بارود کے دھوئیں کے بادلوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ شعلے ہی شعلے سیاہ دھواں ہی دھواں تھا۔ تیرہ کے تیرہ ڈوگرہ فوج کے ٹرکوں کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ ایک بھی فوجی زندہ نہیں بچا تھا۔

گل میر نے اسد بٹ کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اسد بٹ! ابھی کئی سبحان بٹوں کو شہادت کا مرتبہ حاصل کرنا ہے۔ ابھی ہمیں بھی اسلام کی سربلندی کے لئے شہید ہونا ہے۔ تب ہمارا وطن ہمارا پیارا کشمیر بھارتی ظلم و استبداد سے نجات حاصل کرے گا اور ہماری وادیوں میں اسلام کا نیا روشن اور نورانی سورج طلوع ہوگا۔ آؤ چلیں ہمیں ابھی بہت کام کرنا ہے۔"

دونوں کشمیری کمانڈو ٹیلے کی دوسری جانب ڈھلان اتر کر ایک چھوٹے سے پہاڑی نالے کو پار کرکے ناخوں کے باغ میں داخل ہوگئے۔

جذبہ اسلام اور آزادی کشمیر کے جوش میں سرشار ان دلیر حریت پرستوں نے شجاعت کا یہ بے مثال معرکہ میری آنکھوں کے سامنے انجام دیا تھا۔ میں اس مشن میں ان بہادر کشمیری مجاہدوں کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا مگر وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میرے نورانی ساتھی سبزپوش کو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جو ایک سفید سائے کی طرح میرے پہلو میں تھا۔ سبحان بٹ دشمن کے ٹرکوں کے ساتھ شہید ہوگیا تھا۔ اس کا جسم فضا میں بکھر گیا تھا۔ ڈوگرہ فوج کے یہ ٹرک بھاری مقدار میں اسلحہ لے کر سری نگر جا رہے تھے تاکہ وہاں مسلمان کشمیریوں کے خون سے ہولی کھیلی جائے، مگر کشمیر کے بہادر بیٹوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرکے ان ٹرکوں کو راستے میں ہی تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ساتویں ڈوگرہ رجمنٹ کے ٹرک جلے ہوئے سیاہ ٹکڑوں کی شکل میں پہاڑی سڑک اور گھاٹی میں بکھرے پڑے تھی۔ ڈوگرہ سپاہیوں اور ان کے کمانڈنگ آفیسر کی لاشوں کے ٹکڑے کہیں نظر نہیں آتے تھے۔

سبزپوش کی آواز سنائی دی۔

"کیا اس قوم کے جذبہ حریت کو مارٹر توپوں کے گولوں اور مشین گنوں کے فائروں سے دبایا جا سکتا ہے؟ نہیں میرے دوست نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا جن کے سینے نور اسلام سے روشن ہوں جن کی دل اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر دھڑکتے ہوں۔ جو ناموس رسالت مآب کی خاطر سر پر کفن باندھ کر میدان میں نکل آئے ہوں انہیں کفر کی بڑی سے بڑی طاقت بھی شکست نہیں دے سکتی۔"

میں خاموش تھا۔ میرا دل اللہ اور اس کے رسول پاک کی محبت میں سرشار تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے آج پہلی بار اسلام قبول کیا ہو۔ سبزپوش کی آواز آئی۔

"یہی وہ زندہ شہید ہیں جن کو ایک نظر دیکھنے کی خاطر ہم آسمانوں سے زمین پر اتر آئے تھے جو شہید ہو گئے وہ جنت میں پہنچ گئے جو

غازی ہیں وہ شہادت کی راہ پر چل رہے ہیں کیوں؟ صرف اس لئے
کہ اس وطن پاک میں اللہ اور اس کے رسول کا پاک نام ہمیشہ بلند
رہے۔"

سبز پوش خاموش ہو گیا۔ فضا میں ایک مقدس خاموشی طاری تھی۔ پھر سبز پوش کے گہرے
سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں کفر کے خلاف جہاد کے ایک اور
محاذ پر لئے چلتا ہوں۔ میں تمہیں مشاہدہ کرواتا ہوں کہ گل میر اور
اسد بٹ اپنے وطن اور اسلام کے نام پر کیسے شہید ہوتے ہیں۔
میرا ہاتھ تھام لو۔ ہم کفر و اسلام کے ایک اور معرکے کی طرف جا
رہے ہیں۔"

سبز پوش کے لطیف نرم اور پاکیزہ ہاتھ نے میرے ہاتھ کو اپنی شفیق
گرفت میں لے لیا اور پھر میرے پاؤں زمین سے اٹھتے چلے گئے
اور میں وادیٔ کشمیر کی غروب ہوتی شام کی سرمئی فضاؤں میں
نامعلوم منزل کی طرف پرواز کر گیا۔

---○○☆○○---

یہ بھی رات ہی کا سماں تھا۔

وادیٔ کشمیر کی خوبصورت جنت نظیر رات ---- جس کے پاکیزہ حسن کو بھارتی فوجی استبداد
کے شعلے مسخ کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ آسمان پر ستارے خاموشی سے ٹمٹما
رہے تھے۔ نیچے وادیوں اور گھاٹیوں میں چیڑھ اور چنار کے درخت جیسے مراقبے میں گم
تھے۔ یہ وادیٔ کشمیر کی ایک پر فضا وادی تھی جس کی پہاڑی ڈھلانوں کے درخت باغ اور
سیڑھیوں کی طرح بنائے گئے جوار باجرے دھان کے کھیت ستاروں کی نیلی روشنی میں
دھندلے دھندلے دکھائی دیتے تھے۔ یہاں ایک جانب کہیں کہیں کشمیری کسانوں کے
چھوٹے چھوٹے بوسیدہ گھر آباد تھے جن میں رات کے وقت اندھیرا چھایا تھا۔ ایسے ہی
ایک مکان کے باہر اندھیرے میں ایک بوڑھا کشمیری منہ سر کمبل میں چھپائے مرغیوں کی

ڈربے کے پاس اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں رات کے نیلے اندھیرے میں اوپر سے آتی
پہاڑی پگ ڈنڈی پر لگی تھیں۔ وادی میں ہر طرف گہرا سناٹا چھا رہا تھا۔ کبھی کبھی نیچے دور
ایک گاؤں سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ بوڑھے کشمیری کے
ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے وہ آیت الکرسی کا ورد کر رہا تھا۔

انسانی سائے اب قریب آ گئے تھے۔ پہلے وہ ایک ساتھ چل رہے تھے۔ اب
انہوں نے درمیان میں فاصلہ ڈال لیا تھا۔ میں نے انہیں پہچان لیا۔ مجھے سبز پوش کی
آواز سنائی دی۔

"تم نے ضرور ان کشمیری مجاہدوں کو پہچان لیا ہو گا"۔

"ہاں" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

یہ انسانی سائے کشمیری کمانڈو، گل میر اور اسد بٹ تھے۔
آگے آگے گل میر تھا۔ پانچ قدم کے فاصلے پر پیچھے اسد بٹ چلا آ
رہا تھا۔ انہوں نے کالی جیکٹیں اور کالی پتلونیں پہن رکھی تھیں۔
سروں پر کالے رنگ کی اونی ٹوپیاں تھیں۔ یہ کمانڈوز کا لباس تھا۔
دونوں کا ایک ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔ ان کی جیبوں میں
بھرے ہوئے آٹومیٹک پستول تھے۔ کمانڈو چاقو ان کی بیلٹ میں اس
طرح لگے ہوئے تھے کہ باہر سے نظر نہیں آتے تھے۔
مکان کے قریب آتے ہی دونوں لکڑی کی دیوار کی اوٹ میں ہو گئے
۔ بوڑھے کشمیری نے دھیمی آواز میں کہا۔

"حق اللہ! تیری مدد یا رسول اللہ"۔

یہ کوڈ ورڈ تھا۔ گل میر نے اپنے پیچھے اسد بٹ کو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں آگے بڑھے اور
بوڑھے کشمیری کے پاس آ کر دھیمی آواز میں سلام کیا۔ بوڑھے نے دونوں کو باری باری
اپنے سینے سے لگایا اور آہستہ سے کہا۔

"زمان بادلی والی کوٹھڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ تمہارے
پیچھے تو کوئی نہیں لگا ہوا؟"

گل میر نے کہا "نہیں کاکا۔ ہم نے راستہ بدل لیا تھا۔"

اتنا کہہ کر گل میر نیچے اتر گیا۔ اسد بٹ اس کے ساتھ تھا۔ بوڑھا کشمیری اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک کہ دونوں کشمیری جوان باولی والی کوٹھڑی میں داخل نہیں ہو گئے۔

کوٹھڑی کا دروازہ زمان نے سارے کوڈ ورڈ بتانے پر ہی کھولا تھا۔ دونوں کشمیری کمانڈو اپنے ساتھی کمانڈو زمان سے گلے لگ کر ملے۔ کوٹھڑی میں زمین پر رکھی ہوئی ایک موم بتی جل رہی تھی۔ فرش پر دری بچھی تھی۔ دو چار کمبل اور ایک پرانا دھسا بھی پڑا تھا۔ کونے میں چارے کا ڈھیر لگا تھا۔ زمان بھی ایک خوش شکل کشمیری نوجوان تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ اس کے لہجے میں ایک عجیب جوش تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا اور انگلستان میں چار سال رہ آیا تھا۔ انگلستان میں ہی اس نے کمانڈو تربیت حاصل کی تھی اور پھر وہاں سے واپس اپنے وطن کشمیر آ گیا تھا کیونکہ اس کے وطن کو اس کی ضرورت تھی۔ وہ کشمیر میں بھارتی فوجی قبضے کے خلاف کئی معرکے سرانجام دے چکا تھا۔ اس وقت یہ تینوں کشمیری مجاہد کمانڈو ایک بڑے اہم مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ راتوں کو وہ اس لئے ملتے تھے کہ بھارتی فوجی اور ملٹری انٹیلی جینس کے آدمی ان کی تلاش میں شکاری کتوں کی طرح پھر رہے تھے۔ موم بتی ایک اینٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ زمان نے اسے ذرا پرے کر دیا اور گل میر کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"ڈوگرے سکندر کو بہت ٹارچر کر رہے ہیں۔ اس نے ہم میں سے نہ تو کسی کا نام لیا ہے اور نہ کوئی خفیہ ٹھکانہ بتایا ہے۔ وہ مر جائے گا مگر ایسا نہیں کرے گا۔"

گل میر گہری سوچ میں تھا۔ اسد بٹ نے کہا۔

"لالا۔ سکندر کو بھارتی قید سے آزاد کرانا بہت ضروری ہے۔ ہمیں اپنے نئے مشن کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے۔ اگر وہ بھارتی فوج کی اذیت سے شہید ہو گیا تو ہمیں اپنے آئندہ مشن کے لئے ایسا کمانڈو نہیں مل سکے گا۔"

زمان نے کہا۔

"اسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ گل میر! تم کیا سوچ رہے ہو؟"

گل میر نے اپنی اونی ٹوپی اتارتے ہوئے کہا۔

"سوچ رہا ہوں کہ سکندر کو بھارتی قید سے نکالنے کے لئے مجھے خود جانا پڑے گا۔"

زمان اور اسد بٹ چپ ہو گئے۔ وہ گل میر کو تکنے لگے۔ زمان نے کہا۔

"مگر لالا! یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ جہاں سکندر کو قید میں رکھا گیا ہے وہاں ڈوگرہ فوج کا پورا بریگیڈ موجود ہے۔ چاروں طرف خاردار تاروں کی دیوار کھڑی ہے جس کے ہر کونے پر مشین گن پوسٹیں ہیں۔ گارڈز ہر وقت پہرہ دیتے ہیں۔ چھ سات ٹینک بھی ہر وقت پوزیشنیں سنبھالے وہاں چوکس رہتے ہیں۔ سکندر کو ہماری اطلاع کے مطابق ایک بارک میں کڑے فوجی پہرے میں قید رکھا گیا ہے اور وہاں کسی سویلین کو جانے کی اجازت نہیں۔"

گل میر نے آہستہ سے کہا۔

"زمان! تم سمجھتے ہو کہ یہ سب کچھ مجھے معلوم نہیں ہے کیا؟ مجھے سب معلوم ہے۔ اس کے باوجود مجھے اپنے ساتھی کو انڈین ملٹری کی قید سے نکال کر لانا ہے چاہے اس میں میری اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔"

"تمہاری جان بھی بڑی قیمتی ہے گل میر"! اسد بٹ نے کہا۔

گل میر مسکرایا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں کمانڈو ہوں۔ تمہاری طرح مجھے بھی معلوم ہے کہ کمانڈو دس پندرہ کو مار کر شہید ہوتا ہے۔ میں اگر شہید ہو بھی گیا تو یقین کرو سکندر آزاد ہو چکا ہو گا۔"

تینوں دوست' تینوں کشمیری مجاہد خاموش ہو گئے۔ کوٹھڑی کے باہر سرد رات گزر رہی تھی۔ زمان نے پوچھا۔

"تم نے اس مشن کے لئے کیا پلان بنایا ہے؟"

گل میر بولا۔

"پلان میرے ذہن میں بڑا صاف ہے۔ تمہیں بتانے سے صرف وقت ضائع ہو گا اور کچھ نہیں ہو گا۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تمہارے گاؤں کا ایسا آدمی کون ہے جو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں اکثر آتا جاتا ہے۔ تمہارا گاؤں ہیڈ کوارٹر کے ساتھ ہی ہے۔ تم وہاں پر نہیں ہوتے ہو مگر تم یہ معلوم کرسکتے ہو کہ گاؤں کا کون آدمی ڈوگرہ فوج کو انڈے وغیرہ سپلائی کرتا ہے۔"

زمان کچھ سوچ کر بولا۔

"جب میں گاؤں سے روپوش ہوا تھا تو مجھے اتنا معلوم ہے کہ سخی نام کا ایک کشمیری گجر کبھی کبھی تازہ انڈے اور مکھن لے کر فوجی کیمپ میں جاتا تھا۔"

"یہ سخی کیسا آدمی ہے؟" گل میر نے پوچھا۔

زمان کہنے لگا۔

"عام سیدھا سادا کشمیری ہے۔ پکی عمر ہے' اپنی کوٹھڑی میں اکیلا رہتا ہے۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ وہ ڈوگرہ فوج کے لئے کبھی کبھی جاسوسی بھی کرتا ہے۔"

اسد بٹ بولا۔

"ایسے آدمی کو تم لوگوں نے گوارا کیسے کرلیا؟"

زمان نے کہا۔

"اس کی جاسوسی بے ضرر ہے۔ کیونکہ گاؤں میں ہمارا کبھی کوئی آدمی نہیں گیا کہ جس کی وہ مخبری کر کے اسے گرفتار کروا سکے۔"

گل میر کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ آدمی اب میرا ٹارگٹ ہے۔"

"کیا مطلب؟" زمان نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

گل میر نے دبی زبان میں زمان کو اپنی ساری سکیم سمجھائی اور آخر میں کہا۔

"کل رات میں تمہارے گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ تمہیں وہاں موجود

ہونا چاہیے۔"

زمان نے کہا۔

"میں تمہیں گاؤں کے باہر جو مکئی کا کھیت ہے وہاں ملوں گا۔ کیا اسد بٹ بھی تمہارے ساتھ آئے گا؟"

"نہیں" گل میر نے کہا۔ "میں اکیلا ہی آؤں گا۔ یہ صرف ایک آدمی کا مشن ہے۔"

اس کے بعد تینوں کشمیری کمانڈو کوٹھڑی سے باہر نکلے اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ سبز پوش بھی انہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے سبز پوش سے پوچھا۔

"زمان کا گاؤں کہاں ہے؟ میں وہاں پہنچ کر اس دلیر کشمیری کمانڈو گل میر کے خطرناک مشن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں"۔

سبز پوش کے سانس بھرنے کی آواز سنائی دی۔ پھر اس نے کہا۔

"تم میرے ساتھ رہو گے۔ میں تمہارے پہلو میں ہوں گا۔ ہم دونوں دلیری اور حریت کے ان لازوال معرکوں کے عینی شاہد ہوں گے۔"

میں نے سبز پوش کے نرم شفیق ہاتھ کا دباؤ اپنے کاندھے پر محسوس کیا اور اس کے بعد جیسے میں فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ جب مجھے شعور کا احساس ہوا تو میں نے اپنے آپ کو ایک پہاڑی گاؤں کے باہر مکئی کے کھیت کے قریب کھڑے دیکھا۔ اسی کھیت کے کونے میں زمان کمانڈو فصل کے پاس جھک کر بیٹھا اپنے ساتھی کمانڈو گل میر کی راہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنے قریب ہی سبز پوش کی موجودگی کا احساس بھی تھا۔ تب سبز پوش نے پر سکون آواز میں کہا۔

"یہ دوسری رات ہے۔ گل میر کا خطرناک مشن شروع ہونے والا ہے۔ کشمیر کے ان جوان ہمت اور اسلام کی حقیقی روح کے علم بردار بیٹوں کی جراتوں کے گواہ رہنا ——— وہ دیکھو! گل میر چلا آ رہا ہے؟"

زمان نے سامنے والے کھیت میں قدموں کی آہٹ سنی تو اپنے پستول پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی۔ یہ اس کا اپنا گاؤں تھا مگر بھارتی ملٹری انٹیلی جنس کے آدمی شب و روز اس کی تلاش میں تھے چنانچہ زمان اپنے گھر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ میدان جہاد میں دشمن سے برسرپیکار تھا۔ وہ کشمیر پر بھارتی قبضے اور بھارتی فوجی ظلم و ستم کے خلاف جہاد کر رہا تھا۔ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کے دن دشمن کے خلاف سکیمیں تیار کرنے، نقشے مرتب کرنے اور راتیں بھارتی چھاؤنیوں اور ان کی سپلائی پر شب خون مارنے میں گزرتی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ساتھی کشمیری جوان شہید ہوئے تھے۔ وہ خود کئی بار شدید زخمی ہوا تھا مگر ابھی تک دشمن اسے پکڑ نہیں سکا تھا۔ یہی عالم گل میر اور اسد بٹ کا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگیاں اسلام اور کشمیر کو بھارتی فوج کے قبضے سے نجات دلانے کے نام پر لکھ دی تھیں۔ انہوں نے عہد کر رکھا تھا کہ جب تک کشمیر کو بھارتی قبضے سے آزاد نہیں کرا لیں گے اور ساری وادئ کشمیر پر اسلام کا پرچم نہیں لہرا لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

گل میر کھیتوں سے نکل کر سامنے آیا تو زمان نے اسے پہچان لیا اور پستول جیب میں رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

دونوں ساتھی ایک باڑے میں گھس گئے جہاں گائے بھینس بندھی تھیں۔ گل میر نے پوچھا۔

"اب کیا پوزیشن ہے؟"

زمان بولا۔

"میں نے علیا گوجر سے بات کر لی ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ علیا ہمارے ساتھ ہے۔ اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ وہ خود بھی کبھی کبھی کیمپ میں تازہ انڈے مکھن لے کر جاتا ہے۔"

گل میر نے دوسرا سوال کیا۔

"سخی گجر کا کیا ہوا؟"

زمان نے کہا۔

"ہم نے اسے اغوا کر کے یہاں سے بہت دور ایک جگہ پہنچا دیا ہے۔ جہاں ہمارے ساتھی اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ وہاں سے وہ نکل نہیں سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔" گل میر بولا۔ "تم مجھے علیا کے پاس لے چلو۔ اسے سب کچھ سمجھا دیا تھا ناں؟"

"ہاں" زمان نے کہا۔ "سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ چلو علیا کے گھر چلتے ہیں۔ وہ ہمارا انتظار کر رہا ہو گا۔"

گل میر نے پوچھا۔ "اس کے گھر والے کہاں ہیں؟"

زمان نے جواب دیا۔

"پروگرام کے مطابق ہم نے انہیں آج دوپہر ہی کو دوسرے گاؤں پہنچا دیا ہے۔ اب گھر میں سوائے علیا گجر کے اور کوئی نہیں۔"

علیا گجر کا بوسیدہ سا پرانا گھر صرف ایک کوٹھڑی اور ایک باڑے پر مشتمل تھا۔ باڑے میں لالٹین روشن تھی جہاں ڈنگر بندھے تھے۔ علیا خود اپنی کوٹھڑی میں لحاف اوڑھے چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ کے قریب تھی، مگر جسم اب بھی طاقتور تھا۔ زمان اپنے ساتھ گل میر کو لے کر کوٹھڑی میں آ گیا۔ اس نے علیا سے گل میر کا تعارف کرایا۔ علیا نے گل میر کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "اللہ تمہاری مدد کرے گا بیٹا۔ بیٹھو" اس کے بعد ان کی باتیں شروع ہو گئیں۔ علیا نے گل میر کو وہ سب کچھ سمجھا دیا جو اسے کرنا تھا۔ جب پو پھٹنے لگی تو زمان نے گل میر سے کہا۔

"لالا! اب میں چلتا ہوں۔ اگر تم اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤ تو سکندر کو لے کر اسی باولی والی کوٹھڑی میں آ جانا۔ ہمارا اگلا اہم ترین مشن وہیں سے شروع ہو گا۔ میں اور اسد بٹ تمہیں وہیں ملیں گے۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو۔"

یہ کہہ کر زمان چلا گیا۔ علیا نے گل میر سے کہا۔

"تم تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤ۔ صبح ہمیں بڑے اہم کام پر روانہ ہونا ہے۔"

گل میرنے کوئی جواب نہ دیا اور اپنی چارپائی پر لحاف اوڑھ کر پڑ گیا۔ وہ اس قدر تھکا ہوا تھا کہ اسے آنکھیں بند کرتے ہی نیند آ گئی۔ کوئی دو گھنٹے بعد علیا نے اسے جگایا تو کوٹھڑی کی کھڑکی میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔

"اٹھو بیٹا! تمہیں تھوڑی دیر بعد میرے ساتھ فوجی کیمپ میں چلنا ہو گا۔"

گل میرنے منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا۔ پھر دو نفل پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے اپنے مشن کی کامیابی کی دعا مانگی اور کوٹھڑی میں آ کر اپنا حلیہ بالکل کشمیری گجر لڑکوں ایسا بنا لیا۔ اس کی ڈاڑھی پہلے ہی سے بڑھی ہوئی تھی۔ اوپر سے اس نے علیا گجر کے بڑے بیٹے کا میلا سا فرن پاؤں میں مونج کی رسی یعنی پیال کی چپل پہن لی۔ کشمیر میں محنت کش طبقہ عام طور پر ایسی ہی چپل پہنتا ہے۔ علیا نے ناشتے کے وقت گل میر کو ڈوگرہ فوجی کیمپ کے بارے میں ایک ایک بات سمجھا دی تھی۔

"باقی تم اندر جا کر خود معلوم کر لینا"۔

ایک گھنٹے بعد علیا گجر اپنے سر پر گائے کے دودھ کا گڑوا رکھے ڈوگرہ بریگیڈ کے کیمپ کی طرف جا رہا تھا۔ گل میر بھی ایک ملازم گجر کے بھیس میں اس کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھام رکھی تھی جس میں گائے کے دودھ کا سیر بھر خالص مکھن تھا۔ ڈوگرہ فوج کے ہندو فوجی گائے کا دودھ اور گائے کا مکھن ہی پسند کرتے تھے۔ کیمپ کے گیٹ پر دو فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ علیا نے سرگوشی میں کہا۔

"جیسے سمجھایا ہے ویسے ہی کرنا"۔

گارڈ کی ڈیوٹی پر کھڑے ڈوگرہ سپاہی علیا کو جانتے تھے، مگر اس کے ساتھ ایک اجنبی کشمیری نوجوان کو دیکھ کر انہوں نے اسے روک دیا۔

"یہ کون ہے اوئے؟"

علیا نے سلام کر کے کہا۔

"ماراج یہ میرا بھانجہ ہے۔ شہر میں بیکار عمر ضائع کر رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا ہے کہ میرا ہاتھ بٹائے۔ میں بوڑھا ہو چلا ہوں۔ مجھ سے پہاڑی راستوں پر اب آیا جایا نہیں جاتا۔ آج سے

یہی دودھ مکھن لے کر حاضر ہوا کرے گا۔"

"کیا ناؤں ہے اس کا؟" ایک سپاہی نے گل میر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

گل میرنے ہاتھ سے سلام کیا اور عاجزی سے بولا۔

"صاحب میرا نام عمرو ہے۔"

علیا بولا۔

"ماراج عمرو بڑا محنتی لڑکا ہے۔ یہ پتھر بھی ڈھو لیتا ہے۔ پورا خچر ہے خچر۔"

گارڈ نے انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ علیا وہاں سے سیدھا کوارٹر ماسٹر کے کمرے کی طرف گیا۔ صوبیدار بخشی رام کیمپ کا کوارٹر ماسٹر تھا۔ ساری سپلائی اس کے پاس جاتی تھی۔ علیا نے صوبیدار بخشی رام کے لئے پاؤ بھر مکھن الگ سے رکھ لیا تھا۔ ڈوگرہ صوبیدار نے گل میر کو دیکھ کر وہی سوال پوچھا کہ یہ کس جانگلی کو ساتھ لے آئے ہو۔ علیا؟ علیا نے وہی جواب یہاں زیادہ نمک مرچ لگا کر دہرا دیا جو اس نے کیمپ کے گارڈ کو دیا تھا۔ ساتھ ہی ڈوگرہ صوبیدار کو پاؤ بھر مکھن کا ڈونا پیش کیا اور کہا۔

"ماراج یہ میں نے آپ کے لئے اپنی خاص گائے کے دودھ کا مکھن نکالا ہے۔ اسے سویکار کریں ـــــ اور ماراج! اب میں بوڑھا ہو چلا ہوں۔ کل سے میرا بھانجہ عمرو ہی آپ کے لئے مکھن لایا کرے گا۔ اس کا پاس بنوا دیں۔"

صوبیدار بخشی رام نے مکھن کھاتے ہوئے کہا۔

"اوئے علیا تمہارا پاس بنا ہے جو اس تمہارے جانگلی بھانجے کا پاس بنا دوں؟ بس اسے دیکھ لیا ہے۔ گارڈ کو کہہ دوں گا اسے بھیج دیا کرنا۔"

دوسرے دن سے گل میرنے کیمپ میں مکھن دودھ لانا شروع کر دیا۔ سکیم کے مطابق گل میر ہر ڈوگرہ فوجی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا۔ کسی کو نمسکار، کسی کو رام رام اور کسی کو جے ہند کہتا۔ اس نے کوارٹر ماسٹر صوبیدار بخشی رام کو بھی اپنے اخلاق سے رام کر

لیا۔ مگر ابھی تک اسے کیمپ میں ادھرادھر گھومنے کی نہ اجازت تھی اور نہ ہی گل میر نے ابھی ایسا خطرہ مول لیا تھا۔ اس کیمپ کے ڈوگرہ فوجی افسر اس کی شکل سے شناسا نہیں تھے ورنہ وہ اسی وقت گرفتار کرلیا جاتا۔ جب اسے کیمپ میں دودھ مکھن لے جاتے ایک ہفتہ ہوگیا تو ایک روز اس نے صوبیدار بخشی رام کی کرسی کے سامنے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ماراج! میرا گزارا نہیں ہوتا۔ ماموں علیا مجھے روٹی تو دے دیتا ہے۔ دودھ بھی پینے کو مل جاتا ہے پر مجھے پیسہ دھیلا نہیں دیتا۔ ماراج آپ مالک ہیں۔ اگر یہاں مجھ سے چھوٹی موٹی کوئی خدمت لے لیا کریں تو میں چار پیسے جوڑ کر اپنا بیاہ کرلوں گا۔"

صوبیدار بخشی رام نے اپنے بوٹ کی ہلکی سی ٹھوکر گل میر کے گھٹنے پر ماری اور بولا۔

"اوئے جانگلی تو بیاہ کرکے کیا کرے گا۔"

گل میر نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مائی باپ آپ کو دعائیں دوں گا۔"

صوبیدار بخشی رام کو یقین ہوگیا تھا کہ علیا گجر کا یہ بھانجہ سیدھا سادا بے ضرر نوجوان ہے اور کچھ کچھ جھلا بھی ہے۔ گل میر جان بوجھ کر کبھی کبھی جھلوں والی باتیں کرنے لگ جاتا تھا۔ چنانچہ صوبیدار بخشی رام نے اسے اجازت دے دی کہ وہ کھرپا لے کر فوجی بارکوں کے آگے پیچھے جو پھولوں کی کیاریاں بنی ہیں انہیں صاف ستھرا کرتا رہا کرے۔

گل میر یہی چاہتا تھا۔ اگلے روز صوبیدار بخشی رام کو مکھن پہنچانے کے بعد اس نے وہیں سٹور سے ایک کھرپا لے لیا اور سامنے والی بارک کے آگے لگی کیاری میں بیٹھ کر اس کی گوڈی کرنے اور جڑی بوٹیاں اکھاڑنے لگا۔ وہ سارا دن ادھرادھر دیکھے بغیر اپنے کام میں لگا رہا۔ ایک ہفتہ مزید گزر گیا۔ اس دوران گل میر نے دیکھ لیا کہ کیمپ کافی بڑا تھا اور اس کی فوجی بارکیں دو قطاروں کی شکل میں شمالاً "جنوباً" چلی گئی تھیں۔ وہاں کافی ڈوگرہ اور مدراسی فوجی رہ رہے تھے۔ فوجی گاڑیاں بھی تھیں۔ دس بارہ ٹینک بھی ایک چھپر کے نیچے کھڑے تھے جن پر کیمو فلاج جال پھیلا دیا گیا تھا۔ ابھی تک گل میر کو یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ اس کا کمانڈو ساتھی سکندر کس بارک میں قید ہے۔ لیکن بہت جلد

اسے سکندر والی بارک کا بھی علم ہوگیا۔ یہ بارک کیمپ کے جنوبی کونے میں واقع تھی۔ اس کی دیواریں لکڑی کی اور چھت ٹین کی تھی۔ اس کے باہر ہر وقت دو سپاہی پہرے پر موجود رہتے تھے۔ گل میر نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ بارک کے پیچھے ایک چٹانی دیوار سیدھی اوپر تک چلی گئی تھی۔ اس دیوار کے اوپر بھی خاردار تار لگی تھی۔

رات کو کوٹھڑی میں واپس آکر گل میر نے علیا سے کہا

"کاکا! میں اپنے کمانڈو ساتھی کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہوا یا نہ ہوا مگر ڈوگرہ فوج تجھے ضرور گرفتار کرلے گی۔ وہ تجھے بری طرح اذیت دے کر ہلاک کردے گی۔ اس کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے۔"

علیا حقہ پی رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ تمہارا کام میری زندگی، میرے ڈھور ڈنگر اور میرے گھر سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں یہ سب کچھ اس طرح چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ اگر ڈوگروں کے قابو آگیا تو ہونٹوں کو بھینچ کر بڑی سے بڑی اذیت سہہ جاؤں گا۔ اور مرجاؤں گا مگر کسی ایک ساتھی کا بھی نام نہیں بتاؤں گا۔"

گل میر آگے کچھ نہ بولا۔ علیا بولا

"کیا تم نے کوئی فیصلہ کرلیا ہے؟ میرا مطلب ہے تمہیں سکندر کا پتہ چل گیا ہے کہ وہ کہاں قید ہے"۔

گل میر نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"ہاں --- اور کل رات میں اسے یہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کروں گا۔"

علیا کے بوڑھے چہرے پر گہری سنجیدگی چھاگئی۔

"بیٹا گل میر! اچھی طرح سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا ہماری طرح کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہم تو سب شہید ہوجانے کے لئے کشمیر کی وادیوں میں چل پھر رہے ہیں لیکن سکندر کو ڈوگروں کی اذیت سے ضرور نجات ملنی چاہئے۔"

گل میر بولا۔ "کاکا میں کل رات سمندر میں چھلانگ لگا رہا ہوں۔ آگے جو کچھ ہو وہ خدا

کے ہاتھ میں ہے۔"

علیا گجر خاموش رہا۔ حقے کے دو کش لگائے اور کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ اللہ تمھیں کامیاب کرے۔ میں بھی کل رات یہاں سے نکل جاؤں گا۔ ڈھور ڈنگر میں دوپہر کو ہی روانہ کر دوں گا۔ باقی یہاں میرا کچھ بھی نہیں ہے۔"

دوسرے روز گل میر کھرپا لے کر کونے والی بارک کے آس پاس کی کیاریوں ہی کی گوڈی کرتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ ہر چار گھنٹے کے بعد گارڈ کی ڈیوٹی بدل جاتی تھی۔ ایک ڈوگرہ فوجی بارک کی چھت کے قریب چٹان کی دیوار پر بھی پہرہ دے رہا تھا۔ اس ڈوگرے کو گل میر نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ مگر گل میر نے اب فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے فیصلے پر قائم تھا۔ بارک کے اندر سے اسے دو ایک بار اسکندر کی چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ اسے اذیت دی جا رہی تھی۔ گل میر نے آنکھیں بھینچ لی تھیں۔ "سکندر! میرے بھائی۔ صرف آج کا دن تکلیف برداشت کر لو۔ صرف آج کا دن میرے بہادر ساتھی!" گل میر کے ہونٹ اپنے آپ بڑبڑانے لگے تھے۔

گل میر کو کیا کرنا تھا' یہ اس نے سب سوچ لیا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہاں کسی باقاعدہ منصوبے بندی سے کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ بس جرات رندانہ کی ضرورت تھی۔ اللہ کا نام لے کر کفر کی چٹان سے ٹکرا جانے والی بات تھی۔ شہید یا غازی ——!

وہ رات عام راتوں سے کچھ زیادہ تاریک تھی۔

یا شاید گل میر کو ایسا لگ رہا تھا۔ وہ رات کو اس سے بھی زیادہ تاریک دیکھنا چاہتا تھا۔ علیا گجر سر شام ہی ڈھور ڈنگر لے کر وہاں سے ہجرت کر گیا تھا۔ گل میر کوٹھڑی میں اکیلا تھا۔ اس کی سکیم کے مطابق علیا پیچھے اپنے دو گھوڑے چھوڑ گیا تھا۔ شروع رات میں گل میر لکڑیاں کاٹنے کے بہانے کیمپ کے جنوبی کونے والی چٹانی دیوار کے پیچھے جنگل میں جا کر جائزہ لے چکا تھا۔ اس نے ان جگہوں کی نشان دہی بھی کر لی تھی جہاں سے اسے اپنا ایکشن شروع کرنا تھا۔ یہ موت کے بالکل آمنے سامنے آ جانے والی بات تھی۔ مگر موت سے وہ نہیں گھبراتا تھا۔ کشمیری حریت پسند موت کو ساتھ لئے پھرتے تھے بلکہ کئی مقامات پر ان کے حیرت انگیز دلیری کے کارناموں کو دیکھ کر موت کا دل بھی لرز اٹھتا تھا۔

جب رات ذرا گہری ہو گئی اور کیمپ کی طرف خاموشی چھا گئی تو گل میر نے اللہ کا نام لیا اور اپنا لمبا کرتا یعنی فرن اتار کر کالی پتلون اور جیکٹ پہن کر بیلٹ میں کمانڈو چاقو اڑس لیا۔ ایک جیب میں سائی لینسر والی پستول رکھ لی جس کا میگزین بھرا ہوا تھا یہ آٹومیٹک پستول تھا اور اس سے بارہ فائر ہو سکتے تھے۔ یہاں کسی ٹائم بم یا رائفل یا برین گن کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت سب سے پہلے جرات رندانہ' دلیری اور ہوش مندی کی تھی اور اس کا کافی ذخیرہ اور تجربہ گل میر کے پاس موجود تھا۔ گھوڑوں کو اس نے سر شام ہی کوٹھڑی والے صحن سے نکال کر چٹانی دیوار سے تھوڑے فاصلے پر جنگلی شہتوت کے ایک درخت کے ساتھ باندھ کر ان کے آگے کافی چارہ ڈال دیا تھا۔ اس نے کلائی گھڑی دیکھی۔ اندھیرے میں چمکتی ہوئی سوئیاں رات کے ساڑھے بارہ بجا رہی تھیں۔

وہ علیا گجر کی کوٹھڑی سے نکل کر نیچے گھاٹی میں اتر گیا۔ وہاں سے چلتا ہوا چیڑھ کے ان درختوں میں آ گیا جو دور کیمپ کی خاردار دیوار تک چلے گئے تھے۔ اب وہ بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ ہر دوسرے قدم پر پیچھے اور دائیں بائیں دیکھ لیتا تھا۔ پستول اس کے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ کیمپ کی خاردار دیوار کے پاس آ کر وہ بیٹھ گیا۔ کیمپ کے مین گیٹ پر جو سرچ لائیٹیں لگی تھیں' ان کی روشنی یہاں تک بھی آ رہی تھی۔ کیمپ کی چھوٹی سی گراؤنڈ میں کوئی فوجی ٹرک سٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انجن کی آواز رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی گذر جاتی تھی۔ اندھیرے میں گل میر کی چمکتی ہوئی آنکھیں چیتے کی طرح اپنے شکار' اپنے ٹارگٹ کو دیکھ رہی تھیں۔ ٹارگٹ وہ چٹانی دیوار تھی جو کونے والی بارک کی چھت تک چلی گئی تھی اور جس کے اوپر ایک ڈوگرہ فوجی لکڑی کے کھوکھے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ گل میر نے رینگنا شروع کر دیا۔ وہ پورا کمانڈو بن گیا تھا۔

گھاس شبنم کی وجہ سے گیلی تھی۔ اس میں رینگنے سے آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔ گل میر زخمی سانپ کی طرح رینگتا ہوا خاردار دیوار کے قریب جا کر رک گیا۔ اس کی جیکٹ میں چھوٹا مگر بڑا مضبوط پلاس تھا۔ اس نے پلاس نکال کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اب وہ اس کا انتظار کر رہا تھا جو کیمپ میں کسی فوجی کے ٹرک کے سٹارٹ کرنے کی وجہ سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد پیدا ہوتی تھی یہ آواز گل میر کے لئے رحمت بن سکتی تھی۔ جونہی

انجن کے سٹارٹ ہونے اور گرر گرر کی آواز رات کی خاموش فضا میں گونجی گل میر نے پلاس کی مدد سے چھ سات جگہوں سے خاردار تار کو کاٹ دیا۔ تار کے کٹنے سے جو ہلکی سی آواز پیدا ہوئی وہ ٹرک انجن کے شور میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ گل میر نے تاروں کے کٹے ہوئے جال کو اوپر اٹھایا اور دیوار کی دوسری طرف رینگتا ہوا نکل گیا۔ اب وہ جنوبی بارک کی دیوار کی پشت سے لگا زمین پر لیٹا تھا۔ وہ کیمپ کے اندر آچکا تھا۔ بارک کے آگے جو دو ڈوگرے پہرہ دے رہے تھے ان کی باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ پھر گل میر کو سگریٹ کے دھوئیں کی بو محسوس ہوئی۔ پستول کی جگہ اس نے کمانڈو چاقو کھول کر اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا تھا یہاں سائی لینسر والے پستول کی ٹھک کی آواز بھی دوسرے سپاہیوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ گل میر نے یہاں صرف کمانڈو چاقو سے کام لینا تھا۔ اور یہ سبھی جانتے ہیں کہ جب کوئی تربیت یافتہ اور پرجوش مسلمان کمانڈو اپنے چاقو کو دشمن کے خلاف استعمال میں لاتا ہے تو پھر دشمن کا بچنا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر ایک سیکنڈ سے بھی کم مدت میں موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

گل میر ابھی تک اپنی سکیم کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ سانپ کی طرح رینگتا بارک کے کونے میں آگیا۔ یہاں آگے روشنی تھی۔ اس نے سر ذرا سا آگے کر کے دیکھا کہ گارڈ ڈیوٹی پر موجود دونوں ڈوگرے سپاہی لکڑی کے سٹولوں پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ گل میر نے سر پیچھے کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی جیب میں پہلے سے رکھی ہوئی ایک کنکر نکال کر اپنے آگے پتھر کی دیوار پر پھینکی۔ اس سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ گل میر جلدی سے اٹھ کر دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر اس طرح سے کھڑا ہو گیا کہ اس کے سیدھے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا اور بایاں ہاتھ یوں اوپر کو اٹھا ہوا تھا جیسے کسی کی گردن دبوچنے کے لئے تیار ہو۔

کنکر کی آواز پر گارڈ ڈیوٹی پر موجود ایک ڈوگرے نے چونک کر دیوار کی طرف دیکھا جہاں اندھیرا تھا۔

"یہ کیا آواز تھی؟" اس نے ساتھی سے کہا۔

دوسرے سپاہی نے سگریٹ کا کش لگا کر دھواں اگلتے ہوئے کہا۔

"اوپر سے کوئی اخروٹ گرا ہوگا۔ پیچھے اخروٹ کا درخت ہے"۔

پہلا سپاہی سٹول پر سے اٹھا اور بولا۔

"میں چیک کرتا ہوں۔"

وہ بارک کی عقبی دیوار کی طرف بڑھا۔ جہاں اس کی موت گل میر کی شکل میں بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ گل میر نے اپنا بایاں بازو اوپر دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔ سیدھے ہاتھ کی گرفت چاقو پر مضبوطی سے جم گئی تھی۔ ذرا سی آواز گل میر کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ جونہی ڈوگرہ سپاہی دیوار کی اوٹ سے نکل کر اندھیرے میں آیا ایک بجلی سی کوندی اور دوسرے لمحے ڈوگرے کی گردن گل میر کے بائیں بازو کے شکنجے میں تھی اور اس کے دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا کمانڈو چاقو اس کی گردن کو پسلی کی ہڈی تک کاٹ چکا تھا۔ ڈوگرے کا خون ابل ابل کر گل میر کے بازو پر گرنے لگا۔ گل میر وہیں آہستہ سے بیٹھ گیا اور اس نے کٹی ہوئی گردن والے ڈوگرے سپاہی کی لاش کو گھاس پر ویسے ہی آرام سے ٹکا دیا۔ پھر جلدی سے اٹھا اور ایک بار پھر اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاس چاقو صاف کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

چند سیکنڈ گذر گئے اور جب ڈوگرہ سپاہی واپس نہ آیا تو دوسرا سپاہی اٹھ کر دیوار کی طرف بڑھا۔ وہ ذرا سا جھک کر چل رہا تھا اور اندھیرے میں اپنے ساتھی کو دیکھنے کی کوشش میں تھا کہ گل میر اس پر چیتے کی طرح گرا اور اس کے چاقو نے دشمن کی گردن پر تیزی سے پھر کر اس کی شہ رگ کو کاٹ ڈالا۔ گل میر جانتا تھا کہ بارک کے اوپر بھی ایک سپاہی بیٹھا ہے۔ ذرا سی آواز اسے متوجہ کر سکتی تھی۔ دوسرا سپاہی گل میر کے بازوؤں میں جھول گیا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی کٹی ہوئی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا تاکہ نرخرے کی بھی آواز پیدا نہ ہو۔ پھر جھک کر اس کی بچی ہوئی گردن بھی کاٹ دی۔

اس کام سے فارغ ہو کر گل میر بارک کے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ چھت پر سے تیسرے ڈوگرے نے آواز دی۔

"رام لال اوئے تم چپ کیوں ہو گئے ہو باتیں کرتے کرتے۔ سگریٹ دوں؟"

گل میر تیزی سے بارک کی دیوار کے سامنے آکر زمین پر بالکل سیدھا لیٹ گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں سائی لینسر لگا پستول تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جب نیچے سے رام لال سپاہی کی

آواز نہ آئی تو اوپر والا سپاہی نیچے ضرور جھانکے گا۔ اور ایسے ہی ہوا۔ جب رام لال نے کوئی جواب نہ دیا تو چھت پر بیٹھا سپاہی اپنے کھوکھے پر سے اٹھا اور اپنے ساتھی گارڈز کو گالیاں دیتا چھت کی منڈیر پر آیا اور نیچے جھانک کر بولا۔

"اوئے کہاں مرگئے ہو تم؟"

ستاروں بھرے نیلے آسمان کے پس منظر میں گل میر کو اس ڈوگرہ سپاہی کا سر بالکل صاف نظر آیا۔ یہ بڑا اچھا ٹارگٹ تھا۔ گل میر پہلے سے پستول اپنے دونوں ہاتھوں میں لئے نشانہ باندھے تیار لیٹا تھا۔ جونہی ڈوگرے کا سر نمودار ہوا گل میر نے اپنی ساری مہارت کو ایک جگہ جمع کرتے ہوئے پستول کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ "ٹھک" کی آواز پیدا ہوئی اور پستول میں سے نکل کر گولی ڈوگرہ سپاہی کے ماتھے میں لگی اور کھوپڑی کو چیرتی ہوئی پچھلی طرف سے نکل گئی۔ یہ گل میر کی خوش قسمتی تھی کہ ڈوگرہ مرنے کے بعد نیچے نہیں گرا تھا ورنہ اس کے شور سے مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ اس کی گردن وہیں لڑھک گئی تھی۔

گل میر دو چار سکینڈ تک پستول اسی طرح اپنے ہاتھوں میں تانے نشانہ باندھے زمین پر سیدھا پڑا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا نشانہ خطا نہیں گیا اور ڈوگرے کا کام تمام ہو چکا ہے تو وہ ایک طرف کو لڑھک کر اٹھ بیٹھا اور لپک کر بارک کے دروازے کے پاس آگیا۔ بارک کا لکڑی کا دروازہ لوہے کے ایک راڈ سے بند کیا گیا تھا۔

گل میر نے راڈ کو آہستہ سے کھینچ کر نکال دیا۔ دروازہ کھول کر اندر گیا۔ تنگ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا۔ سکندر فرش پر اوندھے منہ نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔

"سکندر، سکندر میں گل میر ہوں۔ میں تمہیں نکالنے آیا ہوں۔ اٹھو۔ ہمت کرو۔"

سکندر کو بڑا ٹارچر کیا گیا تھا۔ مگر وہ ایک سخت جان کمانڈو تھا۔ اس نے گل میر کی آواز پہچان لی تھی۔ اس نے گردن اوپر اٹھا لی۔ گل میر نے اسے سہارا دیا۔ سکندر نے کہا۔

"میں چل سکتا ہوں گل۔ میں چل سکتا ہوں"۔

مگر وہ لڑکھڑا گیا۔ گل میر اسے سہارا دے کر بارک سے باہر لے آیا۔ سکندر کو فوراً

احساس ہو گیا کہ گل میر جان کی بازی لگا کر وہاں پہنچا ہے اور اسے دیر نہیں کرنی ہو گی۔ وہ گل میر کے کاندھے کا سہارا لئے جتنی تیز چل سکتا تھا چل کر خاردار دیوار والے شگاف کے پاس پہنچ گیا۔ پہلے سکندر رینگ کر گذرا۔ اس کے بعد گل میر بھی کیمپ کی چار دیواری کے باہر آگیا۔ اب وہ گھاس پر رینگنے کی بجائے جھکے جھکے ایک طرف ڈھلان اترنے لگے۔ گل میر نے کہا۔

"گھوڑے۔ نیچے ہیں۔"

شہتوت کا درخت اندھیرے میں کالے بادل کے ٹکڑے کی طرح نظر آرہا تھا۔ دونوں گھوڑے اس کے نیچے بندھے تھے۔ گل میر نے سکندر کو گھوڑے پر بٹھانے میں مدد دی۔ سکندر نے کہا۔ "گل میر۔ ہمیں ٹبوت کی طرف نکل جانا چاہئے"۔

گل میر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"نہیں سکندر۔ ہم بٹ گام والی کمین گاہ پر جائیں گے وہاں زمان اور اسد بٹ ہماری راہ دیکھ رہے ہیں۔ تمہیں کچھ روز آرام کی ضرورت ہے"۔

"آرام ہم پر اس وقت تک حرام ہے گل جب تک کشمیر میں ایک بھی غاصب بھارتی فوجی موجود ہے"۔ سکندر نے پر جوش لہجے میں کہا۔ انھوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور گھوڑے رات کے اندھیرے میں پہاڑی راستے پر چل پڑے۔ ڈھلان سے اترنے کے بعد ایک کچی سڑک پہاڑی کی بغل میں بل کھاتی بٹ گام کی پہاڑیوں کی طرف جا رہی تھی۔ اس سڑک پر آتے ہی دونوں کشمیری مجاہدوں نے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی اور گھوڑے دیکھتے دیکھتے خطرناک علاقے سے باہر نکل گئے۔

سورج نکلنے والا تھا کہ دونوں گھوڑ سوار بٹ گام کی گھاٹیوں میں داخل ہوئے اور پھر پہاڑی ڈھلان پر باہر کو نکلی ہوئی چٹان کی طرف رخ کر لیا۔ یہاں خفیہ کمین گاہ میں اسد بٹ اور زمان جاگ رہے تھے۔ ان کے دوسرے ساتھی اپنے مشن پر جا چکے تھے۔ اسد بٹ نے کان ایک طرف لگاتے ہوئے زمان سے کہا۔

"کاکا! مجھے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آرہی ہے"۔

زمان بھی ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"ہاں میرا خیال ہے گل میر ہمارے ساتھی کو بھارتی قیدی کیمپ سے نکال

لایا ہے۔"

انھوں نے برین گنیں اٹھائیں اور کمین گاہ سے باہر نکل آئے۔ سامنے جھاڑیوں میں چھپے ہوئے پہرے دار کمانڈو بھی ان گھوڑوں پر نظریں جمائے ہوئے تھے جو چیڑھ اور چنار کے درختوں میں قدم قدم چلتے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ زمان نے جھاڑیوں کی طرف منہ کرکے کہا۔

"ابھی گولی مت چلانا۔"

گھوڑے قریب آگئے تھے۔ گل میر نے دور ہی سے خفیہ کوڈ میں ایک لفظ پکارا۔ اسد بٹ اور زمان نے اپنے ساتھی کی آواز پہچان لی تھی۔

"گل! تمہارے ساتھ کون ہے؟"

"سکندر ہے کاکا!"

گل میر کے اس جملے سے وہاں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ زمان اور اسد بٹ نے آگے بڑھ کر سکندر کو گھوڑے سے اتارا۔ کمین گاہ میں لے جا کر اسے لٹا دیا۔ لالٹین روشن تھی۔ سکندر کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور گردن اور گالوں پر سگریٹ کے جلنے کے زخم تھے۔ جسم پر بھی چوٹوں کے نشان تھے۔ سکندر کہنے لگا۔

"تم میرے زخموں کی پرواہ نہ کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔ یہ بتاؤ کہ ہمیں اگلے مشن پر کب چلنا ہے؟"

یہ کہا اور سکندر بے ہوش ہو گیا۔

مسلسل چھ روز تک سکندر کا علاج ہوتا رہا۔ ساتویں دن وہ اٹھ کر چل پھر سکتا تھا۔ اس کے گالوں کے زخم ٹھیک ہو رہے تھے۔ جسم میں بھی توانائی واپس آگئی تھی۔ ساتویں روز دوپہر کے وقت اس نے زمان سے پوچھا۔

"زمان! گل میر نے مجھے اشارہ دیا تھا کہ ہمیں کسی بڑے اہم مشن کی تکمیل پر روانہ ہونا ہے۔ کیا تم مجھے اس مشن کے بارے میں بتاؤ گے؟"

زمان نے کمین گاہ کے دروازے کی طرف دیکھا۔ باہر دن کی روشنی پھیلی تھی۔ باہر سے گل میر اور اسد بٹ اندر داخل ہوئے۔

"لالا! گل میر تمہیں خود سب کچھ بتا دے گا۔"

اس نے گل میر کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ گویا کہہ رہا ہو کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم سکندر کو اپنے اگلے اہم مشن کی تفصیلات سے آگاہ کر دیں۔ گل میر اور اسد بٹ سکندر کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ گل میر بولا۔

"سکندر! یہ بڑا اہم اور نازک مشن ہے ہم" ...... سکندر نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"گل میر، ہمارے لئے کبھی کوئی مشن غیر اہم نہیں ہوا۔ تم بات کرو۔ ہمیں کیا کرنا ہو گا۔"

گل میر نے ہونٹوں کو تھوڑا سا سکیڑا۔ پھر سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے بولا۔

"تو پھر آج سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے ہمارے ساتھ چلنا"۔

"کہاں؟" سکندر نے سوال کیا۔

"جہاں ہمارا اہم ترین مشن شروع ہونے والا ہے۔"

گل میر نے جواب دیا۔ اسد بٹ اور زمان خاموش بیٹھے تھے۔ انہیں اس مشن کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ تیسرے پہر چاروں کشمیری مجاہد زمان، سکندر، گل میر اور اسد بٹ خچروں پر سوار ہو کر چٹان والی ڈھلان سے اتر کر سنسان جنگل میں جنوب مشرق کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے کشمیری دیہاتیوں والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ گل میر اور زمان نے اپنے خچروں پر سوکھی لکڑیوں کا ایک ایک گٹھا بھی لاد رکھا تھا۔ سکندر نے اپنا حلیہ یوں تبدیل کیا ہوا تھا کہ ڈاڑھی مونچھیں بڑھالی تھیں اور سر پر کشمیری دیہاتی ٹوپی جمائی ہوئی تھی۔ ان سب کے پاس بھرے ہوئے پستول اور کمانڈو چاقو تھے۔

دشوار گزار غیر آباد جنگلی علاقوں سے گزرتے ہوئے وہ سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ایک پہاڑی سلسلے میں پہنچ گئے۔ گل میر آگے آگے تھا اور ان کی راہ نمائی کر رہا تھا۔ وہ ایک پہاڑی پگ ڈنڈی پر چلے جا رہے تھے جو جنگلی درختوں میں چھپی ہوئی تھی۔ دو ڈھائی سو فٹ نیچے پکی سڑک تھی جو پہاڑیوں میں بل کھاتی چڑھائی کی طرف جاتی تھی۔ جب یہ کشمیری مجاہد پہاڑی کی دوسری طرف پہنچے تو گل میر نے خچر روک لیا اور ہاتھ کی اشارے سے اترنے کو کہا۔ وہ خچروں سے اتر پڑے۔ اسد بٹ نے خچروں کو ایک

درخت کے نیچے باندھ دیا۔ سکندر گل میر کے پاس آ گیا۔ پہاڑی کی چوٹی پر یہ ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں چھوٹے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ چنار کے درختوں کے نیچے جنگلی گھاس سردی میں زرد پڑ رہی تھی۔

گل میر نے سکندر کو ساتھ لیا اور پہاڑی میدان کے کنارے پر آ کر بیٹھ گیا۔ سکندر بھی بیٹھ گیا۔ زمان اور اسد بٹ بھی وہاں آ گئے۔

سکندر نے دیکھا کہ پہاڑی کی نچان میں ایک وادی ہے جو بہت بڑے پیالے کی مانند نظر آتی تھی۔ اس وادی میں آہنی گارڈروں والا قینچی نما ایک پل تھا جو اس طرح کی پہاڑی سڑک کو سامنے والی پہاڑی سڑک سے ملاتا تھا۔ اس کے نیچے دریائے جہلم بہہ رہا تھا۔ پل کوئی دو ڈھائی سو فٹ لمبا اور پندرہ بیس فٹ کے قریب چوڑا تھا۔ اس وقت پل پر سے انڈین ملٹری کی کچھ گاڑیاں ہلکی رفتار سے گزر رہی تھیں۔ سکندر نے کسی قدر تعجب سے کہا۔

"گل! پہلے تو یہاں کوئی پل نہیں تھا۔"

گل میر نے کہا۔

"ہاں۔ تم بہت دیر بعد ادھر آئے ہو۔ پہلے یہاں کوئی پل نہیں تھا اور بھارتی فوجی گاڑیاں بانہال کی جانب سے ایک طویل ترین خطرناک پہاڑی راستہ طے کر کے سری نگر کو جاتی تھیں۔ ایک تو وہ راستہ تنگ اور مخدوش تھا جہاں سے بڑی گاڑیاں نہیں گزر سکتی تھیں دوسرے ایک پورا دن لگ جاتا تھا۔ ٹینک تو اس طرف سے گزر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہاں اکثر فوجی گاڑیاں کھڈوں میں گرتی رہتی تھیں۔ بھارتی فوج نے دو مہینے ہوئے یہ نیا پل بنایا ہے۔ اس پل کی تعمیر سے ایک تو سرینگر کا فاصلہ کم ہو گیا ہے دوسرے اس پر سے بھاری فوجی گاڑیاں یہاں تک کہ ٹینک بھی گزر سکتے ہیں۔"

زمان نے گل میر کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"انڈین ملٹری نے ہماری تحریک آزادی میں جوش و خروش آتے

دیکھ کر سری نگر میں فوجی طاقت میں زبردست اضافہ کر دیا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ پل ہے۔ اس پل کے ذریعے سرینگر میں مقیم بھارتی فوجی یونٹوں کو اسلحہ، توپیں اور ٹینک بھاری تعداد میں اور تیزی سے پہنچنے لگے ہیں"۔

زمان خاموش ہو گیا۔ سکندر سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ وہ بڑے غور سے نیچے وادی میں دریائے جہلم کی طوفانی لہروں کے اوپر پھیلے ہوئے بہت بڑے آہنی پل کو دیکھ رہا تھا۔ عین اس وقت سامنے کی طرف سے چار انڈین ٹینک نمودار ہوئے۔ وہ آگے پیچھے چل رہے تھے۔ وہ بڑی آسانی سے پل پر سے گزرنے لگے۔ اسد بٹ نے کہا۔

"یہ بھارتی ٹینک ہمارے گھروں پر گولے برسانے اور حریت پسندوں پر مشین گنوں کی بوچھاڑ کرنے کے لئے سری نگر جا رہے ہیں۔"

گل میر بولا۔

"صرف یہی نہیں۔ ابھی مزید ٹینک آئیں گے اور سری نگر میں بھارتی غاصب فوجوں کو اسلحہ اور گولہ بارود کی سپلائی ملتی رہے گی اور یہ سارا اسلحہ، سارا گولہ بارود ہمارے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ ہمارے مجاہدوں کے سینے چھلنی کئے جائیں گے اور ہمارے مکانوں کو آگ لگائی جائے گی۔ ہمارے کھیت کھلیان جلائے جائیں گے۔"

سکندر نے گل میر کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"مت دہراؤ یہ باتیں گل میر۔ میں سب جانتا ہوں۔ کون نہیں جانتا کہ ساری دنیا جانتی ہے کہ بھارت نے ہمارے کشمیر پر اپنی فوجی طاقت سے زبردستی اور کشمیری مسلمانوں کی مرضی کے خلاف قبضہ کر رکھا ہے اور وہ کشمیریوں کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے۔"

کچھ دیر کے لئے وہاں اذیت بھرا سناٹا چھا گیا۔ زمان نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا

"ہمیں یہ پل اڑانا ہے سکندر ——— بس ہم یہاں اس لئے آئے

ہیں کہ تم بھی پل کا مشاہدہ کر لو۔ اس کا جائزہ لے لو۔ ہمیں ابھی
اس پل کی تباہی کی سکیم بنانی ہو گی اور پھر اس پر فوراً عمل شروع
کرنا ہو گا۔ اس پل پر سے جتنی گاڑیاں جتنے بھارتی ٹینک' جتنے
بھارتی فوجی گزریں گے کشمیر میں اس سے دس گناہ زیادہ مسلمانوں کا
خون بہے گا۔"

سکندر بڑے غور سے پل کو دیکھ رہا تھا جہاں سے بھارتی ٹینک گزر کر نیچے پکی سڑک پر
اتر آئے تھے۔ گل میر کی آنکھیں بھی پل پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"پل کی بارہ قینچیاں ہیں۔ اس حساب سے چوبیس دیوہیکل گارڈر
ہیں۔ اگر ہم چھ قینچیوں کے درمیان ڈائنامائیٹ لگانے میں کامیاب
ہو جائیں تو یہ پل کو اڑانے اور کافی عرصے تک بیکار کرنے کے لئے
کافی ہو گا۔"

اسد بٹ بولا۔ "بھارتی فوجی دوبارہ پل بنا لیں گے۔"

"ہم اسے دوسری بار بھی اڑا دیں گے خواہ ہم سب پل کے ساتھ ہی مر جائیں۔"

سکندر نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ زمان پیچھے نگاہ رکھے ہوئے تھا جہاں کچھ فاصلے پر
چنار کے درختوں کے نیچے ان کے خچر چر رہے تھے۔ سکندر بولا۔

"یہاں پنسل بم کام نہیں دیں گے۔ ہمیں ڈائنامائیٹ چھڑیوں کے
گٹھے لگانے ہوں گے۔ کام مشکل ہے مگر ہمیں کرنا ہے۔ ہر حالت
میں اس پل کو اڑانا ہے۔"

پھر پل کی دونوں جانب کی فوجی چوکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے سکندر نے گل میر سے پوچھا

"یہاں انڈین فوج کی کتنی نفری ہے؟"

گل میر بولا۔

"پل کی دونوں طرف گن پوسٹیں ہیں جہاں طیارہ شکن توپیں بھی
لگی ہیں۔ ڈھلان پر دونوں طرف ٹینک بھی ہنگامی حالت کے لئے
کیمو فلاج کئے گئے ہیں۔ فوج کی نفری زیادہ نہیں ہے مگر پل پر

حفاظتی انتظامات بہت سخت ہیں۔ رات کو پل پر پہرے کی گشت
بھی ہوتی ہے۔ دونوں طرف سے سرچ لائیٹوں کی روشنی پل پر چکر
لگاتی رہتی ہے۔"

سکندر خاموشی سے سن رہا تھا پھر پیچھے ہٹ گیا۔ گل میر اور اسد بٹ بھی پیچھے ہو کر گھاس
پر بیٹھ گئے۔ سکندر بولا

"ادھر اپنے خچروں کے پاس آ جاؤ۔ یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔"

وہ خچروں کے پاس زمین پر بیٹھ گئے۔ زمان نے تھیلا کھول کر جوار کی روٹی نکال کر اس کے
ٹکڑے سب میں تقسیم کئے اور وہ گڑ کے ساتھ کھانے لگے۔ گل میر نے کہا۔

"سکندر لالا! کون نہیں جانتا کہ تم ڈائنامائیٹ لگانے کے ماہر ہو مگر
میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔ اسد بٹ بھی ہماری مدد کرے
گا۔"

زمان نے کہا۔

"پل پر چڑھنا مشکل نہیں ہو گا"۔

سکندر کہنے لگا۔

"ہمیں پل پر چڑھنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی۔ ہم دریا
میں تیرتے ہوئے آئیں گے اور پل کے عین نیچے دو ٹکڑیوں میں
بٹ جائیں گے۔"

گل میر کے ذہن میں بھی یہی سکیم تھی۔ زمان نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ یہاں دریا
کی موجوں کی رفتار بہت تیز ہے۔ اس پر گل میر بولا۔

"لیکن دریا گہرا ہے۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے۔ اگر دریا
کی گہرائی کم ہوتی تو ہمارے لئے پل تک پہنچنا مشکل ہو جاتا۔"

سکندر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے خچر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"اب واپس چلو۔ باقی باتیں اڈے پر جا کر ہوں گی۔ شام ہو رہی
ہے۔"

وہ سب اپنے خچروں پر سوار ہو کر واپس چل پڑے۔ وہ جس راستے سے آئے

تھے اسی راستے سے واپس جا رہے تھے۔ سورج مغرب کی پہاڑیوں میں جھکتا چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے آدھا راستہ طے کیا تھا اور ایک غیر ہموار پہاڑی قطعے میں سے گزر رہے تھے کہ اچانک انہیں عورتوں کی چیخوں اور واویلا کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ وہیں رک گئے۔ یہ آوازیں بائیں جانب نیچے سے آ رہی تھیں۔ چاروں کشمیری مجاہد خچروں سے اتر کر اس طرف دوڑے۔ انہوں نے نیچے دیکھا تو ایک دل خراش منظر نظر آیا۔ نیچے چھ سات کچے مکان تھے جن کے باہر ایک بھارتی فوجی جیپ کھڑی تھی۔ ایک ڈوگرہ فوجی رائفل تانے جیپ کے پاس کھڑا تھا۔ دو فوجی ایک مکان کے اندر سے ایک جوان کشمیری لڑکی کو گھسیٹ کر باہر لا رہے تھے۔ لڑکی تڑپ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ اس کی بوڑھی ماں ' باپ اور دوسری عورتیں رحم کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ ہاتھ جوڑ رہی تھیں مگر ڈوگرہ فوجیوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ لڑکی کو گھسیٹ کر جیپ کی طرف لا رہے تھے ' جہاں ایک سپاہی پہلے سے رائفل تانے تیار کھڑا تھا اور ڈوگری زبان میں گاؤں کی بوڑھی عورتوں کو گالیاں دے رہا تھا۔

چاروں کشمیری مجاہدوں کا خون کھول اٹھا۔ گل میر نے پستول نکالا وہ فائر کرنے ہی والا تھا کہ سکندر نے اس کا پستول نیچے کر دیا۔

"ٹھہرو۔ کیا کرنے لگے ہو۔"

سکندر نے پیچھے ہٹ کر اسد بٹ سے کہا۔

"تم اوپر سے ہو کر نیچے آ کر پوزیشن سنبھالو۔ زمان تم اس جگہ بیٹھو۔ گل میر تم کسی طرح فوجی جیپ کے پیچھے پہنچ کر پوزیشن لے لو۔ میں جاتا ہوں۔"

گل میر بولا۔

"مگر ہم یہاں سے بھی ان فوجیوں کو ہلاک کر سکتے ہیں۔"

سکندر نے جھنجھلا کر غصے سے دبی زبان میں کہا۔

"فاصلہ زیادہ ہے۔ نشانہ خطا گیا تو فوجی ہمیں گھیرے میں لے لیں گے۔ وہ فائر کر کے اپنے ساتھیوں کو بھی بلا سکتے ہیں۔ ہمارا زندہ رہنا بھی بہت ضروری ہے۔ میں جاتا ہوں۔ تمہیں جیسا کہا ہے

ویسا ہی کرنا۔"

یہ کہہ کر سکندر ڈھلان اتر کر فوجی جیپ کے پاس جاتے ہوئے بڑی عاجزی سے بولا۔

"ماراج یہ لوگ بے قصور ہیں۔ یہ تو دیہاتی لوگ ہیں۔ ان پر رحم کریں۔"

جو ڈوگرہ جیپ کے پاس کھڑا تھا اس نے سکندر پر رائفل تان لی۔ جو دو فوجی لڑکی کو پکڑ کر لا رہے تھے وہیں رک گئے۔ ایک فوجی نے گرج کر کہا۔

"بکواس بند کرو جانگلی۔ نہیں تو تمہیں شوٹ کر دیں گے۔ بھاگ جا یہاں سے۔"

یہاں سکندر سے ایک غلطی ہو گئی۔ وہ ایک ماہر اور تجربہ کار کمانڈو تھا مگر غلطی کبھی کبھی عقلمند آدمی بھی کر بیٹھتا ہے۔ شاید اس وقت سکندر پر جذباتی غلبہ بھی تھا اور اس کے سینے میں بھارتی فوجیوں کے ظلم کے خلاف نفرت کے طوفان اٹھ رہے تھے۔ اسے جیب سے پستول نکال کر کسی ایک ڈوگرے پر فائر کر دینا چاہیے تھا کیونکہ اسد بٹ گل میر اور زمان اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال چکے تھے مگر سکندر نے ایسا نہ کیا بلکہ اپنے آپ کو وہ دونوں فوجیوں کے قریب لے آیا اور کشمیری لڑکی کو چھڑانے ' اسے ظالموں کے پنجے سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر ڈوگرہ فوجی نے سکندر پر فائر کر دیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ گولی اس کی گردن کے قریب سے ہوتی ہوئی نکل گئی۔ فائر ہوتا دیکھ کر سکندر نے اب پستول نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر دیر ہو چکی تھی۔ ڈوگرہ فوجیوں نے سکندر کو نیچے گرا دیا۔ ایک نے رائفل کی نالی اس کی طرف کر دی۔ وہ فائر کرنے لگا تو دوسرے فوجی نے چلا کر کہا۔

"اس کی جیب میں پستول ہے۔ یہ کمانڈو ہے۔ اسے شوٹ نہ کرنا۔ اسے ساتھ لے چلو۔ دوسرے کمانڈو بھی اس کے ساتھ ہوں گے۔"

لڑکی زمین پر ایک طرف سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ دوسری عورتیں اور لڑکی کا باپ غم سے نڈھال پیچھے کھڑے تھے۔ لڑکی کے سر پر جیپ والا ڈوگرہ رائفل تانے کھڑا تھا۔ دونوں دوسرے ڈوگروں نے سکندر کو زمین پر سے اٹھایا۔ ایک نے رائفل کا رخ کرتے ہوئے

گرج کر کہا۔

"جیپ میں چلو۔ چلو۔ جلدی"۔

سکندر ہاتھ اٹھائے جیپ کی طرف چلا۔ انہوں نے اس کی تلاشی لی تو اس کی جیب میں سے پستول اور کمانڈو چاقو برآمد ہوا۔ پہلے فوجی نے چلا کر کہا۔

"یہ خطرناک کمانڈو ہے۔ اس کی مشکیں کس دو گھانسی لال۔"

ڈوگرہ گھانسی لال جیپ میں سے رسی نکال رہا تھا کہ اسے اسد بٹ نے جیپ کے پیچھے درخت کی اوٹ میں سے اپنی پستول کی زد میں لے لیا۔ دوسرے دونوں ڈوگرہ فوجیوں کو زمان اور گل میر نے اپنا اپنا ٹارگٹ بنا لیا۔ جونہی ڈوگرے فوجی نے سکندر کو رائفل کا بٹ مار کر جیپ کی طرف دھکیلا، گل میر کی پستول سے گولی فائر ہوئی اور ڈوگرہ سپاہی منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اسد بٹ اور زمان نے اپنے اپنے نشانوں پر فائر کر دیا۔ ان کے نشانے کبھی خطا نہیں گئے تھے۔ دونوں گولیاں دونوں ڈوگرہ فوجیوں کی کھوپڑیوں کو پھاڑتی ہوئی نکل گئیں۔ ان کے بھیجے اڑ گئے اور وہ کٹے ہوئے درختوں کی طرح زمین پر گر پڑے۔ اسد بٹ زمان اور گل میر اپنی اپنی پوزیشنوں سے نکل کر نیچے آ گئے۔ سکندر نے کشمیری لڑکی کے سر پر ڈوپٹہ اوڑھایا اور کہا۔

"بہن! جب تک تیرے بھائی زندہ ہیں تیری حرمت کی طرف کوئی میلی آنکھ اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتا۔"

گل میر نے گاؤں کی عورتوں اور لڑکی کے باپ سے کہا۔

"آپ لوگ بھول جائیں کہ یہاں کبھی کوئی فوجی ڈوگرہ اپنی جیپ لے کر آیا تھا۔ ہم ان کافروں کی لاشوں اور جیپ کو لے جائیں گے۔ ان کا نام و نشان بھی یہاں نہیں چھوڑیں گے۔"

انہوں نے فوراً تینوں بھارتی ڈوگرہ فوجیوں کی لاشوں کو جیپ میں ڈالا۔ جیپ کو کافی آگے گھاس میں لے گئے۔ پھر وہاں زمین پر سے خون اور جیپ کے ٹائروں کے نشان بالکل ختم کر دیئے۔ بوڑھے کشمیری نے کہا۔

"بیٹا! تم رحمت کا فرشتہ بن کر آ گئے۔ نہیں تو ہمارے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔"

گل میر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کاکا! ہم کشمیر کو بھارتی فوجی درندوں سے پاک کر کے ہی دم لیں گے۔"

بوڑھے کشمیری کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس نے پرجوش نعرہ لگایا۔

"یا رسول اللہ! یا رسول اللہ! کشمیر آزاد ہو گا۔" یا رسول اللہ! یا رسول اللہ!"

اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور وہ اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔

سکندر نے اس ڈوگرے کی جیب میں سے اپنی پستول اور چاقو نکال لیا جس نے یہ چیزیں اس سے چھینی تھیں۔ ان کے خچر اوپر درختوں میں ادھر ادھر چر رہے تھے۔ سکندر نے کہا۔

"ہمیں یہ جیپ کسی گہری کھڈ میں پھینک دینی چاہیے۔ فوجی یہی سمجھیں گے کہ الٹ گئی تھی۔"

اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ کافی آگے لے جا کر جیپ کو لاشوں سمیت اوپر سے گہری کھڈ میں لڑھکا دیا۔ اس کے بعد واپس آ کر اپنے خچروں پر سوار ہوئے اور اپنے خفیہ ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات ہو چکی تھی جب وہ اپنی کیمن گاہ میں پہنچے۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد انہوں نے تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ زمان نے ساوار میں سبز کشمیری چائے دم کر دی۔ غار کے باہر دو جوان حسب معمول پہرہ دینے لگے۔ غار میں موم بتی کی جگہ لالٹین روشن کر دی گئی۔ اور سبز چائے کی پیالیاں ہاتھوں میں تھامے چاروں کمانڈو اپنے نئے مشن پر گفتگو کرنے لگے۔ سکندر نے گل میر سے پوچھا۔

"ڈائنامائیٹ کی چھڑیوں کا بندوبست کرنا ہو گا۔ کسی بھارتی ڈپو سے اڑا لیں گے۔"

زمان کہنے لگا۔

"غنی بٹ کے پاس بھارتیوں سے چھینا ہوا کافی اسلحہ موجود ہے۔ سب مجاہد ضرورت پڑنے پر اس سے اسلحہ لیتے ہیں۔ میں صبح ہی

صبح اس کے پاس جاؤں گا۔"

اسد بٹ بولا۔

"ہمیں کچھ ہینڈ گرنیڈ' برین گنوں اور فالتو راؤنڈز کی بھی ضرورت ہو گی۔"

سکندر نے چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد پیالی زمین پر رکھ دی اور بولا۔

"ہمیں کم از کم چھ ڈائنامائیٹ کے گٹھے تو ضرور ہی چاہئیں۔ اس طرح پل کی تباہی یقینی ہو جائے گی۔"

گل میر نے کہا۔

"میں اور زمان منہ اندھیرے ہی نکل جائیں گے۔ مطلوبہ اسلحہ جہاں کہیں سے بھی ملا لے کر ہی آئیں گے۔"

اسد بٹ نے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"بھارتی حکومت یہ الزام لگاتی ہے کہ پاکستان کشمیریوں کی اسلحے سے مدد کر رہا ہے۔ کاش ایسا ہوتا۔ اگر پاکستان ہمیں اسلحہ دے رہا ہوتا تو ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ پاکستان کی اخلاقی مدد تو ہمیں حاصل ہے مگر پاکستان اس سے آگے ہماری کوئی مدد نہیں کر رہا۔"

گل میر نے کہا۔

"ہمارے لئے اخلاقی مدد ہی بہت ہے۔ باقی یہ جنگ ہمیں خود لڑنی ہو گی اور خود ہی لڑیں گے۔ دشمن سے اسلحہ چھین کر اس کے خلاف استعمال کریں گے۔ زمان! صبح سب سے پہلے غنی کے پاس جائیں گے۔ وہ کوٹلی باغ کے گاؤں میں ہی رہتا ہے ناں؟"

"ہاں۔ ابھی تک تو وہیں ہے"۔ زمان نے چائے پیتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے بعد سکندر نے گل میر اور زمان کو مزید کچھ ضروری چیزیں بتائیں اور تاکید کی کہ وہ یہ سب کچھ لے کر کل دوپہر کے بعد تک کمیں گاہ پہنچ جائیں۔

"ہم کل رات پل کی طرف پیش قدمی کریں گے۔"

گل میر' اسد بٹ اور زمان کے چہرے بھی جذبہ حب الوطنی سے روشن ہو گئے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کل رات اللہ کی راہ میں جہاد کرنے جاتے رہے ہیں۔

دوسرے دن صبح صبح گل میر اور زمان اسلحہ لینے کے لئے وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے صبح کی نماز بھی ایک جنگل میں پڑھی۔ سکندر اور اسد بٹ نے کمیں گاہ میں ہی صبح کی نماز ادا کی۔ پھر وہ دشمن کے پل کو اڑانے کی تفصیلات پر باتیں کرنے لگے۔ سکندر واقعی اس کام میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اس نے بعض ایسی نکتے کی باتیں بیان کیں کہ اسد بٹ بھی اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ دوپہر کے بعد گل میر اور زمان بھی پہنچ گئے انہوں نے ایک خچر پر بڑا سا تھیلا لادا ہوا تھا جس کے منہ میں سے سوکھی لکڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں مگر اس کے اندر اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ وہ تمام مطلوبہ اسلحہ لے آئے تھے۔ سکندر بڑا خوش ہوا۔ اس کے پاس دستی بم' دو برین گنیں' ان کے بے شمار فالتو راونڈ اور ڈائنا مائیٹ کے دس بم تھے۔ سکندر انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ ہر بم بیس عدد بارودی چھڑیوں پر مشتمل تھا۔ یہ چھڑیاں ایک گٹھے کی شکل میں بندھی ہوئی تھیں۔ ہر بم کے درمیان میں چھوٹا سا کلاک لگا تھا۔ ان بموں پر پلاسٹک چڑھا ہوا تھا۔ سکندر نے اس کی مہروں کو پڑھتے ہوئی کہا۔

"یہ پونا آرڈی نینس فیکٹری کے تیار شدہ ہیں۔ دیکھو اس پر پونا فیکٹری کی مہر لگی ہوئی ہے۔"

ہر بم کے ساتھ فیتہ بھی لگا تھا تاکہ اسے جہاں لگانا ہو لگا کر باندھ دیا جائے۔ گل میر نے کہا

"کافی طاقتور بم ہیں سکندر۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

سکندر نے ایک بم کے گٹھے کو دوبارہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"بم اپنے طور پر تو تباہی ضرور مچاتا ہے مگر اصل طاقت بم میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسے صحیح جگہ پر لگایا جائے۔ ہم انہیں پل کے گارڈوں کی قینچیوں میں لگائیں گے۔ جہاں پھٹنے کے بعد بڑے سے بڑے پل کا کھڑے رہنا ایک ناممکن بات ہے۔ میں

ان بموں سے کلکتے کے ہوڑہ برج کے پرزے اڑا سکتا ہوں۔"

شام ہونے تک سکندر نے اپنی کمانڈو پارٹی کو سب کچھ سمجھا دیا کہ انہیں کہاں سے چل کر کس مقام پر سے دریا میں اترنا ہو گا۔ کہاں تک درختوں کی شاخوں کے گٹھوں پر سوار ہو کر دریا میں سفر کرنا ہو گا اور کہاں سے دریا میں اتر جانا ہو گا۔ یہ سب بڑے تجربہ کار تیراک تھے اور غوطہ لگانے میں ایک سے ایک ماہر تھا۔ جب سورج غروب ہو گیا اور شام کے سائے پوری طرح چھا گئے تو وہ تیز رفتار خچروں پر بیٹھ کر اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

خوش قسمتی سے اس رات آسمان پر بادل چھا رہے تھے جن کی وجہ سے رات زیادہ اندھیری ہو گئی تھی۔ ان سب نے اپنی اپنی کلائی کی گھڑیاں ملا لی تھیں۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے جب وہ پل سے دو فرلانگ پیچھے دریائے جہلم کے کنارے پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کے ہاتھ خچر واپس بھجوا دیئے۔ یہاں انہوں نے درختوں کی گری پڑی شاخوں اور کچھ جھاڑیوں کو چاقوں سے کاٹ کر چار گٹھے بنائے۔ انہیں رسیوں سے باندھا اور اللہ کا نام لے کر دریا میں اتر گئے۔ انہوں نے سیاہ جیکٹیں اور سیاہ پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ چہروں پر لالٹین کی سیاہی ملی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے گورے کشمیری چہرے رات کی سیاہی میں جذب ہو گئے تھے۔ اسلحہ پلاسٹک کے تھیلے میں بند تھا اور سکندر نے اپنے گٹھے پر لاد رکھا تھا۔ سب کے پاس اپنی اپنی برین گن' سائی لینسر والے پستول اور دو دو دستی بم تھے مگر سکندر کی طرف سے انہیں یہ حکم تھا کہ اشد ضرورت کے وقت فائر کیا جائے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ میں بھی سبز پوش کے ساتھ ان بہادر حریت پسند مجاہدوں اور کشمیری جانثاروں کے اوپر پرواز کر رہا تھا مگر ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

سبز پوش کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر مجھے سبز پوش کی شفیق اور جذبات بھری آواز سنائی دی۔

"دیکھو۔ یہ مجاہد شہادت کا رتبہ پانے جا رہے ہیں۔ ان میں سے

صرف اسد بٹ ہی واپس آ سکے گا"۔

چاروں کشمیری جانثار کمانڈو دریائے جہلم کے یخ ٹھنڈے پانی میں لکڑی کے گٹھوں کو بغل میں لئے پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ رات کی تاریکی میں ڈوگرہ فوج کے تعمیر کردہ آہنی پل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک خاص مقام پر پہنچنے کے بعد سکندر نے پیچھے ہاتھ سے اشارہ کیا اور درختوں کی ڈالیوں والے گٹھے کو چھوڑ دیا۔ وہ اب دریا کے بہاؤ پر آہستہ آہستہ تیرنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسد بٹ' زمان اور گل میر بھی گٹھوں سے الگ ہو کر دریا کے پانی میں اتر گئے۔

آسمان پر چمکنے والے ستارے گہرے بادلوں میں چھپ گئے تھے۔ آگے آگے سکندر تھا۔ اس کے پیچھے اسد بٹ' پھر گل میر اور آخر میں زمان کمانڈو تھا۔ دور سے انہیں پل کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ وہ تیرتے تیرتے ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ سکندر نے بازو پانی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھنا۔ پل کے درمیانی ستون پر سے ہم الگ ہو جائیں گے۔

اسد بٹ گل میر اور زمان نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر اثباتی اشارہ کیا اور سکندر تیرنے لگا۔ اس وقت دو دو بم زمان اسد بٹ اور گل میر کے پاس تھے جبکہ چار بم سکندر نے اپنے پیٹ کے ساتھ باندھے ہوئے تھے۔ پل قریب آ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی روشنیاں صاف نظر آنے لگی تھیں۔ وہ پل کے درمیانی کنکریٹ کے بنے ہوئے گول ستون کی طرف بڑھ رہے تھے۔ درمیان میں ایسے بارہ ستون بنائے گئے تھے جن پر پل کا مضبوط فولادی ڈھانچہ کھڑا تھا۔ پل پر کھڑے گارڈز انہیں نظر آ رہے تھے۔ چاروں کشمیری کمانڈو کے صرف سر پانی سے باہر تھے۔ وہ اندھیرے میں تھے۔

جب پل کا درمیانی ستون سو گز کے فاصلے پر رہ گیا تو انہوں نے دریا میں ڈبکی لگا دی۔ پانی کے اندر ہی اندر وہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے پل کی طرف بڑھنے لگے۔ پل کے درمیانی ستون کے پاس آتے ہی گل میر' اسد بٹ اور زمان دوسرے ستونوں کی طرف مڑ گئے۔ سکندر درمیانی ستون کے پاس ہی رہا پھر اس نے آہستہ سے سر پانی میں سے باہر نکال کر دیکھا۔ پل اس کے اوپر تھا۔ اوپر گارڈ ڈیوٹی دینے والے ڈوگرہ فوجیوں کی آپس

میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر کسی فوجی نے جلتا ہوا سگریٹ دریا میں پھینکا۔ سگریٹ انگارے کیطرح سکندر کے سامنے سے ہوتا ہوا پانی میں گر کر رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ سکندر نے کنکریٹ کے ستون کے باہر نکلتے ہوئے ایک پتھر کو پکڑ رکھا تھا۔ یہاں دریا کی موجوں کا بہاؤ بڑا تیز تھا مگر سکندر بھی کوئی اناڑی نہیں تھا۔ وہ ایک تربیت یافتہ تجربہ کار کمانڈو تھا۔ اس نے حکمت عملی بڑی دانشمندی سے تیار کی تھی۔ انہوں نے ایک ایک بم ان ستونوں پر دریا کی سطح کے باہر بھی لگانا تھا۔ یہ دشمن کو دھوکا دینے کے لئے تھا۔ اصل ٹائم بم انہوں نے پل کے گارڈوں کی قینچیوں میں لگانے تھے۔

ستون کے اوپر کھڑے ہونے کے لئے کافی جگہ تھی۔ وہاں اندھیرا تھا۔ سرچ لائٹوں کی گول روشنی تھوڑی دیر بعد دریا کے شمال کی جانب گردش کرتی پانی کی سطح کے اوپر سے گزر جاتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ بھارتی فوج کو اس پل کی طرف سے اطمینان تھا کیونکہ یہاں اس قدر حفاظتی انتظامات تھے اور پل ایسی دشوار گزار اور ناقابل گزار جگہ پر تھا کہ یہاں کسی حریت پسند کا آنا بھارتی فوجی حکام کی نزدیک ناممکن تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ کشمیری حریت پسند اپنے وطن کی آزادی اور دین کے ناموس کی خاطر ناممکن کو ممکن کر کے دکھا رہے ہیں۔ اس پل کو تعمیر ہوئے چھ سات ماہ گزر گئے تھے اور یہاں کبھی کوئی چھوٹی موٹی کمانڈو کارروائی بھی نہیں ہوئی تھی۔ سکندر ستون کے اوپر چڑھ گیا۔ اس نے ایک ٹائم بم ستون کی دیوار کے ساتھ باہر کی سمت لگا دیا جو صاف نظر آ رہا تھا۔ ایسا اس نے جان بوجھ کر کیا تھا تاکہ اگر وہ پکڑا بھی جائے اور بھارتی فوجی پل کی جانچ پڑتال کریں تو وہ ستون کے بم پر ہی اکتفا کر کے مطمئن ہو جائیں اور یوں اوپر گارڈر کی قینچی میں لگا ہوا بم ان کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے۔

پل پر سے دو فوجی ٹرک گزرے تو سکندر پل کی فولادی قینچیوں پر اوپر چڑھنے لگا۔ اسے اوپر تک پہنچنے میں کسی خاص دشواری کا سامنا نہ ہوا۔ پل کے گارڈروں پر اتنے موٹے موٹے نٹ بولٹ لگے تھے کہ وہ ان پر پاؤں ٹکاتا تیزی سے اوپر قینچی تک پہنچ گیا۔ اب وہ پل کی چھت کے نیچے تھا۔ اس نے جلدی جلدی دو جگہوں پر انتہائی طاقتور ٹائم بم لگا دیئے۔ یہ بم گارڈروں کے اندر اس طرح سے لگائے گئے تھے کہ سرچ لائیٹ کی روشنی

میں بھی نظر نہیں آ سکتے تھے۔ ابھی اس کے پاس دو ٹائم بم باقی تھے۔ وہ گارڈروں پر پاؤں رکھتا نیچے اتر آیا۔ اس نے آہستہ سے دریا میں غوطہ لگایا اور پانی کے اندر ہی اندر تیز رفتار موجوں کا مقابلہ کرتا دوسرے ستون پر آ گیا۔ اس نے پانی میں سے سر باہر نکالا تو سرچ لائیٹ کی گول روشنی اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سکندر نے جلدی سے سر پانی کے اندر کر لیا۔ روشنی آگے گزر گئی تو اس نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ پل کے اوپر اس حصے پر کوئی ڈوگرہ فوجی موجود نہیں تھا۔ وہ ستون پر چڑھ گیا۔ ایک بم اس نے ستون کے ساتھ باہر کی طرف چپکا دیا اور دوسرا بم سینے کے ساتھ لٹکائے گارڈروں پر چڑھنے لگا۔

جس مقام پر پل کے، عین نیچے چار گارڈر قینچی کی شکل میں ایک دوسرے سے آ کر مل گئے تھے۔ سکندر نے اپنے حصے کا آخری بم وہاں چپکا دیا۔ پھر وہ بڑی احتیاط سے قدم رکھتا نیچے ستون پر اتر آیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ پل کے اوپر روشنیاں تھیں مگر پل کے نیچے اندھیرا تھا۔ اس نے غور سے پل کے دوسرے ستونوں کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے ساتھی کمانڈوز کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انہوں اپنا کام پورا کیا ہے یا نہیں۔ اس کی بائیں جانب اسد بٹ اور گل میر اندھیرے میں پل کے نیچے اپنا کام کر رہے تھے۔ دائیں طرف زمان نے بھی بم لگا دیئے تھے۔ گل میر بڑی ہوشیاری سے پل کی قینچی میں دو بم لگا چکا تھا۔ ایک بم اس نے ستون کے ساتھ بھی چپکا دیا تھا۔ تمام بموں کے بٹن دبا کر ان کے اندر لگے چھوٹے سے کلاک چلا دیئے گئے تھے۔ ان بموں کو ٹھیک آدھ گھنٹے بعد بھیانک دھماکوں کے ساتھ پھٹنا اور پل کو اڑا دینا تھا۔

گل میر ستون پر اترا ہی تھا کہ اس کے کاندھے سے لٹکی ہوئی برین گن پانی میں گر گئی۔ اس کی آواز پیدا ہوئی تو اوپر سے ڈوگرہ گارڈ نے چلا کر کہا۔

"کون ہے؟"

دوسرے گارڈ بھی ہوشیار ہو گئے۔ انہوں نے نیچے ٹارچ کی روشنی پھنکی تو ایک انسانی سائے کو بھاگ کر ستون کی دوسری طرف جاتے دیکھا۔ اسی وقت خطرے کا وسل بجا اور ڈوگرے فوجیوں نے ستون کو نشانہ بنا کر فائر کھول دیا۔ اسد بٹ زمان اور سکندر نے فائرنگ کی آواز سنی تو پہلے تو پریشان ہوئے پھر اپنے طور پر چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ اچانک دس بارہ سرچ لائٹوں کی روشنی ہوئی اور پل کے اوپر نیچے چاروں طرف روشنی

پھیل گئی۔ دو موٹر بوٹیں خطرے کا سائرن بجاتی کنارے کی طرف سے پل کی طرف بڑھیں۔

اسد بٹ نے ستون پر سے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ اوپر سے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ پڑی مگر وہ پانی کی تہہ میں نیچے جا چکا تھا۔ کسی فوجی نے چیخ کر کہا۔

"کشمیری کمانڈو ہیں۔ جانے نہ پائیں"۔

زمان نے اپنا کام کر لیا تھا۔ اس نے برین گن کا ایک برسٹ فائر کیا اور ستون پر سے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ ابھی وہ دریا کے اوپر ہی تھا کہ مشین گن کا برسٹ اس کے جسم کو چھلنی کر گیا۔ وہ خون میں لت پت دریا میں گرا۔ دریا اس کشمیری حریت پسند کے خون سے سرخ ہونے لگا۔ زمان کی آنکھوں کے آگے روشنیاں سی اترنے لگی تھیں۔ وہ اپنے اندر بے حد سکون محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کسی کی محبت بھری آغوش میں اتر آیا ہو۔ وہ پانی کے اندر ہی اندر جا رہا تھا۔ اس نے ایسا سکون پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر اپنے آپ اللہ رسول کا نام آ گیا۔ اس نے دل میں کلمہ پاک پڑھا اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

کشمیری کمانڈو زمان شہید ہو چکا تھا۔ گل میر پانی سے ابھرا تو ایک دم ڈوگرہ گارڈز کی موٹر بوٹ اس کے سامنے تھی۔ بوٹ پر سے برین گن نے فائر کیا۔ گل میر نے غوطہ لگایا مگر برین گن کی گولیاں اس کے سر کو چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھیں۔

گل میر بھی شہید ہو چکا تھا۔

سکندر ابھی تک ستون پر گارڈروں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اسد بٹ پانی کے اندر ہی اندر دریا کے بہاؤ پر غوطے لگاتے کافی آگے نکل گیا تھا۔ فوجی سپاہیوں نے پل کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا۔ چار موٹر بوٹیں پل کے درمیان ستون کے سامنے آہستہ آہستہ گشت کر رہی تھیں۔ پل کے اوپر بھی ڈوگرہ فوج کی ایک کمپنی پہنچ گئی تھی اور دریا پر فائرنگ کر رہی تھی کہ اگر کوئی کمانڈو دریا کی موجوں میں غوطہ لگا گیا ہو تو وہیں ہلاک ہو جائے کمپنی کمانڈر میجر کانشی خود موٹر بوٹ کو لے کر پل کے درمیانی ستون کی

طرف بڑھا۔ جانچ پڑتال کرنے والی فوجی پارٹی بھی پہنچ گئی تھی۔ پل کے چار ستونوں کے ساتھ چپکے ہوئے ٹائم بم فوراً" دیکھ لئے گئے تھے۔ بموں کو اتار کر فوراً" ناکارہ کر دیا گیا۔

ان بموں نے برامد ہو کر ان ٹائم بموں کو بچا لیا تھا جو مجاہدین نے پل کے نیچے فولادی گارڈروں کی قینچیوں میں لگائے تھے۔ سکندر کی حکمت عملی بڑی کامیاب رہی تھی مگر وہ خود مشکل میں تھا۔ وہ ستون کے اوپر گارڈر کے پیچھے چھپا دیکھ رہا تھا کہ ڈوگرہ فوجی پارٹی نے ستونوں کے ساتھ لگائے گئے سارے کے سارے بم اتار کر ناکارہ کر دیئے ہیں۔ مگر اس بات کا اسے بے حد اطمینان بھی تھا کہ قینچیوں میں لگے ٹائم بموں کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اگر سکندر اپنی خاص حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے ستون کے ساتھ ایک ایک بم چپکانے کی ہدایت نہ کرتا تو ڈوگرہ فوجی یقینی طور پر گارڈروں میں لگے بموں کو برامد کر لیتے اور ان کا مشن ناکام ہو جاتا۔ سکندر کو اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کا کیا انجام ہوا ہے۔ اس نے صرف زمان کو دریا میں چھلانگ لگاتے دیکھا تھا۔

ایک دم سے مشین گن کا پورا برسٹ پل کے گارڈروں سے ٹکرایا۔ سکندر کے لئے یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے۔ اسے ان فوجیوں نے دیکھ لیا تھا جو اس کے ستون کے ساتھ چپکے ٹائم بم کو اتارنے کے لئے بڑھے تھے۔ شدید فائرنگ ہونے لگی۔ سکندر نے بھی برین گن کی بوچھاڑ مارنی شروع کر دی۔ وہ ستون کی آڑ میں تھا۔ زبردست فائرنگ میں ڈوگرہ فوجی پارٹی نے درمیانی ستون پر سے بم اتار کر ناکارہ کر دیا۔ موٹر بوٹ پیچھے ہٹی۔ دوسری فوجی موٹر بوٹیں بھی آ گئیں۔ دائیں بائیں جانب سے سکندر پر گولیاں آنے لگیں پھر ڈوگرہ کمپنی کمانڈر میجر کانشی نے چلا کر کہا۔

"ہم نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ تم بچ نہیں سکتے بہتر یہی ہے کہ فائرنگ بند کر دو۔"

سکندر سمجھ گیا تھا کہ وہ بچ نہیں سکتا۔ وہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار بھی نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن اسے ایک ہی پریشانی تھی کہ اس کے فرار ہونے یا شہید ہو جانے کے بعد دشمن پل کے گارڈروں کی جانچ پڑتال نہ شروع کر دے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ دشمن کو غلط راہ پر لگایا جائے۔ اس کی توجہ ان گارڈروں کی طرف آنے ہی نہ دی جائے

اور یہ کام سکندر ہی کر سکتا تھا۔ اتنا اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھی وہاں سے فرار ہو چکے ہیں۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ صرف اسد بٹ دریا میں زندہ بچ سکا ہے۔ زمان اور گل میر شہید ہو گئے ہیں۔

سکندر نے یہی فیصلہ کیا کہ اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیا جائے اور اپنے بیان سے دشمن کی توجہ پل کے گارڈروں کی طرف سے ہٹا دی جائے۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی سکندر نے چلا کر کہا۔ "میں ہتھیار پھینک رہا ہوں۔"

اور اس نے اپنی برین گن دریا میں پھینک دی۔ ڈوگرہ کمانڈر میجر کانشی نے برین گن تان رکھی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان ستون کے اوپر فولادی گارڈر کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگیا ہے۔ اس نے دنوں ہاتھ اوپر اٹھا رکھے ہیں میجر کانشی نے بلند آواز میں کہا

"ہاتھ اوپر اٹھائے رکھنا۔ اگر تم نے ذرا حرکت کی تو سمجھ لینا کہ تم پر چاروں طرف سے برسٹ پڑیں گے اور تمہارے جسم کے پرزے اڑ جائیں گے۔"

سکندر نے ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"میں نے ہتھیار پھینک دیئے ہیں۔"

سکندر پر چاروں طرف سے سرچ لائٹ کی روشنیاں پڑ رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ اس نے گوشہ ء چشم سے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا۔ پل کے نیچے قینچیوں میں لگائے گئے بموں کے پھٹنے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔ اسے صرف یہی پریشانی تھی کہ کہیں دشمن کا خیال ان بموں کی طرف نہ چلا جائے۔ وہ ان کی توجہ دوسری طرف رکھنا چاہتا تھا۔ صرف اسی لئے سکندر نے ہتھیار پھینک کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا تھا۔ ورنہ وہ دریا میں چھلانگ لگا سکتا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کر سکتا تھا مگر اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔

اسے فوراً ستون پر سے نیچے بوٹ میں اتار لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈوگرہ فوجیوں نے اسے قابو کر کے اس کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے۔ موٹر بوٹ دریا کی لہروں کو چیرتی ہوئی تیزی سے پل کے ستون کے قریب کنارے پر آن لگی۔ اس کے اوپر کمپنی کمانڈر اور

سکیورٹی گارڈ کا دفتر تھا۔ اس ستون پر لگا ہوا بم بھی فوجی پارٹی نے اتار کر ناکارہ کر دیا تھا مگر اس کے اوپر فولادی قینچیوں کے نیچے جو طاقتور دو بم لگے تھے ان پر کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ یہ دونوں بم سکندر نے خود سب سے پہلے لگائے تھے۔

سکندر کو سکیورٹی گارڈ روم میں پوچھ گچھ کے لئے پہنچا دیا گیا۔ ڈوگرہ میجر پستول جیب میں ڈال کر سکندر کے سامنے سٹول پر بیٹھ گیا۔ سکندر فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی دوسری حکمت عملی پر عمل کرتے ہوئے خود ہی کہا۔

"میجر! مجھ سے پوچھ گچھ کرنا بیکار ہو گا کیونکہ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ہمارا مشن ناکام ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم نے پل کو اڑانے کے لئے ستونوں کے ساتھ جو ٹائم بم لگائے تھے وہ تمہارے آدمیوں نے اتار کر ناکارہ کر دیئے ہیں مگر ہمارے آدمی ایک بار پھر اپنے مشن پر آئیں گے۔"

ڈوگرہ میجر بڑا خوش تھا کہ اس نے کمانڈو کے ایک بہت ہی خطرناک مشن کو ناکام بناتے ہوئے پل کو تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ اسے پورا یقین تھا کہ فوجی ہائی کمانڈ کی جانب سے اسے بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی مل جائے گی اور اعلیٰ کارکردگی کا سرٹیفیکٹ بھی ملے گا مگر وہ گرفتار شدہ کشمیری کمانڈو سے پوچھ گچھ بھی کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کے باقی ساتھیوں کا بھی کچھ سراغ مل سکے۔ اسے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ سکندر کے باقی ساتھیوں کو ہلاک کر دیا گیا ہے اور ان کی لاشیں دریا برد ہو گئی ہیں۔ اس اعتبار سے ڈوگرہ میجر اپنی زبردست کامیابی پر بے حد مطمئن اور بے حد مسرور تھا۔ اس کی کمپنی کے کیپٹن بل دیو نے سری نگر ہیڈ کوارٹر کو اطلاع بھی کر دی تھی کہ کشمیری کمانڈوز کے آپریشن کو ناکام بناتے ہوئے پل کو تباہی سے بچا لیا گیا ہے۔ سارے کمانڈو ہلاک کر دیئے گئے ہیں۔ ایک زندہ بچا تھا اسے گرفتار کر کے پوچھ گچھ جاری ہے۔ سکیورٹی گارڈ روم میں بلب جل رہا تھا اس کی روشنی میں دیوار پر لگے کلاک کی سیکنڈوں کی سوئی حرکت کر رہی تھی۔ سکندر نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ کلاک پر ڈالی۔ دھماکوں میں صرف دس منٹ رہ گئے تھے۔

میجر کانشی نے سکندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا

"یہ ٹائم بم تمہیں کہاں سے سپلائی ہوئے تھے۔"

سکندر بولا۔

"میجر یہ بم تمہاری ہی فوج کے ایک ایمونیشن ڈپو سے ہم نے چرائے تھے۔"

میجر کانشی نے سکندر کو زور سے ٹھڈ مارا اور گالی دے کر کہا۔

"تم جھوٹ بکتے ہو۔ یہ بم تمہیں پاکستانی تخریب کاروں نے دیئے تھے۔"

سکندر نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"ہمارا پاکستان کے کسی آدمی سے اس قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمیں تو افسوس ہے کہ پاکستان ہماری کوئی مدد نہیں کر رہا۔"

میجر کانشی نے ایک پر حقارت ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"گھبراؤ نہیں۔ تھوڑی دیر بعد تم اپنے آپ ہمیں سب کچھ بتا دو گے۔"

سکیورٹی گارڈ کا کیپٹن پرشاد اندر داخل ہوا۔ اس نے سلیوٹ مارا اور کہا۔

"سر! برج کے سارے ستونوں کو ایک بار پھر چیک کر لیا گیا ہے۔ جتنے ٹائم بم لگے تھے' سب کے سب ناکارہ کر دیئے گئے ہیں۔"

"ویری گڈ" میجر کانشی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر کیپٹن پرشاد کو حکم دیا کہ کوارٹر گارڈ سے جیپ لے کر آئے۔ ڈوگرہ کیپٹن نے یس سر کہا۔ سلیوٹ کیا اور الٹے پاؤں واپس گھوم کر گارڈ روم سے باہر نکل گیا۔ سکندر کی نگاہیں بار بار دیوار پر لگے کلاک کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اس کی شہادت میں اور بھارتی فوج کے اس سب سے بڑے سب سے مضبوط دیوہیکل پل کی تباہی میں صرف سات منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اسے صرف ایک ہی خطرہ تھا کہ کہیں اچانک ڈوگرہ میجر کے ذہن میں یہ خیال نہ آ جائے کہ پل کے گارڈروں کو بھی چیک کرنا چاہیے۔ سکندر نے ڈوگرہ میجر کی توجہ دوسری طرف کرنے کے لئے کہا۔

"میجر! اگر میں تمہیں اپنے دوسرے ساتھیوں اور ان کے ٹھکانوں

کے بارے میں بتا دوں تو کیا تم مجھ سے وعدہ کرتے ہو کہ مجھے چھوڑ دو گے اور کسی کو میرا نام نہیں بتاؤ گے۔"

ڈوگرہ میجر دل میں بڑا خوش ہوا۔ اسے اپنی ایک اور کامیابی بالکل سامنے نظر آ رہی تھی۔ اگر وہ کشمیری تخریب کاروں کے کسی ٹھکانے کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ہیڈ کوارٹر میں اس کی حیثیت مزید بلند ہو جائے گی۔ اس نے آہستہ سے جھک کر کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا نام راز میں رکھا جائے گا۔ بلکہ میں اپنے ہیڈ کوارٹر کو بھی تمہارا نام نہیں بتاؤں گا۔ اب مجھے بتا دو کہ تمہارا نام کیا ہے اور تمہارے ساتھیوں کا خفیہ اڈہ کہاں اور کس مقام پر ہے۔"

سکندر ڈوگرہ میجر کی توجہ پل پر سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کلاک کی سوئی برابر آگے آگے حرکت کرتی چلی جا رہی تھی' اس کی شہادت کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اس نے انتہائی پر سکون لہجے میں کہا۔

"میرا نام احد بٹ ہے۔ مگر اس وقت میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے چائے کی ایک پیالی مل جائے تو پھر اس قابل ہوں گا کہ تمہیں اپنے ساتھیوں کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتا سکوں۔ تم گھبراؤ نہیں۔ اگر میں نے تم سے وعدہ کر لیا ہے تو پھر میں اپنے وعدے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا اور جو کچھ مجھے معلوم ہے تمہیں اس کی ایک ایک تفصیل بیان کر دوں گا۔"

میجر کانشی کے لئے اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس نے مقبوضہ کشمیر کے سب سے بڑے فوجی پل کو تباہی سے بچا کر ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا اور دوسرا معرکہ وہ یہ مارنے والا تھا کہ کشمیری حریت پسندوں کے ایک بہت بڑے گروہ کے خفیہ ٹھکانے کا انکشاف ہونے والا تھا۔ اس نے کہا۔

"میرے دوست احد بٹ! اب تم ہمارے دوست ہو۔ ابھی میری جیپ آ رہی ہے۔ میں تمہیں گارڈ روم میں چل کر اپنے ہاتھ سے دار جیلنگ کی چائے بنا کر پلاؤں گا۔"

سکندر نے کہا۔

"اب میرے ہاتھ تو کھول دیں۔"

ڈوگرہ میجر بڑی کمینگی سے مسکرایا۔

"تھوڑی دیر انتظار کرو۔ گارڈ روم میں چل کر کھول دوں گا"۔" اچھا دوست! یہ بتاؤ کہ تمہارے اس مشن کا لیڈر کون تھا؟"

سکندر نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ ایک اڑتی ہوئی نظر دیوار پر لگی گھڑی پر ڈالی۔ صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ وہ دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ سارے بم وقت پر بلاسٹ ہو جائیں۔ اس نے کہا۔

"یہ بھی میں آپ کو چائے پیتے ہوئے بتاؤں گا مگر میں ایک بار پھر آپ سے وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ آپ میرا نام کسی جگہ بھی ظاہر نہیں کریں گے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں ایک طرح سے غداری کروں گا اور اگر میرے ساتھیوں کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ڈوگرہ میجر بولا۔

"ہم کیوں تمہارا نام ظاہر کریں گے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ تم اپنے گروہ میں شامل رہ کر ہمارے لئے کام کرو لیکن ایک بات تم بھی اچھی طرح ذہن میں رکھ لو کہ اگر تم نے ڈبل ایجنٹ بننے کی کوشش کی تو ہمارے آدمی تم جہاں بھی ہو گے تمہیں بڑی آسانی سے ہلاک کر دیں گے"۔

کشمیری حریت پسند کمانڈر دل میں مسکرایا۔ اس نے دل میں کہا احمق تمہیں تو اتنا بھی علم نہیں ہے کہ میرے ساتھ تمہاری زندگی کے بھی چند منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ مجھے صرف ایک ہی افسوس ہے کہ میرے ساتھ ایک کافر مر رہا ہے۔ سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں میجر کہ تمہاری فوج کیا کر سکتی ہے اور کیا نہیں کر سکتی۔"

باہر جیپ کے کھڑے ہونے کی آواز آئی۔ ڈوگرہ میجر سٹول سے اٹھ کر باہر گیا۔ پھر اس نے حکم دیا۔ "اسے لے جا کر جیپ میں بٹھا دو۔"

دو ڈوگرہ فوجی لمبے لمبے قدم اٹھاتے اندر آئے اور سکندر کو بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ باہر فوجی جیپ کھڑی تھی۔ سکندر نے باہر نکلتے ہوئے گھڑی پر آخری نگاہ ڈالی۔ اس نے سوچا اگر بموں کے فیوز نے ٹھیک کام کیا تو دھماکے ہونے میں صرف دو منٹ رہ گئے تھے۔

ڈوگرہ میجر ڈرائیور کے ساتھ جیپ میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے جیپ سٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ انجن گر گر کی آواز پیدا کر کے خاموش ہو گیا۔

"سر! ابھی دیکھتا ہوں۔"

ڈوگرہ فوجی تیزی سے اترا۔ جیپ کا بونٹ اٹھایا اور انجن میں کچھ پرزوں کو ہلانے کے بعد جیپ میں آ کر بیٹھ گیا۔ جیپ سٹارٹ ہو گئی۔ سکندر پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو ڈوگرے برین گنیں تانے ساتھ بیٹھے تھے۔ جیپ پل پر سے گزرنے لگی۔ سکندر کے اندازے کے مطابق دھماکوں میں صرف ڈیڑھ منٹ باقی رہ گیا تھا۔ جیپ تیز رفتاری سے پل پر سے گزر رہی تھی۔ جونہی وہ پل کے درمیانی ستون کے اوپر پہنچی اس کا انجن ایک بار پھر خراب ہو گیا۔ جیپ رک گئی۔ ڈوگرہ میجر نے غصے میں کہا۔

"تم جانگلی ہو۔ یہ کہاں سے کنڈم جیپ اٹھا لائے ہو؟"

ڈارئیور نے فوراً اٹن شن ہو کر کہا۔

"سر! ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔ کچرا آ گیا ہو گا۔"

پل پر روشنیاں ہو رہی تھیں۔ سکندر کا دل جیسے اس کی کنپٹی کے پاس آ کر دھڑک رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جیپ پل کے عین درمیان میں کھڑی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جس کے نیچے قینچیوں میں اس نے خود دو طاقتور ٹائم بم لگائے تھے۔ یہ بم دوسرے بموں کے ساتھ پل کے نیچے اپنی اپنی جگہوں پر موجود تھے۔ سرچنگ پارٹی کی توجہ اس طرف نہیں گئی تھی۔ وہ ستونوں کے ساتھ چپکے ہوئے بموں کو ناکارہ کرنے کے بعد مطمئن ہو گئے تھے۔

سکندر یہی چاہتا تھا۔ وہ اپنی حکمت عملی میں کامیاب رہا تھا مگر دھماکے کیوں نہیں ہو رہے ؟ وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس کے حساب سے وقت ہو گیا تھا۔ وقت ہو چکا تھا۔ ڈوگرہ میجر جیپ سے اتر کر پل کے جنگلے پر جھکا نیچے دیکھ رہا تھا۔ سکندر دو فوجیوں کے نرغے میں خاموش مگر اندر سے بے چین تھا۔ کہیں ڈوگرہ سرچنگ پارٹی نے ان بموں کو بھی ناکارہ تو نہیں کر دیا؟ لیکن اگر ایسا ہوتا تو ڈوگرہ میجر ان بموں کی بابت بھی ضرور بات کرتا۔ اس نے ان کا بالکل ذکر نہیں کیا تھا۔

ڈوگرہ میجر جنگلے سے ہٹ کر جیپ کی طرف آیا۔ اس نے ڈرائیور کو ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری رپورٹ کروں گا۔ تم ______"

وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا کیونکہ اس کے ساتھ ہی وہاں ایک بجلی چمکی تھی۔ غضبناک کڑاکے کی آواز گونجی تھی۔ ایک ایسا دھماکہ ہوا تھا کہ اس کی آواز مرنے والا ڈوگرے کافر اور شہید ہونے والا کشمیری حریت پسند سکندر بھی نہ سن سکا تھا۔ جہاں پل پر جیپ کھڑی تھی وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ پل تھا' نہ جیپ' نہ ڈوگرہ میجر اور نہ سکندر ______ اس کے ساتھ ہی پل پر آگے پیچھے بجلیاں چمکیں۔ کڑاکے گونجے' دھماکے ہوئے۔ ساری وادی کا دل دہل گیا۔ پہاڑوں کے جگر لرز گئے۔ پل اڑ گیا۔ اس کے فولادی گارڈر پگھل کر دریا میں گرتے ہی بھاپ کے دھوئیں میں کھولنے لگے۔ پل کے نیچے لگائے گئے مجاہد کمانڈوز کے سارے کے سارے ٹائم بم چند سیکنڈ کے وقفوں کے بعد پھٹ گئے تھے۔ ان دھماکوں کی آواز اسد بٹ نے بھی سنی۔ نہ صرف آواز سنی بلکہ اس نے دریا کے دوسرے کنارے سرکنڈوں میں چھپ کر بیٹھے ہوئے پل کے پرخچے اڑتے بھی دیکھے۔ اس کا دل جوش سے لبریز ہو گیا۔ اس کے ہونٹ جذبات سے کپکپانے لگے۔ اس کا دل بے اختیار کلمہ شریف کا ورد کرنے لگا۔ اس نے گل میر کو شہید ہوتے دیکھ لیا تھا۔ باقی ساتھیوں کی اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کے ساتھ کیا گزری۔ وہ دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ زمان اور سکندر زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ کیونکہ وادیٔ کشمیر کو ابھی ان کی بہت ضرورت تھی۔ پل غائب ہو چکا تھا۔ اس کی ساتھ ہی وہ روشنیاں بھی غائب ہو گئی تھیں جو پل پر تھوڑی دیر پہلے روشنی بکھیر رہی تھیں۔ اب دریا کے بیچ میں

کالا سیاہ اندھیرا چھایا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں سے بھی زیادہ گہرا سیاہ اندھیرا ______!

پل کی دونوں جانب سے گاڑیوں کے ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے اور فائرنگ اور ڈوگرہ فوجیوں کے ایک دوسرے کو پکارنے کی گھبرائی ہوئی آوازیں آ رہی تھیں۔ دریا میں ملٹری موٹر بوٹیں نمودار ہو گئی تھیں۔ اسد بٹ دریا میں غوطہ لگا کر یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ ابھی خطرے سے باہر نہیں تھا۔ اس سارے علاقے میں ڈوگرہ فوج پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اس علاقے سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ ان پہاڑیوں' وادیوں سے شناسا تھا۔ یہ ایک اچھی بات ہوئی تھی کہ وہ زخمی نہیں ہوا تھا۔ ورنہ اس کے لئے اپنے ٹھکانے تک پہنچنا مشکل ہو جاتا۔

اسد بٹ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان بالکل سیاہ تھا۔ کسی وقت بھی بارش شروع ہو سکتی تھی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ سردی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ سرکنڈوں میں سے اٹھا اور کیچڑ میں چلتا دریا سے دور ہٹتا چلا گیا۔ اس کی برین گن دریا میں ہی کہیں گر گئی تھی۔ پستول بھی غائب تھا صرف کمانڈو چاقو اس کی بیلٹ میں لگا ہوا باقی رہ گیا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ انڈین فوج کے بنائے ہوئے اتنے بڑے پل کا اڑ جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے اور علاقے کی ساری فوج حرکت میں آ گئی ہو گی اور تمام علاقے میں ملٹری انٹیلی جنس کے آدمیوں کے ساتھ ساتھ ڈوگرہ فوج کے سپاہی بھی کشمیری حریت پسندوں کی تلاش میں بکھر گئے ہوں گے۔ گھر گھر کی تلاشی لی جا رہی ہو گی اور بے گناہ کشمیریوں کو دھڑا دھڑ گرفتار کیا جا رہا ہو گا۔ انہیں شہید کیا جا رہا ہو گا۔ اسد بٹ بھی ان کے قابو میں آ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی جگہ چھپ کر رات گزار دے اور دوسرے دن بھیس بدل کر وہاں سے بٹ گام کی پہاڑیوں کی طرف نکلنے کی کوشش کرے' جہاں ان کا خفیہ ٹھکانہ تھا۔ اسے امید تھی کہ اگر زمان اور سکندر شہید نہ ہو گئے ہوں گے تو وہ بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔ رات بڑی اندھیری تھی۔ دریا کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ پل کی جانب سے فوجی گاڑیوں اور فوجیوں کی آوازیں اب دور ہوتی جا رہی تھیں۔ اسد بٹ ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ ٹیلے کی اوپر پہنچنے کے بعد وہ دوسری طرف کی ڈھلان تیزی سے اترنے لگا۔ ان ٹیلوں پر اترنے چڑھنے کی اسے بہت مشق تھی۔ وہ پتھریلے میدان میں آ گیا جہاں سرو اور چیڑھ کے درخت اندھیری رات کی سرد ہوا میں سنسنا رہے تھے۔ ایک لومڑ اس کے

قریب سے ہو کر بھاگ گیا۔ اس نے چاقو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا کہ کہیں کوئی جنگلی
ریچھ اس پر حملہ نہ کر دے۔

بارش کے کچھ قطرے اس پر گرے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بجلی کی ہلکی سی
روشنی سیاہ بادلوں کو روشن کرتی ہوئی غائب ہو گئی۔ بادلوں میں دھیمی دھیمی سی گرج پیدا
ہوئی۔ پھر ٹپاٹپ بارش کی بوندیں گرنے لگیں۔ اسد بٹ نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ وہ
جس سمت جا رہا تھا ادھر اسے دور ایک ٹیلے کے دامن میں روشنی کا دھندلا سا زرد دھبہ
دکھائی دے رہا تھا۔ اس روشنی تک پہنچتے پہنچتے بارش تیز ہو گئی۔ روشنی ایک مکان کے
آنگن سے آ رہی تھی۔ یہ ٹیلے کی ڈھلان پر جہاں ایک پتھر کا چبوترہ سا واقع تھا۔ مکان
ایسا ہی تھا جیسے کشمیر کے دور دراز دیہاتوں میں ہوتے ہیں۔ لکڑی کی دیواروں کے اوپر
ڈھلانی چھت تھی جس پر پیال پڑی تھی۔ آنگن میں مکان کے باہر ایک گائے چھپر کے
نیچے بندھی تھی۔ یہ لالٹین باڑے کے باہر ایک ڈنڈے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔

اسد بٹ کشمیری تھا۔ وادی کشمیر کا جیالا فرزند تھا۔ خود ایک کسان کا بیٹا تھا۔ وہ کشمیری
دیہات کی رہن سہن سے پوری طرح واقف تھا۔ کشمیری زبان کے ہر لب و لہجے کو جانتا
تھا۔ وہ چبوترے کی پتھریلی سیڑھیاں چڑھ کر مکان کے دروازے پر آ گیا۔ دروازہ بند تھا۔
لالٹین کی دھیمی روشنی میں دروازے کے اوپر اللہ اور یا رسول اللہ لکھا تھا۔ ایک اجنبی کو
آنگن میں دیکھ کر گائے نے دو تین آوازیں نکالیں۔ کوٹھڑی کے اندر سے کسی مرد کی
آواز سنائی دی۔ کیا ہے شمو کیا ہے اور پھر مکان کا دروازہ کھلا اور ایک جوان کسان مرد
ہاتھ میں ڈنڈا لئے باہر آ گیا۔ "کون ہے؟"

وہ صحن میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ رات اندھیری تھی۔ بارش موسلا دھار ہو رہی
تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کشمیری جوان نے باڑے کی طرف دیکھا۔ گائے اب بھی
آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ وہ سر پر کھیس ڈالے باڑے کی طرف بڑھا۔ گائے کو پیار کیا۔
اس سے کچھ باتیں کیں اور واپس مکان کی طرف آیا تو اسد بٹ اس کے سامنے آ گیا۔
کشمیری دیہاتی جوان جیسے چونک کر وہیں رک گیا۔

"کون ہو تم؟"

اس کا ڈنڈے والا ہاتھ اوپر اٹھ گیا۔ اسد بٹ نے کشمیری میں کہا۔

"میں مسلمان ہوں۔ مسافر ہوں۔ راستہ بھول گیا ہوں۔ بارش
تیز ہے۔ مجھے رات گزارنے کو جگہ دے دو۔ میں اس باڑے میں
پڑ کر رات گزار لوں گا۔ صرف ایک کمبل مجھے دے دو"۔

جوان کشمیری اسد بٹ کو غور سے دیکھ رہا تھا پھر بولا۔

"نہیں۔ تم مسلمان ہو۔ مہمان ہو۔ میری کوٹھڑی میں آ جاؤ۔"

اسد بٹ کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ کوٹھڑی کے اندر ایک مٹی کا دیا روشن تھا۔ کوٹھڑی کی
فضا گرم تھی۔ دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک پر بستر لگا تھا۔ دوسری پر بستر لپٹ کر رکھا
ہوا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟ میرا نام رسل ہے"۔

میزبان جوان کشمیری نے خالی چارپائی پر بستر بچھاتے ہوئے پوچھا۔

"میرا نام اکبر ہے۔ غلام اکبر۔ میں بٹ گام میں آڑھت کرتا
ہوں۔ اگراہی کے لئے آگے گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ غلطی کی کہ
شام کو چل پڑا۔ میرا ارادہ دن چڑھے آنے کا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" رسل نے کہا۔ "کچھ کھاؤ گے؟" "میرے
پاس روٹی بھی ہے، مکھن اور کڑم کا ساگ بھی ہے۔ گھر میں
سوائے میرے اور کوئی نہیں اس وقت۔ میری بیوی اور اماں بارہ
مولا گئی ہوئی ہیں۔ یہ سب میں نے ہی پکایا ہے۔"

اسد بٹ نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ رسل۔ مجھے بھوک نہیں ہے گاؤں سے کھانا کھا کر چلا تھا
"۔

اسد بٹ کے کپڑے بٹ گام کے آڑھتیوں والے نہیں تھے۔ رسل نے اسد بٹ
کی سیاہ موٹی پتلون، موٹی سیاہ رنگ کی جیکٹ اور اونی کالی ٹوپی کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔
آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"تم نے کپڑے کچھ دوسری قسم کے پہن رکھے ہیں۔"

اسد بٹ نے بوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

"میرے والد کا اگرچہ آڑھت کا کام ہے اور میں بھی یہی کام کرتا ہوں مگر میں نے سری نگر میں ایف اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ مجھے یہ پتلون جیکٹ اچھے لگتے ہیں۔"

رسل اپنے لحاف میں گھس گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"اب سو جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ نماز کے وقت صبح جگا دوں گا۔"

اسد بٹ بھی خاموشی سے لحاف میں گھس گیا۔ اس نے اپنی اصلیت اس لئے ظاہر نہیں کی تھی کہ اسے بھارتی مخبروں سے خطرہ تھا۔ وہ سخت تھکا ہوا تھا۔ تھکان سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی اسے نیند آ گئی۔

صبح نماز کے وقت رسل نے اسے جگا دیا۔ وہ باہر گائے دھونے لگا۔ اسد بٹ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ کوٹھڑی میں ایک کھڑکی تھی جو بند تھی۔ اس نے جلدی سے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ بارش رک چکی تھی۔ چیڑھ کے درخت ٹپک رہے تھے۔ بادلوں میں سے سپیدہ سحری نمودار ہو رہی تھی۔ اس نے کھڑکی بند کر دی اور دروازہ کھول کر دیکھا۔ باڑے کے اندر لالٹین اسی طرح روشن تھی۔ رسل گائے کا دودھ دوہ رہا تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ تھوڑی دیر میں رسل گلاس میں دودھ لے کر آ گیا۔

"تازہ دودھ پیو گے؟ پھر اکٹھے نماز پڑھیں گے۔"

اسد بٹ نے گلاس لے لیا۔ وہ دودھ پی گیا۔ پھر انہوں نے باہر باڑے کے آگے بیٹھ کر وضو کیا اور کوٹھڑی میں آ کر نماز پڑھی نماز کے بعد رسل نے دعا مانگی اور منہ پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔

"یہاں کوئی مسجد نہیں ہے۔ آگے گاؤں کے کچھ مکان ہیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک مسجد بنائیں گے وہاں گاؤں کے سارے مسلمان باجماعت نماز پڑھا کریں گے۔"

رسل نے باہر جا کر چولہا جلایا۔ چائے کا پانی رکھ دیا۔ اسد بٹ بھی اس کے پاس آ

کر بیٹھ گیا اور چولہے میں جلتی آگ تاپنے لگا۔ نیچے سے کسی نے رسل کو آواز دی اور کشمیری میں پوچھا۔

"رسلے! جاگ رہے ہو؟"

رسل کے چہرے پر کچھ تردد کے اثرات پیدا ہوئے۔ اس نے اسد بٹ سے کہا۔

"تم کوٹھڑی میں چلے جاؤ۔ جب تک میں نہ کہوں باہر مت آنا۔"

اسد بٹ بالکل نہ سمجھ سکا کہ رسل بٹ اسے کوٹھڑی میں کیوں بھیج رہا ہے۔ وہ اس کا مہمان ہے۔ کسی دوسرے آدمی کے آ جانے سے اس کو اپنے مہمان کو اندر چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ اسد بٹ کے لئے یہ بات ایک عجیب معمہ تھی مگر بہت جلد یہ معمہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ اٹھ کر کوٹھڑی میں چلا آیا اور دروازہ بند کر دیا مگر دروازے کے سوراخ میں سے باہر دیکھنے لگا۔

دن کی سفیدی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ چنار اور چیڑھ کے گیلے درختوں پر سے بارش کا رکا ہوا پانی ابھی تک ٹپک رہا تھا۔ رسل نے آواز دی۔

"آ جاؤ جانی اوپر آ جاؤ۔"

ایک ادھیڑ عمر کا دبلا سا کشمیری جس کی خشخشی ڈاڑھی کہیں کہیں سے سفید ہو رہی تھی۔ پتھریلی سیڑھیاں چڑھ کر آنگن میں آ گیا۔ اس نے گرم فرن پہن رکھا تھا اور کندھے پر کمبل تھی۔

وہ رسل کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ آگے کر کے چولہے میں جلتی آگ تاپنے لگا۔ رسل نے سبز چائے کو پھینٹتے ہوئے پوچھا۔

"کاکا جانی صبح صبح کہاں نکل پڑے آج؟"

کاکا جانی نے ہاتھوں کو گرم کر کے اپنے چہرے پر لگایا اور جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالتے ہوئے بولا۔ ابھی بتاتا ہوں پھر سگریٹ سلگایا اور کش لگاتے ہوئے رازداری سے کہنے لگا۔

"تمہیں کچھ معلوم بھی ہے؟ دریا پر ملٹری نے جو پل بنایا تھا اسے ہمارے لڑکوں نے اڑا دیا ہے۔"

رسل نے چائے کی پتیلی اتارتے ہوئے کہا۔

"ہاں ——— رات کو میں نے دور سے دھماکوں کی آوازیں ضرور سنی تھیں۔ میں نے سمجھا کہ انڈین فوج مشقیں کر رہی ہے۔"

"ارے نہیں۔" کاکا جانی نے کھانس کر کہا۔ "پل اڑا دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اسے کشمیر کے مجاہد ہی اڑا سکتے ہیں اور کون اڑائے گا بھلا ———"

رسل نے چولہے پر توا رکھا اور جوار کے آٹے کی روٹی گوندھتے ہوئی بے نیازی سے بولا۔

"کاکا! تمہیں تو معلوم ہی ہے میں نے ایسی باتوں میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔"

کاکا جانی نے سگریٹ کا کش لگایا اور تیز لہجے میں کہنے لگا۔

"دلچسپی لیا کرو ناں۔ آخر تم بھی کشمیری ہو۔"

رسل نے کوئی جواب نہ دیا۔ کاکا جانی صحن میں دیکھنے لگا۔

"رات تمہارے پاس کوئی مہمان آیا تھا کیا؟"

دن کی روشنی میں صحن کے کیچڑ پر رسل کے علاوہ اسد بٹ کے جوتوں کے نشان بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ رسل نے فوراً جواب دیا۔ "ہاں۔ وہ مرزاق قاندرو مکھن لینے آیا تھا۔"

کاکا جانی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا چلتا ہوں۔ ساتھ والے گاؤں بیٹی کے ہاں جا رہا ہوں۔ اس کے بچے کو بخار تھا۔ دوپہر تک آ جاؤں گا۔"

اور یہ پراسرار شخص سلام علیک کر کے چلا گیا۔ اس کی باتوں سے اسد بٹ کو شک سا پڑ گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد رسل نے توا چولہے سے اتارا اور جلدی سے کوٹھڑی میں آ گیا۔

اسد بٹ نے بے اختیار پوچھ لیا۔

"یہ کون تھا؟"

رسل نے دروازہ بند کر دیا اور کہنے لگا۔

"میں اس شخص سے تمہیں چھپانا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم اس کے سامنے آؤ۔ یہ تمہیں دیکھے۔"

"کیوں؟" اسد بٹ نے رسل کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

رسل بولا۔ "تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتے۔ میں جانتا ہوں تمہارا تعلق کشمیر کے حریت پسند مجاہدوں سے ہے۔ اس لئے میں نے تمہیں پناہ بھی دی تھی۔ اگر رات کو میں نے دھماکے نہ سنے ہوتے تو شاید میں بھی دھوکا کھا جاتا۔ اب کاکا جانی سے اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ ہمارے مجاہدوں نے انڈین فوج کا پل اڑا دیا ہے۔"

اسد بٹ نے بے نیازی سے کہا۔

"اگر میرا تعلق کشمیری مجاہدوں سے بھی ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو اب جا رہا ہوں۔"

رسل نے کہا۔

"فرق یہ پڑتا ہے کہ اگر تم یہاں سے باہر نکلے تو راستے میں پکڑے جاؤ گے۔ کاکا جانی نے صحن میں تمہارے جوتوں کے نشان دیکھ لئے ہیں اور یہ بدکردار غدار شخص انڈین فوج کے لئے جاسوسی کرتا ہے۔ یہ مخبر ہے۔"

اب اسد بٹ کچھ چونکا۔ رسل کہہ رہا تھا۔

"اسی لئے میں نے تمہیں کوٹھڑی میں چھپا دیا تھا لیکن اس عیار شخص کو شاید شک پڑ گیا ہے مجھے ڈر ہے کہ وہ فوج کو خبر کر دے گا۔"

اسد بٹ نے کہا۔

"اس طرح تو تمہاری زندگی بھی خطرے میں ہے۔ میں تو یہاں سے

فرار ہو جاؤں گا مگر بھارتی فوجی درندے تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ تمہارے گھر کو آگ لگا دیں گے۔ تمہاری بیوی اور ماں کو بھی دوسرے گاؤں سے پکڑ کر لے جائیں گے"۔

رسل نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اللہ رسولؐ اور کشمیر کے نام پر میری جان' میرا خاندان سب کچھ قربان۔ لاکھ بار قربان"۔

اسد بٹ کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ غدار مخبر کس طرف گیا ہو گا؟"

"کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ رسل نے کہا۔

اسد بٹ نے کوئی جواب نہ دیا اور چھلانگ لگا کر کوٹھڑی سے باہر نکلا اور چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگ کر درختوں کی طرف تیزی سے بھاگنے لگا۔ رسل بے چینی سے باڑے کی طرف گیا پھر وہاں سے واپس کوٹھڑی میں آیا۔ وہاں بھی وہ نہ بیٹھ سکا اور صحن میں آکر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں اس طرف لگی تھیں' جدھر مخبر کاکا جانی اور اس کے بعد کشمیری حریت پسند گیا تھا۔ رسل کے ذہن میں ایک ہیجان سا بپا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ کشمیری مجاہد کدھر گیا ہے اور کس مقصد کو ذہن میں لے کر گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسے اسد بٹ درختوں میں اپنے مکان کی طرف آتا دکھائی دیا۔ رسل کا دل ذرا سا تیز دھڑک کر واپس اپنے معمول پر آ گیا۔

اسد بٹ نے قریب آکر کہا۔

"تمہیں ایسے غداروں کو اپنے درمیان زندہ رہنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی"۔

رسل نے پوچھا۔

"وہ گاؤں واپس نہ آیا تو لوگ مجھ پر بھی شک کر سکتے ہیں لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ میں سنبھال لوں گا"۔

اسد بٹ کوٹھڑی میں آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ رسل بھی اس کے ساتھ ہی اندر آ گیا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں نے اس کی لاش اس طرح کھڈ میں گرا دی

ہے کہ لوگ اسے حادثہ ہی سمجھیں گے۔ رسل! یہ وہ غدار لوگ ہیں جنہوں نے اپنی غداریوں سے سلطان ٹیپو ایسے بہادر مسلمان جرنیلوں کو دشمن کے ہاتھوں شہید کروا دیا۔ نہ جانے یہ غدار اب تک کتنے کشمیری مجاہدوں کو پکڑوا چکا ہو گا"۔

رسل نے آہستہ سے کہا۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں تمہارے لئے روٹی اور چائے لاتا ہوں"۔

دونوں کوٹھڑی میں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ ناشتہ کیا تھا۔ جوار کی روٹی مکھن اور سبز کشمیری چائے تھی۔ اگرچہ رسل کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسد بٹ ایک کشمیری کمانڈو ہے اور اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر انڈین فوج کے بنائے ہوئے فولادی پل کو تباہ کیا ہے' لیکن اس کے باوجود اسد بٹ نے اس کا اعتراف نہیں کیا تھا اور اسے اپنا اصلی نام بھی نہیں بتایا تھا۔ یہ اس کی مجاہدانہ ٹریننگ کا ایک حصہ تھا کہ اپنا راز کسی اجنبی پر ظاہر نہ کرو خواہ وہ تمہارا کتنا ہی ہمدرد کیوں نہ ہو۔ رسل کہنے لگا۔

"کاکا جانی یقیناً بھارتی فوج کے کیپٹن کمانڈر کو تمہاری اطلاع دینے ہی جا رہا تھا۔ اس نے صحن میں تمہارے جوتوں کے نشان دیکھ لئے تھے اور اسے شک ہو گیا تھا کہ پل اڑانے والے کشمیری مجاہدوں کا کوئی ایک ساتھی یہاں آیا ہے۔ میں نے اس لئے تمہارے جوتوں کے نشان کیچڑ میں خلط ملط کر دیئے ہیں۔ تمہارے لئے چائے لاتا ہوں"۔

اسد بٹ نے پیالی رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں رسل بھائی۔ تمہارا شکریہ۔ اب میں چلتا ہوں۔ دوپہر تک گاؤں پہنچنا چاہتا ہوں گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے"۔

اسد بٹ چلنے کے لئے اٹھا۔ اس نے رسل سے ہاتھ ملایا۔ رسل نے جذبات بھری آواز میں کہا۔

"اللہ رسولؐ تمہارا نگہبان ہو"۔

اسد بٹ کوٹھڑی سے نکلنے ہی والا تھا کہ نچان والی گھاٹی کی جانب سے جیپ کی آواز سنائی

دی۔ رسل اور اسد بٹ نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"انڈین ملٹری تم لوگوں کی تلاش میں نکل آئی ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ جلدی۔"

یہ کہہ کر رسل اسد بٹ کو ساتھ لے کر مکان کے پیچھے آیا۔ ادھر نیچے ایک پہاڑی نالہ بہتا تھا۔ پتھروں کے درمیان پانی بہہ رہا تھا۔ نالے کے اوپر ایک جانب جھکی ہوئی چھت والی پرانی کوٹھڑی تھی جس کے سامنے لکڑیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اس نے کہا۔

"اس کوٹھڑی میں جا کر چھپ جاؤ۔ خبردار کسی طرف بھاگ نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ سارا علاقہ انڈین فوج نے گھیرے میں لے لیا ہوگا۔ جلدی کرو۔"

رسل اتنا کہہ کر واپس کوٹھڑی کی طرف لپکا۔ اسد بٹ نے پتھروں کی چھوٹی سی دیوار پھلانگی اور جھکے جھکے نالے کو پار کر کے سامنے والی ڈھلان پر چڑھ کر کوٹھڑی کے باہر لگے لکڑیوں کے انبار کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ رسل کے صحن کی طرف دیکھنے لگا۔ تین فوجی صحن میں آ گئے تھے اور رسل سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ اسد بٹ جلدی سے کوٹھڑی میں گھس گیا۔ یہاں اوپلوں کا ڈھیر لگا تھا۔ کوئی کھڑکی روشندان بھی نہیں تھا۔ اسد بٹ نے کیواڑ بند کر لئے اور ذرا سی درز رکھ کر باہر تکنے لگا۔ اس وقت رسل مکان کے صحن کی دو فٹ اونچی دیوار کے پاس کھڑا تھا اور انڈین فوجیوں کو ایک طرف اشارہ کر کے کچھ بتا رہا تھا۔

فوجیوں نے سارے مکان کی تلاشی لی۔ ٹھوکر مار کر چولہے کے پاس پڑے برتنوں کو ادھر ادھر پھینکا اور واپس چلے گئے۔ اسد بٹ کوٹھڑی میں ہی دبکا رہا۔ باہر آسمان پر اس طرح گہرے بادل چھائے ہوئے تھے مگر بارش رکی ہوئی تھی۔ اسے فوجی جیپ کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی پھر یہ آواز پہاڑی جنگل میں دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ اسد بٹ اٹھ کر دروازے کے پاس آیا۔ کیواڑ ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ نالے کے پار اوپر رسل کے مکان کا صحن خالی تھا۔ کافی دیر گزر گئی۔ رسل نظر نہ آیا۔ کوٹھڑی میں اس کا دم گھٹتا تھا۔ وہ باہر لکڑیوں کے انبار کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔

بادلوں میں ہلکی ہلکی گرج پیدا ہوئی اور بارش کی بوندیں گرنے لگیں۔ اس کے اوپر شہتوت کے گنجان درخت کا سایہ تھا۔ ابھی بارش اتنی تیز نہیں ہوئی تھی کہ درختوں میں

سے اس کا پانی ٹپکنے لگتا۔ بارش بھی بوندا باندی کی حد تک ہی ہو رہی تھی۔ وادئ کشمیر میں سردیوں کا آغاز تھا۔ اس کے بعد بجری گرنے والی تھی اور پھر برفباری کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ اسد بٹ ان موسموں کا عادی تھا۔ اس کے لئے کشمیر کا کوئی بھی موسم اجنبی نہیں تھا۔ ایک بار پھر اسے فوجی جیپ کی آواز سنائی دی۔ آواز دوسری جانب سے آ رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ بھارتی فوج چوکس ہو گئی ہے بلکہ ان کی ملٹری انٹیلی جینس حرکت میں آ گئی ہے اور پل تباہ کرنے والے کمانڈوز کی تلاش پوری سرگرمی سے شروع ہو گئی ہے۔ اتنے بڑے پل کا اتنی زبردست سیکورٹی کے باوجود تباہ ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ بھارتی فوج نے اس سارے علاقے کو اپنے حصار میں لے لیا تھا اور کشمیری حریت پسندوں کی چپے چپے پر تلاشی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اسد بٹ کے لئے وہاں سے دن کے وقت فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس کے پکڑے جانے کا خطرہ موجود تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ رات کے اندھیرے میں وہاں سے کسی طرف نکل جانے کی کوشش کرے گا۔

ملٹری جیپ کی آواز آنی بند ہوئی تو پہاڑیوں میں ادھر ادھر اکا دکا مشین گن کے فائر ہونے لگے۔ انڈین فوجی یقیناً نہتے مسلمان کشمیریوں کو شہید کر رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر اسد بٹ نے اپنے دانت بھینچ لئے۔ آزادی کی خاطر کشمیریوں کو ابھی نہ جانے کتنی قربانیاں دینی ہوں گی۔ یہ سوچ کر اسد بٹ نے آنکھیں بند کر لیں۔ بارش کی بوندیں شہتوت کی شاخوں میں سے اس پر گرنے لگیں۔ وہ اٹھ کر کوٹھڑی کے اندر چلا گیا۔ دروازے کے ایک پٹ کو ذرا سا کھول کر وہیں دہلیز میں بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہ رسل پر پڑی۔ وہ گائے کو ہانکتا پہاڑی نالے کی ڈھلان پر چلا آ رہا تھا جیسے گائے کو چرانے کے لئے نکلا ہو۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ بارش سے بچنے کے لئے اس نے سر پر بوری ڈال رکھی تھی۔ اس کا رخ کوٹھڑی کی طرف تھا۔ اسد بٹ اسے برابر دیکھ رہا تھا بھارتی فوجیوں کی نقل و حرکت کے بارے میں ضرور وہ کوئی خاص خبر لایا ہوگا۔ اسد بٹ سوچ رہا تھا۔

رسل گائے کو ہانکتا نالے کو پار کر کے چڑھائی چڑھنے لگا۔ گائے اس کے آگے آگے تھی۔ وہ منہ سے گائے کو ہانکتے ہوئے آوازیں بھی نکال رہا تھا۔ اوپلوں والی کوٹھڑی کے سامنے آ کر رسل نے گائے کو گھاس چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور خود لکڑیوں کے انبار کے پاس آ کر اس کے اوپر گھاس پھونس ڈالنے لگا۔ پھر ادھر ادھر ایک نظر ڈالی اور آہستہ

سے بولا۔

"میرے دوست! تم موجود ہو ناں؟"

اسد بٹ نے جواب دیا۔ "ہاں۔ میں کوٹھڑی میں ہوں۔"

رسل خاموشی سے لکڑیوں کے انبار پر گھاس پھوس ڈالتا رہا پھر کوٹھڑی کے پاس آ کر باہر بیٹھ گیا اور کوٹھڑی کے دروازے کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ تم عین وقت پر اس طرف آ گئے۔ وہ لوگ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی تلاش میں ہیں۔ انہوں نے آس پاس کے سارے جنگل کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ جگہ جگہ فوجی چوکیاں بنا لی ہیں۔ انہیں تو یقین ہے کہ تم لوگ ابھی اسی جنگل میں کہیں نہ کہیں چھپے ہوئے ہو۔"

اسد بٹ نے پوچھا۔

"تم فوجیوں کو اشارہ کر کے کیا بتا رہے تھے"۔

رسل نے جواب دیا۔

"میں انہیں غلط راہ پر لگانا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ رات میں نے اس طرح سے فائر کی آواز سنی تھی۔ اس کے بعد دوبارہ کوئی آواز نہیں آئی۔ میں چاہتا تھا کہ ڈوگروں کی توجہ ادھر سے ہٹ کے دوسری طرف ہو جائے۔"

اسد بٹ خاموش ہو گیا۔ بوندوں کی ٹپ ٹپ کی آواز کے سوا وہاں کوئی دوسری آواز نہ تھی۔ اسد بٹ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"رسل بھائی! مجھے ہر حالت میں آج رات یہاں سے نکل جانا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ نالہ پیچھے شمال کی طرف کہاں جاتا ہے؟"

رسل بولا۔

"یہ نالہ آگے بٹ مولو کی پہاڑیوں کی طرف جاتا ہے مگر میں تمہیں ابھی یہاں سے جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ڈوگرہ فوج یہاں چپے

چپے پر موجود ہے۔"

اسد بٹ کہنے لگا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں نکل جاؤں گا۔ میرا جانا بہت ضروری ہے۔ تم ایسا کرو کہ مجھے اپنا کوئی پرانا جوڑا لا دو۔ میں دیہاتی حلیے میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

رسل نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے میرے دوست!"

وہ اٹھ کر گائے کے پاس چلا گیا اور اس کی گردن پر ہاتھ پھیر کر کشمیری زبان میں اس سے باتیں کرنے لگا۔

دوپہر کو رسل اوپلوں والی کوٹھڑی میں اسد بٹ کے لئے کھانا لے کر آیا تو اس کے پاس ایک چھوٹی سی گٹھڑی بھی تھی۔ اس میں دیہاتی کپڑے تھے۔

"یہ تم پہن لینا۔ اپنے کپڑے مجھے دے دینا میں کہیں چھپا دوں گا"۔

اسد بٹ بولا۔

"نہیں۔ میں تمہیں یہ خطرہ مول لینے نہیں دوں گا۔ اپنے کپڑوں کی گٹھڑی میں ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ راستے میں کسی کھائی میں پھینک دوں گا۔"

سارا دن بوندا باندی جاری رہی۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ رسل رات کا کھانا لے کر آیا تو اسد بٹ نے اس کے دیہاتی کپڑے پہن رکھے تھے۔

"احتیاط سے جانا۔ اس نالے کی بھی ڈوگرہ ضرور نگرانی کر رہے ہوں گے۔"

رسل نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ اسد بٹ بولا۔

"ہم اس طرح سوچنے لگیں تو کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔ ہمیں خطروں میں کودنے اور وہاں سے نکلنے کی عادت ہو گئی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔"

تھوڑی سی روٹی کھانے کے بعد اسد بٹ نے گھڑی دیکھی ۔ رات کے دس بجنے والے تھے ۔ اس نے کہا ۔

"اچھا دوست! اب میں چلتا ہوں ۔ تمہاری مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ ۔"

رسل نے اسد بٹ کو گلے لگاتے ہوئے کہا ۔

"تم مجاہدوں کے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے ۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو ۔"

رسل کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔ اسد بٹ نے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی بغل میں دبائی ۔ رسل کی دیئے ہوئے کمبل سے منہ سر اچھی طرح سے لپیٹا اور خدا حافظ کہہ کر نالے کی ڈھلان اتر گیا ۔ اس نے نالے کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف چلنا شروع کر دیا ۔ بارش تیز نہیں ہو رہی تھی ۔ یہ بڑی غنیمت کی بات تھی اگر بارش موسلادھار ہو رہی ہوتی تو اسد بٹ کے لئے پہاڑی سفر کرنا مشکل ہو جاتا ۔ بٹ مالو سے آگے بٹ گام تک پہاڑی راستے سے اسد بٹ اچھی طرح واقف تھا ۔ درمیان میں صرف دو پہاڑیاں پڑتی تھیں جنہیں عبور کرنا تھا ۔ یہ شارٹ کٹ راستہ تھا اور اسد بٹ کو یقین تھا کہ اگر راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا تو وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنی پرانی کمیں گاہ میں پہنچ جائے گا ۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں غلطی سے وہ کسی ڈوگرہ گشتی پارٹی کے سامنے نہ نکل آئے ۔ نالہ آگے جا کر دائیں جانب مڑ گیا ۔

رات اگرچہ اندھیری تھی مگر اسد بٹ کی نگاہیں ان اندھیروں کی عادی تھیں ۔ وہ اندھیرے میں بھی اپنی راہ تلاش کر لیتا تھا پھر درختوں جھاڑیوں کے خاکے اسے دھندلے دھندلے دکھائی بھی دے رہے تھے ۔ اسے کئی کئی میل پہاڑی راستوں پر پیدل چلتے رہنے کی مشق تھی ۔ تھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ جب آدمی جوان ہو اور دل میں کسی نیک مقصد کی لگن لگی ہو تو اس کے اندر ایک غیبی طاقت جنم لے لیتی ہے ۔ اسد بٹ بھی اس غیبی یا روحانی طاقت کے بل پر چلا جا رہا تھا ۔ نالے کی چڑھائی شروع ہو گئی تھی ۔ دونوں جانب اس پہاڑی نالے کے کنارے پانچ پانچ فٹ سے بھی زیادہ اونچے تھے اور باہر سے اندر چلتا ہوا آدمی نظر نہیں آتا تھا ۔ ویسے بھی وہ رات کا وقت تھا ۔ اس اندھیرے

میں صرف ایک کمانڈو کی آنکھ ہی دیکھ سکتی تھی ۔ کافی دیر تک اسد بٹ نالے کی ساتھ ساتھ چلتا گیا ۔ ابھی تک کسی ڈوگرہ فوجی پٹرول پارٹی سے اس کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا ۔ کسی طرف سے کسی جیپ یا فائرنگ کی آواز بھی اسے سنائی نہیں دی تھی ۔ نالے کے کنارے دور دور ہٹنے لگے ۔ یہاں تک نالے کا پانی ان پتھروں پر سے بہتا ہوا اوپر سے چلا آ رہا تھا ۔ بوندا باندی اب ہلکی ہو گئی تھی ۔

اسد بٹ نے کھلی جگہ پر آتے ہی چاروں طرف گھور کر دیکھا ۔ وہاں کچھ درخت تھے ۔ ان کے پیچھے چھوٹی بڑی پہاڑیاں اور ٹیلے پھیلے ہوئے تھے ۔ اسد بٹ ان پہاڑیوں کو پہچانتا تھا ۔ اسے ایک خاص پہاڑی درے کی تلاش تھی' جہاں سے ایک شارٹ کٹ راستہ بٹ گام کی وادی کو جاتا تھا ۔ وہ ایک ٹیلے کی طرف بڑھا ۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے وہ درہ نظر آ گیا جو دو پہاڑیوں کے درمیان واقع تھا ۔ یہ ایک تنگ راستہ تھا جس میں سے ایک وقت میں صرف ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا ۔ اسد بٹ درے میں آگے بڑھا ۔ یہ دو تین فرلانگ لمبا تھا اور اس میں کئی موڑ آتے تھے ۔ وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا ۔ اس کے کان اوپر پہاڑی کی چوٹی پر لگے تھے کہ کہیں کوئی ڈوگرہ پارٹی وہاں مورچہ نہ جمائے ہوئے ہو مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی ۔ وہ خیریت سے درے میں سے نکل گیا ۔ اب اس کے سامنے پھر ایک پہاڑ کی چڑھائی تھی ۔ اسد بٹ وہاں ذرا دم لینے کے لے بیٹھ گیا ۔

اس نے گھڑی دیکھی ۔ رات آدھی گزر گئی تھی ۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد وہ دوبارہ چل پڑا ۔ اس طرح سفر کرتے ہوئے دو پہاڑیوں کو عبور کرنے کے بعد رات کے پچھلے پہر اسد بٹ اپنی منزل پر جا پہنچا ۔ وہ ایک ٹیلے پر آیا تو اس کے سامنے نیچے بٹ گام کی وادی پھیلی ہوئی تھی ۔ سرد ہوا میں چنار اور چیڑھ کے درختوں کی ٹھنڈی مہک رچی ہوئی تھی ۔ اسد بٹ نے خدا کا شکر ادا کیا اور وادی میں اترنے لگا ۔ وہ اب اپنے علاقے میں تھا ۔ وادی کی ڈھلانوں پر مکان گہرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ وادی سے نکل کر وہ اپنی کمیں گاہ والی پہاڑی کی چڑھائی چڑھ کر جب دیو پیکر سیاہ چٹان کے سامنے آیا تو جھاڑیوں میں سے دو مجاہدوں نے بجلی کی طرح نکل کر اس کی گردن پر پستول رکھ دیئے ۔ اسد بٹ نے کوڈ ورڈ بولا اور پوچھا ۔

"کیا حاتم اندر ہے؟"

"ہاں" ایک مجاہد نے اسد بٹ سے کہا "حاتم صبح سے تم لوگوں کا انتظار کر رہا ہے۔ مشن کی کامیابی مبارک ہو۔ پل کے اڑنے کی خبر سارے علاقے میں پھیل گئی تھی۔ باقی ساتھی کدھر سے آ رہے ہیں؟"

اسد بٹ نے سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ اب تک نہیں پہنچے تو شاید اب کبھی نہیں آئیں گی۔"

یہ کہا اور اسد بٹ چٹان کی کھوہ والی خفیہ کمیں گاہ میں داخل ہو گیا۔ اندر موم بتی روشن تھی۔ کشمیری مجاہد حاتم کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ بٹ نے اسے جگایا وہ آنکھیں ملتا' کلمہ پڑھتا اٹھا اور اسد بٹ سے زمان' گل میر اور سکندر کے بارے میں پوچھا۔ اسد بٹ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شاید وہ شہید ہو گئے ہیں حاتم۔ ورنہ اب تک پہنچ گئے ہوتے"

حاتم خاموش ہو گیا پھر اس نے مشن کی کامیابی پر اسد بٹ کو مبارک باد دی اور کہا۔

"شہادت کا رتبہ تو نصیب والوں کو ملتا ہے خوشی اس بات کی بھی ہے کہ پل اڑا دیا گیا ہے۔ مجھے بتاؤ پل کا کوئی حصہ بچ تو نہیں گیا؟"

اسد بٹ نے پاؤں پھیلا دیئے اور بولا۔

"نہیں۔ سارے کا سارا پل تباہ ہو گیا تھا۔ میں نے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔ بڑے زور کی فائرنگ ہو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ زمان' سکندر اور گل میر بھی دریا میں کود گئے ہوں گے۔ خدا جانے وہ ایسا کیوں نہیں کر سکے۔ بہرحال ابھی کچھ پتہ نہیں۔ ان کا ہو سکتا ہے کسی وقت آ جائیں یا گرفتار ہو گئے ہوں۔ شہید ہو گئے ہوں۔"

حاتم نے اسد بٹ کو کشمیری چائے گرم کر کے پلائی اور کہنے لگا۔

"تمہیں غفار نے سری نگر کے باہر والے خفیہ ٹھکانے پر بلایا ہے۔ کل شام کو اپنا ایک آدمی آ کر پیغام دے گیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اسد بٹ کو آتے ہی وہاں بھیج دینا کوئی بڑا ضروری کام لگتا ہے۔"

اسد بٹ نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ دیر آرام کر لوں۔"

اس کے ساتھ ہی وہ گہری نیند سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو دن غروب ہو رہا تھا۔ حاتم اس کے لئے ساگ اور روٹی لے کر آ گیا۔ اسد بٹ نے روٹی کھائی اور پوچھا۔

"غفار کے آدمی نے کام کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا تھا؟"

"نہیں" حاتم بولا۔ "بس اتنا ہی کہا تھا کہ اسد آئے تو اسے بھیج دو۔"

اسد بٹ نے کہا۔

"اب رات کو ہی نکلوں گا۔"

حاتم کہنے لگا۔

"ہماری اطلاع کے مطابق وادی میں قابض ڈوگرہ فوج نے تمہاری اور سکندر کی تصویریں چھاپ دی ہیں اور تمہارے سر کے لئے دس ہزار روپے کا انعام بھی رکھ دیا ہے۔"

اسد بٹ مسکرایا۔

"ادھر ایک غدار کو میں نے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ تمہارا کیا خیال وادی کا کوئی مسلمان کشمیری ہمارے ساتھ غداری کر سکتا ہے؟"

"ہرگز نہیں اسد۔" حاتم نے پر جوش لہجے میں کہا۔ "کوئی کشمیری مسلمان ایسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کشمیری مسلمانوں کا بچہ بچہ اس وقت کافروں کے خلاف جہاد کر رہا ہے۔ سری نگر میں تو ڈوگرہ فوج ڈری ہوئی ہے۔ جموں سے کوئی ہندو افسر بھی سری نگر کا رخ نہیں کرتا۔"

"ہاں" اسد بٹ نے کہا۔ "بھارتی فوج کو ایک نہ ایک دن کشمیر خالی کرنا ہی ہو گا۔"

"آزادی کی پرجوش لہر کو اب دبایا نہیں جا سکے گا۔"

رات ہوتے ہی اسد بٹ سری نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس بار وہ ایک خچر پر سوار تھا۔ اس کا حلیہ دیہاتی کشمیریوں والا تھا۔ اس نے ڈاڑھی مونچھیں اور سر کے بال استرے سے بالکل صاف کر دیئے تھے۔ دوسرے دن وہ سری نگر کے مضافات والے باغوں میں پہنچ گیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ یہاں بھی آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ بوندا باندی ختم ہو چکی تھی۔ ایک پہاڑی ڈھلان پر سے ہوتا ہوا وہ جھیل ڈل کے جنوبی باغوں کی طرف چلا جا رہا تھا جہاں مغل بادشاہوں کے زمانے کی ایک پرانی سرائے کا کھنڈر تھا۔ اس کھنڈر کے نیچے ایک کشادہ تہہ خانے میں سری نگر کے علاقے کے حریت پسندوں نے اپنا خفیہ اڈہ بنا رکھا تھا۔ غفار ان مجاہدوں کا سردار تھا۔ اس کے بدن پر کئی زخموں اور جلنے کے نشان تھے۔ اس نے بے شمار معرکے سرانجام دیئے تھے اور بعض مقامات پر ڈوگرہ فوجیوں کا آمنے سامنے مقابلہ کیا تھا۔ ان دنوں کشمیری مجاہد غفار کا خفیہ ٹھکانہ جھیل ڈل کے قریب واقع مغل زمانے کی سرائے کے کھنڈر میں تھا۔ ہم یہاں اس کا محل وقوع اس لئے لکھ رہے ہیں کہ اب یہاں ایک ڈوگرہ رجمنٹ کا آفس ہے۔ چونکہ مجاہدین کشمیر کی جدوجہد آزادی جاری ہے اس لئے ہم نے تمام کمانڈوز کے حلیے' نام اور علاقوں کے نام' ان کی کمین گاہوں کا محل وقوع بالکل فرضی بیان کیا ہے۔ صرف بڑے بڑے شہروں یعنی سرینگر' بارہ مولا' کد' ٹیوت اور گلمرگ وغیرہ کے نام صحیح ہیں باقی سارے نام سارے مقامات فرضی ہیں تاکہ اس کتاب کی وجہ سے کسی ایک مجاہد کی بھی نشان دہی نہ ہو سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اب تک ان میں سے اکثر کشمیری حریت پرست کمانڈوز شہید ہو چکے ہوں اور ان کی جگہ دوسرے مجاہدین نے لے لی ہو۔

بہرحال اسد بٹ (جو کہ ایک فرضی نام ہے) کھنڈر کے قریب واقع باغ میں داخل ہو گیا۔ باغ کے دروازے پر ایک مجاہد سادھو کے بھیس میں دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ اس نے اسد بٹ کو روک کر پوچھا۔

"بچہ کہاں جا رہے ہو۔ ادھر جنگلی ریچھ رہتا ہے۔"

یہ جملہ ایک کوڈ جملہ تھا۔ اس کے جواب میں اسد بٹ نے بھی کوڈ میں جواب دیا۔

"جنگلی ریچھ کل سے بھوکا ہے۔"

یہ خفیہ کوڈ جملہ حاتم نے اسد بٹ کو بتا دیا تھا جو اسے غفار کا بھیجا ہوا آدمی بتا کر گیا تھا کیونکہ یہاں ہر روز کوڈ کا جملہ بدل دیا جاتا تھا۔ صحیح کوڈ سن کر سادھو نے اسد بٹ کو جانے دیا۔ اس نے خچر کھنڈر کے باہر باغ میں چھوڑ دیا اور تہہ خانے میں اتر گیا۔ غفار بڑی بے چینی سے اسد بٹ کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسد بٹ کو دیکھتے ہی گلے لگایا۔ اسے پل کی تباہی کی مبارک باد دی اور باقی ساتھیوں کے بارے میں پوچھا۔ اسد بٹ نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ سب شہید ہو گئے ہیں۔"

غفار نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کلمہ شریف پڑھا اور منہ پر ہاتھ پھیرا۔ تہہ خانے میں ایک موم بتی جل رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک حمائل شریف جزدان میں لپٹی لٹک رہی تھی۔ اسد بٹ نے غفار سے پوچھا کہ اسے کس لئے طلب کیا گیا تھا۔ غفار بٹ نے کہا۔

"اسد! پل کی تباہی کے بعد حالات یہاں بڑی سنگین صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی بھارتی فوج نے سرینگر میں اپنا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ ہم کافروں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے آ رہے ہیں۔ پل کے تباہ ہو جانے سے بھارتی ہائی کمانڈ میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ اسے یقین نہیں تھا کہ ہمارے بہادر کشمیری مجاہد ایسا کر سکیں گے مگر ہم نے یہ کارنامہ بھی کر دکھایا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جموں کی طرف سے وادی پر قابض بھارتی فوج کو اتنی جلدی بھاری اسلحے کی سپلائی نہیں مل سکتی لیکن وادی میں انڈین ٹروپس کے پاس پہلے ہی سے بہت سے ٹینک موجود ہیں جو ہمارا بہت زیادہ نقصان کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس ٹینک شکن میزائل اور راکٹ لانچروں کی تعداد بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہمیں اس وقت ان کی سخت ضرورت ہے تاکہ ہم دشمن کے ٹینکوں کو جتنی جلدی اور جس قدر زیادہ تعداد میں ہو سکے تباہ کر سکیں۔"

اسد بٹ نے کہا۔

"کیا یہ راکٹ اور راکٹ لانچر ہم یہاں بھارتی ایمونیشن ڈپوؤں

سے نہیں چھین سکتے۔"

غفار بولا۔

"یہاں کے جو ایمونیشن ڈپو ہیں ان میں بھی ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کشمیر پر قابض انڈین فوج کے مقابلے میں کوئی ایسی فوج سامنے نہیں ہے جس کے پاس ٹینک بھی ہوں۔ ان کے خلاف تو ہم کشمیری مجاہد بے سرو سامانی کے عالم میں اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور وہ ہمیں اپنے ٹینکوں کی مشین گنوں سے بھون رہے ہیں۔"

"تو پھر یہ اسلحہ ہمیں کہاں سے ملے گا؟ پاکستان تو ہمیں کچھ بھی نہیں دے رہا"۔ اسد نے سوال کیا

اس کے جواب میں غفار کہنے لگا۔

"اسی لئے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ تم شیر سنگھ کو تو جانتے ہی ہو' جو پنجاب میں خالصتان کی تحریک کا ایک سرگرم کارکن ہے۔"

"ہاں ہاں میں اسے جانتا ہوں۔"

"تو سنو" غفار نے کہا۔

"تمہیں اس کے پاس امرتسر جانا ہو گا۔ وہ روپوش ہے۔ پنجاب کی پولیس نے اسے زندہ یا مردہ پکڑ کرلانے والے کے لئے پچاس ہزار روپے انعام کا اعلان کر رکھا ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔ یہ بات تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ سکھ بھی پنجاب میں ہماری طرح بھارتی ظلم و ستم سے نجات حاصل کرنے کے لئے خونیں جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ لاکھوں جانیں خالصتان کے نام پر قربان کر چکے ہیں۔ ان کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ اور ہماری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ پچھلے دنوں ایک سکھ رجمنٹ کے سپاہیوں نے نہتے کشمیری مسلمانوں پر گولیاں چلانے

سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کشمیری مسلمان بھی بھارتی فوج کی غلامی سے اپنے وطن کو آزاد کروانے کے لئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب کشمیر میں کسی سکھ رجمنٹ کو نہیں بھیجا جاتا۔"

اسد بٹ نے کہا۔

"ٹھیک ہے غفار بھائی مگر شیر سنگھ ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔"

غفار بولا۔

"اس نے ہمیں پیغام بھجوایا ہے کہ میں ٹینک شکن راکٹ اور راکٹ لانچر آزادی کشمیر کے نام پر مہیا کر سکتا ہوں۔ مگر اس کے لئے تم لوگوں کو اپنا کوئی خاص آدمی امرتسر بھیجنا ہو گا اور امرتسر سے کشمیر یہ اسلحہ اپنی نگرانی میں لے جانا ہو گا۔ میں نے اسے کہلا بھیجا ہے کہ اسد بٹ تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ اب تم تیاری پکڑو۔ امرتسر جا کر شیر سنگھ سے ملو اور اس سے راکٹ اور راکٹ لانچر لے کر یہاں لے آؤ۔ یہ کام آسان تو نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ تمہارے سوا کوئی دوسرا مجاہد یہ کام خوش اسلوبی اور کامیابی سے کر بھی نہیں سکتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تم پنجابی اور ہندی بڑی روانی سے بول سکتے ہو۔ تم پر کوئی شک بھی نہیں کرے گا کہ تم کشمیری ہو اب بتاؤ۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

اسد بٹ نے سینے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"غفار! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میری جان بھی وطن پاک کی آزادی کی راہ میں حاظر ہے۔"

غفار نے مسکرا کر کہا۔

"مگر اسد بٹ تمہیں زندہ رہنا ہے اور اسلحہ لے کر ہر حالت میں یہاں پہنچنا ہے۔ یہ اسلحہ ہماری تحریک آزادی کو ایک نئی زندگی عطا کرے گا۔"

"میں تیار ہوں لالا! مجھے یہ بتاؤ کہ شیر سنگھ مجھے کہاں ملے گا؟ آخری بار میں اسے چنڈی گڑھ کے ایک پہاڑی گاؤں میں ملا تھا۔"
غفار نے کہا۔

"وہ تمہیں امرتسر کے دربار صاحب کے اندر ملے گا۔ دربار صاحب کے اندر اکال تخت ہے۔ وہاں کسی بھی اکالی نہنگ سے تم شیر سنگھ کا پوچھو گے تو وہ تمہیں بتا دے گا کیونکہ دربار صاحب میں بھارتی پولیس فوج یا انٹیلی جنس والے داخل نہیں ہو سکتے مگر تمہیں سکھ کا حلیہ بنا کر وہاں جانا ہو گا تم تو سکھوں کی گرو بانی بھی پڑھ اور بول لیتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آج شام تم لاری میں بیٹھ کر جموں کی طرف سے امرتسر روانہ ہو جاؤ۔"
اسد بٹ کہنے لگا۔

"لیکن امرتسر سے اسلحہ میں اکیلا کس طرح لاؤں گا؟"
غفار نے کہا۔

"اس کا بندوبست شیر سنگھ کر دے گا۔ وہ صرف تمہارے ساتھ نہیں آ سکے گا۔ باقی وہ سارا انتظام کر دے گا۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تیاری شروع کرتا ہوں۔"
غفار نے اپنے ایک خاص آدمی کو دوسری کمین گاہ میں روانہ کر دیا۔ وہ مجاہد اپنے ساتھ سکھوں والی پگڑی، نقلی ڈاڑھی مونچھیں، کڑا، کرپان، کچھا اور کنگا، تنگ موری والا پاجامہ، کرتا، گرم اچکن اور بوٹ لے کر آ گیا۔ اسد بٹ نے اپنا میک اپ شروع کر دیا۔ حلیہ بدلنے میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ ایک دو گھنٹے کے بعد وہ پورا سکھ بن چکا تھا۔ سر پر سکھوں والی پگڑی، چہرے پر گھنی سیاہ ڈاڑھی اور مونچھیں، بغل میں کرپان کلائی پر کڑا، جسم پر نسواری رنگ کی گرم اچکن ---- پہلی نظر میں غفار بھی اسے نہ پہچان سکا۔

"شاباش اسد تم اس کام میں بھی ماہر ہو۔"

اس نے اسد بٹ کے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "پھر اسے اچھی طرح سمجھایا کہ دربار صاحب امرتسر میں اسے بے حد چوکس رہنا ہو گا کیونکہ وہاں باہر بھارتی جاسوس کتوں کی طرح پھر رہے ہوتے ہیں۔ اب تمہارا نام پرنام سنگھ ہے تم سری نگر میں کاروبار کا جائزہ لینے آئے تھے۔ امرتسر میں تمہاری پلاسٹک کی چھوٹی سی انڈسٹری ہے۔ بس اس سے زیادہ تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔"
سری نگر سے پانچ بجے شام جموں کی طرف آخری لاری جاتی تھی۔ اسد بٹ پرنام سنگھ کے بھیس میں کھنڈر والے خفیہ ٹھکانے کے پیچھے راستے سے نکلا۔ سڑک پر آ کر ٹیکسی پکڑی اور سیدھا لاری اڈے پر پہنچ گیا۔ پانچ بجے جموں جانے والے مسافر لاری میں بیٹھ گئے۔ اسد بٹ بھی اس میں ٹکٹ لے کر بیٹھ گیا۔
دوسرے دن لاری جموں پہنچ گئی۔ کسی کو اسد پر شک نہ ہوا تھا۔ وہ بالکل سکھ معلوم ہوتا تھا۔ جموں لاری اڈے پر اس نے محسوس کیا کہ سی آئی ڈی والے کافی تعداد میں سفید کپڑوں میں ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ اسد بٹ ان لوگوں کی چال پہچانتا تھا مگر وہ پرنام سنگھ کے حلیے میں تھا۔ کوئی اس پر کیوں شک کرتا۔ دوپہر کے بعد جموں سٹیشن سے اس نے جالندھر جانے والی گاڑی پکڑی اور رات ہو رہی تھی کہ جالندھر پہنچ گیا۔ رات اس نے ریلوے سٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں بسر کی۔ رات کو وہ امرتسر نہیں پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ یہ ایسے علاقے تھے کہ یہاں مشتبہ اور نووارد سکھوں پر بھی سی آئی ڈی والے کڑی نظر رکھتے تھے۔ دن کے وقت اس نے ہوڑہ ایکسپریس کا ٹکٹ لیا اور ایک گھنٹے میں امرتسر پہنچ گیا۔ امرتسر شہر اس کے لئے نیا شہر نہیں تھا۔ وہ اس شہر کے گلی کوچوں تک سے واقف تھا۔ پاکستان کے قیام سے پہلے بھی جب وہ چھوٹا تھا تو اپنے مسلمان رشتے داروں کے ہاں آیا کرتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جب کچھ کشمیری ہاتو سری نگر سے امرتسر آ کر مسجد حمزہ اور مسجد جان محمد کے حجروں میں آباد ہوئے تو اسد بٹ بھی ان کے ساتھ تھا۔
دن کے دس بج رہے تھے کہ اسد بٹ پرنام سنگھ کے حلیے میں امرتسر کے سٹیشن سے باہر آیا۔ اس کے پاس کوئی پستول وغیرہ نہیں تھا۔ صرف ایک کمانڈو چاقو تھا جسے اس نے اپنی بنیان کی جیب میں چھپا رکھا تھا۔ سٹیشن سے نکلتے ہی اس نے سائیکل رکشا لیا اور اسے دربار صاحب چلنے کو کہا۔ اسد بٹ نے محسوس کیا کہ امرتسر سٹیشن سے ہی ایک سی آئی

ڈی والا ہندو اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اسے نہ پہچان سکتا مگر اسد بٹ نے فوراً پہچان لیا کہ یہ انٹیلی جینس کا آدمی ہے۔ اس نے کوئی پروا نہ کی اور رکشے میں اطمنان سے بیٹھا رہا۔ رکشا ہال بازار سے ہوتا ہوا کرموں ڈیوڑھی اور بازار مائی سیواں کی طرف جا رہا تھا۔ یہ شہر کا گنجان علاقہ تھا۔ درشنی ڈیوڑھی کے آگے اتنی ٹریفک تھی کہ اسد بٹ نے رکشا چھوڑ دیا۔ اس نے یونہی گردن گما کر پیچھے دیکھا۔ انٹیلی جینس والا ہندو بھی اپنے رکشے سے اتر رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم برابر میرا پیچھا کر رہے ہو۔ اسد بٹ نے دل میں یہ جملہ دہرایا اور بڑے اطمینان سے دربار صاحب کی طرف چل پڑا دربار صاحب کا ماتھا اب کافی کشادہ ہو گیا تھا۔ سامنے ایک چھوٹا سا گھاس کا پلاٹ بنا دیا گیا تھا۔ اسد بٹ نے اپنے جوتے ٹھیکدار کے پاس رکھوا کر ٹوکن لیا۔ چوبچے پر پاؤں دھوئے اور ہاتھ باندھے گروبانی کے شبد پڑھتا سیڑھیاں اتر کر دربار صاحب میں داخل ہو گیا۔

دربار صاحب میں بڑی رونق تھی۔ شردھالو سکھ تالاب میں اشنان کر رہے تھے۔ تالاب کے وسط میں بنے ہوئے سورن مندر میں سے شبد گانے کی سریلی آواز آ رہی تھی۔ اکال تخت دربار صاحب میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں گورو صاحبان کے بڑے قیمتی نوادرات رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نوادرات بھی ہیں جو اس نے دربار صاحب کو پیش کئے تھے۔ اس جگہ بھی تقریباً چوبیس گھنٹے گربانی کا جاپ ہوتا رہتا ہے۔ یہ سکھوں کے پانچ پیاروں کا استھان بھی ہے۔

اسد بٹ نے سکھ شردھالوؤں کی طرح اکال تخت کی چوکھٹ کو ہاتھوں سے چھو کر ہاتھ ماتھے پر لگائے۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لئے اور گربانی پڑھتا کمرے میں داخل ہو کر شو کیس میں رکھے نوادرات کو دیکھنے لگا۔ دوسرے سکھ بھی وہاں موجود تھے۔ اس نے گوشہ چشم سے ایک طرف دیکھا۔ اسے ہندو سی آئی ڈی والا وہاں نظر نہ آیا۔

اسد بٹ نے ایک اکالی نہنگ کو دیکھا جو ایک طرف اوپر جاتی سیڑھیوں کے پاس ننگی تلوار لئے سیدھا کھڑا تھا۔ وہ ست قدم اٹھاتا اس کے پاس آیا۔ ست سری اکال کہا اور شیر سنگھ کے بارے میں پوچھا۔ اکالی نہنگ غور سے اسد بٹ کو دیکھنے لگا۔ "کیا کام ہے تمہیں شیر سیاں سے"

اسد بٹ بولا۔

"اسیں شیر سنگھ دیاں سنگتاں ہیں۔ تم اسے جا کر بتاؤ کہ کشمیر سے اس کا یار پرنام سنگھ آیا ہے۔"

اکالی نہنگ اسد بٹ کو اوپر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں ایک پلنگ پر شیر سنگھ کمبل اوڑھے لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر غور سے اسد بٹ کو دیکھا۔ اکالی نہنگ کو واپس چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اسد بٹ شیر سنگھ کے قریب چلا گیا اور بولا۔

"شیر سیاں۔ اپنے یار اسد بٹ کو نہیں پہچانا"

"اوئے توں ایں بٹا"

اور اس نے اسد بٹ کو سینے سے لگا لیا۔

"یار قسم ہے واگورو کی تم تو بالکل سکھ لگ رہے ہو۔ پہلی بار تو میں بھی چکر کھا گیا تھا۔ آؤ بیٹھو۔ غفار کو میں نے پیغام بھجوا دیا تھا۔ اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔ یہ کام تمہارے سوا دوسرا کوئی کر بھی نہیں سکتا۔ کیا کھاؤ گے؟ یہاں واگورو کی کرپا سے سب کچھ ہے۔ تم کشمیری مسلمان ہو تمہارے لئے ابھی مرغا ذبح کروائے دیتا ہوں۔ یہاں ہمارے کشمیری مسلمان باورچی بھی ہیں۔"

شیر سنگھ دل کھول کر ہنسنے لگا۔ اس نے فوراً اسد بٹ کے لئے دو مرغیاں حلال کرا کے مسلمان باورچی سے پکوائیں۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد شیر سنگھ اسد بٹ کو ایک تہہ خانے میں لے گیا۔ یہاں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"اسد! تم کشمیر کو بھارتی فوجی قبضے سے آزاد کروانے کے لئے اور ہم پنجاب کو ہندوؤں کے قبضے سے نجات دلانے اور پنجاب خالصتان قائم کرنے کے لئے اپنی جان کی قربانیاں دے رہے ہیں۔ اس وقت ہمارے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے سخت غلطی کی جو قائداعظم کا مشورہ نہ مانا اور کانگریسی ہندوؤں کے فریب میں آ کر پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام کروایا۔ پاکستان تو بن گیا اور دن بدن ترقی کر رہا ہے مگر ہم سکھ قوم کی حیثیت سے نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے لیکن اب

ہم بھی ہندو بنئے کی سازشوں اور لوٹ کھسوٹ کے جال سے نکلنے
کے لئے میدان میں آ گئے ہیں ۔ تم دیکھ لینا ۔ ہم بھی ایک دن
خالصتان بنا کر دم لیں گے ۔"

اسد بٹ نے کہا۔

" ہم سکھ رجمنٹ کے ان جوانوں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے
سرینگر میں کشمیری مسلمانوں پر فائرنگ کرنے سے انکار کر دیا تھا اور
ہندو جرنیل کا حکم نہیں مانا تھا۔"

شیر سنگھ بولا۔

" یہ ان کا فرض تھا۔ اس لئے کہ سکھ قوم کو اب احساس ہو گیا ہے
کہ مسلمان حق پر تھے اور کشمیر میں بھی مسلمان اپنے جائز حقوق
کے لئے لڑ رہے ہیں ۔ بھارتی فوج نے کشمیر پر کشمیری مسلمانوں کی
مرضی کی خلاف طاقت کے بل پر قبضہ کر رکھا ہے ۔ نہرو رپورٹ
کے مطابق وہاں رائے شماری کرائی جانی چاہیے لیکن ہندو کبھی ایسا
نہیں کرے گا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اگر رائے شماری ہوئی تو
کشمیر کی ننانوے فی صد آبادی بھارتی قبضے کے خلاف ووٹ دے گی
اور کشمیر ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

اسد بٹ نے کہا۔

" لیکن شیر سنگھ ایسا تو ایک روز ہو کر ہی رہے گا ۔ سچائی کو دنیا کی
کوئی طاقت نہیں دبا سکتی۔ کشمیری مسلمان کشمیر کو بھارتی قبضے سے
آزاد کرا کر ہی دم لیں گے ۔"

اس کے بعد اسد بٹ نے پوچھا کہ اسلحہ کہاں پر ہے اور اس کے کشمیر پہنچانے کا کیا
بندوبست ہو گا۔ شیر سنگھ کہنے لگا۔

" میں نے تمہارے لئے راکٹ لانچروں اور راکٹوں کا اچھا خاصا
ذخیرہ جمع کر رکھا ہے ۔ یہ سارا اسلحہ چنڈی گڑھ سے جموں جانے
والی سڑک سے ہٹ کر ایک گاؤں میں چھپایا ہوا ہے ۔ میں اپنے دو

آدمی تمہارے ساتھ کر دوں گا جو تمہیں سرینگر تک پہنچانے میں
تمہاری مدد کریں گے لیکن ان کے ساتھ تمہیں بھی بڑی ہوشیاری
اور چوکسی سے کام لینا ہو گا۔"

" ہم چنڈی گڑھ آج ہی کیوں نہ چلیں ۔ ہمیں اس اسلحہ کی سخت
ضرورت ہے ۔"

شیر سنگھ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سوچ کر بولا۔

ٹھیک ہے بھاپے ۔ آج رات کی گاڑی امرتسر سے نکل چلیں گے ۔"

امرتسر سٹیشن سے وہ رات کے گیارہ بجے والی گاڑی میں سوار ہوئے یہ ٹرین صرف
لدھیانہ تک جاتی تھی ۔ دونوں الگ الگ ڈبوں میں بیٹھے ۔ اسد بٹ نے شیر سنگھ کو دربار
صاحب میں ہی بتا دیا تھا کہ ایک سی آئی ڈی والا اس کے پیچھے لگا ہوا ہے ۔ رات کو امرتسر
سٹیشن کی طرف جاتے ہوئے وہ مشتبہ شخص اسد بٹ کو کہیں نظر نہ آیا شیر سنگھ نے اسے
تسلی دیتے ہوئے کہا۔

" فکر نہ کرو ۔ اگر وہ ہمارے پیچھے آیا تو جالندھر اس کی زندگی کا
آخری سٹیشن ہو گا ۔ اس کی لاش جالندھر سٹیشن کی لائنوں میں پڑی
ہو گی ۔"

جالندھر ریلوے سٹیشن پر شیر سنگھ اور اسد بٹ جو پرنام سنگھ کے حلیے میں تھا اتر گئے ۔
یہاں اسد بٹ نے بڑی گہری نگاہ سے چاروں طرف دیکھا ۔ اسے سی آئی ڈی والا ہندو
کہیں دکھائی نہ دیا ۔ شیر سنگھ نے کہا۔

" ارے میرے یار ۔ کوئی ہندو پنجاب میں ہماری جاسوسی کرنے کی
جرات نہیں کر سکتا ۔ اب میری طرف ہی دیکھو ۔ میں ایک مفرور
خالصتانی سکھ ہوں ۔ میں نے تھوڑا سا ہی حلیہ بدلا ہے پھر بھی میں
پہچانا جا سکتا ہوں لیکن کسی میں مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوئی
۔ آؤ میرے ساتھ "۔

وہ جالندھر سٹیشن کے ایک قریبی گوردوارے میں چلے آئے ۔ یہاں انہوں نے رات تین

بجے تک وقت گزارا اور پھر ایک لاری میں بیٹھ کر چنڈی گڑھ کی طرف چل پڑے ----
چنڈی گڑھ پہنچتے پہنچتے صبح کی ہلکی ہلکی سفیدی پھیلنے لگی تھی۔ شیر سنگھ نے لاری اڈے سے اسد بٹ کو ساتھ لیا اور جموں جانے والی سڑک پر پیدل ہی چلنے لگا۔ اڈے سے کوئی ڈیڑھ میل دور جا کر وہ سڑک سے اتر گیا۔ یہ پہاڑ کی ترائی کا علاقہ تھا۔ زمین اونچی نیچی اور پتھریلی تھی۔ کھیت بھی تھے۔ وہ ایک تنگ سی گھاٹی میں آ گئے۔ سامنے ایک چھوٹا سا دیہاتی گرودوارہ تھا جہاں خالصتان کے سکھ حریت پرست پہرہ دے رہے تھے۔ انہوں نے شیر سنگھ کو دیکھ کر اپنی رائفلیں نیچی کر لیں اور اسے اندر لے گئے۔ شیر سنگھ نے ایک کوٹھڑی میں پڑا ہوا اسلحہ اسد بٹ کو دکھایا اور کہا۔

"یہ ہے کشمیر کے حریت پسند مجاہدوں کی امانت۔"

کافی تعداد میں راکٹ لانچر اور راکٹ لکڑی کے دو صندوقوں میں بھرے ہوئے تھے۔
اسد بٹ سوچ میں پڑ گیا۔ شیر سنگھ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"بھاپے کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں کہ یہ سرینگر تک پہنچ جائے گا؟" اسد بٹ نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ شیر سنگھ نے اس کا کندھا دبایا اور بولا۔

"یہ تم لوگوں کی امانت ہے اور یہ امانت سرینگر میں کشمیری مجاہدوں تک ضرور پہنچے گی۔"

اس وقت باہر آسمان پر سپیدہ سحر نمودار ہو گیا تھا۔ میں جیسے اس سپیدہ صبح کا ایک حصہ تھا اور فضا میں روشنی کی طرح پھیلا شیر سنگھ اور اسد بٹ کی باتیں بھی سن رہا تھا اور انہیں دیکھ بھی رہا تھا۔ سبز پوش کا ہاتھ میرے کاندھے پر تھا۔ تب سبز پوش نے مجھے آہستہ سے پیچھے ہٹا دیا اور پھر انہی کی پاکیزہ آواز سنائی دی۔

"یہ اسلحہ کشمیری مجاہدوں کے پاس کس طریقے سے پہنچایا گیا؟ یہ تفصیل میں تمہیں نہیں بتاؤں گا کیونکہ تم اسے اپنے افسانہ میں لکھ دو گے اور مقبوضہ کشمیر میں مسلمان کشمیریوں کی خون آلود جنگ آزادی لڑی جا رہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ دشمن کو پتہ چل جائے

کہ کشمیری مجاہدین، کشمیری کمانڈو اپنی جان پر کھیل کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک اسلحہ کس طریقے سے لے جاتے ہیں۔
یہاں سے ہم واپس مقبوضہ کشمیر جائیں گے۔ جہاں اسد بٹ پرنام سنگھ کے حلیے میں شیر سنگھ کے ساتھیوں کے ہمراہ سارا اسلحہ لے کر پہلے سے پہنچ چکا ہے۔ یہ اسلحہ مقبوضہ کشمیر میں ان جگہوں پر کشمیری حریت پرستوں میں تقسیم بھی کر دیا گیا ہے جہاں بھارتی فوج ٹینکوں کی مدد سے آزادی پرست کشمیری مسلمانوں کے مکانوں پر گولے برسا رہی ہے اور مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے۔ آنکھیں بند کر کے میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں مقبوضہ کشمیر میں ایک ایسے مقام پر لئے چلتا ہوں جہاں کفر و اسلام کا معرکہ ہے۔ میں تمہیں اس مقام کا نام نہیں بتاؤں گا میں تمہیں کشمیری مجاہدوں کا نام بھی فرضی بتاؤں گا۔ تم میرے ساتھ رہنا تم اپنی آنکھوں سے جذبہ ایمانی میں سرشار کشمیری حریت پرست مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے پاک نام پر دشمن پر قہر کی بجلیاں بن کر ٹوٹتے دیکھو گے۔ آؤ۔ میرے ساتھ!

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سبز پوش میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر جیسے نورانی فضاؤں میں بلند ہوتا چلا گیا پھر جب سبز پوش نے مجھے آنکھیں کھول دینے کے لئے کہا تو میں نے دیکھا کہ میرے سامنے مقبوضہ کشمیر کے ایک گاؤں کو بھارتی فوج کے تین ٹینکوں نے اپنے محاصرے میں لے رکھا ہے اور ڈوگرہ فوج کے سپاہی گاؤں کی تلاشی لے رہے ہیں۔ انہوں نے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو ایک طرف قطار میں زمین پر بیٹھا دیا ہے اور جوان کشمیری مسلمانوں کو دوسری طرف کھڑا کر دیا ہے۔ ایک ڈوگرہ کیپٹن ہاتھ میں پستول لئے گاؤں کے درمیان کرسی پر بیٹھا تلاشی لینے کی کارروائی کو دیکھ رہا ہے۔ انہیں اطلاع تھی کہ اس گاؤں میں

کشمیری حریت پرست چھپے ہوئے ہیں مگر وہ کیا جانیں کہ مقبوضہ
کشمیر کا مسلمان بچہ بچہ حریت پرست ہے' مجاہد ہے کمانڈو ہے اور
کشمیر کی آزادی اور اسلام کے لئے ہر وقت اپنی جان قربان کرنے
اور دشمن کی جان لینے پر تیار ہے۔ ڈوگرہ کیپٹن نے بلند آواز میں
اپنے سپاہیوں سے کہا۔

"اچھی طرح سے تلاشی لو۔ ان باغیوں نے یہاں ضرور کسی جگہ
اسلحہ چھپایا ہوا ہے۔"

مگر کسی مکان سے کوئی اسلحہ برآمد نہ ہو سکا۔ اس پر ڈوگرہ کیپٹن نے جن کشمیری جوان آدمیوں کو قطار میں الگ کھڑا کیا ہوا تھا ان کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھا۔ کرسی سے اٹھ کر ان کے پاس آیا اور ایک ایک کو گھور کر تکتا چلا گیا پھر ریچھ کی طرح غرا کر بولا۔

"بہتر یہ ہے کہ تم میں جو دہشت گرد کشمیری مسلمان ہے وہ خود ہی
قطار سے آگے نکل آئے ورنہ تم سب کو شوٹ کر دیا جائے گا۔
ادھر دیکھو وہ سامنے ہمارے تین ٹینک کھڑے ہیں ان میں سے ایک
ٹینک کی مشین گن کی نالی تمہاری طرف ہے۔ میرے ایک
اشارے کی دیر ہو گی کہ ٹینک کی مشین گن کا برسٹ تم سب کو
بھون کر رکھ دے گا لیکن نہیں۔ اس سے پہلے ہم تمہاری عورتوں
کو اذیتیں دے کر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہلاک کریں گے۔"

ڈوگرہ کیپٹن کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دو فوجیوں کو اشارہ کیا۔ وہ عورتوں میں سے ایک کشمیری عورت کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کیپٹن کے سامنے لے آئے۔ کشمیری عورت سہمی ہوئی تھی اور منہ میں اللہ کے نام کا ورد کر رہی تھی۔ دوسری عورتیں' بچے اور بوڑھے ایسے چپ تھے جیسے موت کا رقص شروع ہونے والا ہو۔ قطار میں کھڑے کشمیری جوانوں کا خون کھول رہا تھا۔ وہ اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ ڈوگرہ کیپٹن نے کشمیری عورت کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ کر گرجا۔

"میں تین تک گنتی کروں گا۔ اگر تم میں سے جو دہشت گرد ہیں
انہوں نے اپنے آپ کو ظاہر نہ کیا تو میرے پستول کی ساری گولیاں
اس عورت کی کھوپڑی میں سے گزر جائیں گی"

ایک سناٹا چھا گیا۔ سب کی نظریں ایک ہی طرف لگی تھیں۔ ڈوگرہ کیپٹن نے گنتی شروع کر دی۔

"ایک ------------ دو ------------

فضا موت کی طرح خاموش ہو گئی تھی جونہی اس کے منہ سے تین کا لفظ نکلا فائر کا ایک دھماکہ ہوا۔ سب نے یہی سمجھا کہ فائر ڈوگرہ کیپٹن کے پستول سے ہوا ہے مگر ایسا نہیں تھا ۔ یہ فائر کشمیری مجاہد جہانگیر نے اپنی رائفل سے کیا تھا جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوا تھا گولی ڈوگرے کیپٹن کی پشت پر لگی اور اس کے دل اور سینے کے پرخچے اڑاتی آگے سے نکل گئی جب وہ آگے کو گرا تو سپاہیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے فائر کھول دیا مگر گھات لگا کر بیٹھے ہوئے کشمیری مجاہدوں نے ان ڈوگروں کو پہلے ہی سے اپنی زد میں لے رکھا تھا ۔ ان کی برین گنوں نے شرارے اگلنے شروع کر دیے اور انگارے بنی گولیوں کے برسٹ ان کو چھلنی کرتے چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ ڈوگرہ فوجیوں کی گولیاں کشمیری جوانوں اور عورتوں کو شہید کرتیں وہ خود خون میں لت پت خاک میں پڑے تڑپ رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے مکانوں کے پیچھے جا کر چھپ گئے۔ ڈوگرہ ٹینک حرکت میں آ گئے۔ ان کی مشین گنیں اور توپیں فائر کرنے لگیں۔ گولے گاؤں کے مکانوں پر گرے اور مکانوں کی چھتیں اچھل کر بکھر گئیں۔ گرد و غبار کا اٹھا۔ اسد بٹ اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے راکٹ لانچر اٹھا لئے۔ ان میں راکٹ پہلے سے بھر دیئے گئے تھے۔ گاؤں کے درختوں کی اوٹ سے راکٹ لانچروں سے نکل کر لانچر ٹینکوں سے ٹکرا کر پھٹے اور ٹینک دھماکوں سے پھٹ گئے۔

کشمیری مجاہد نعرے لگاتے فائرنگ کرتے درختوں کے پیچھے سے نکل آئے۔ انہوں نے بھاگتے ہوئے ڈوگرہ فوجیوں کو بھی موت کی نیند سلا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہاں موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔ اسد بٹ' جہانگیر' غفار اور احد بٹ نے گاؤں کے درمیان آ کر دیکھا کہ دشمن کے تینوں ٹینک جل رہے تھے۔ اس کے اندر جو

ڈوگرہ فوجی تھے وہ بھی جل چکے تھے جگہ جگہ دشمن کے سپاہیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ڈوگرہ کیپٹن کی لاش بھی خاک پر اوندھی پڑی تھی۔

اسد بٹ نے گاؤں والوں کو مخاطب کر کے کہا۔

☆ "بھائیو! بہنو! ہمیں جو کرنا چاہئے تھا وہ ہم نے کر دیا ہے۔ ہم اس وقت تک اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ایسا کرتے رہیں گے جب تک مقبوضہ کشمیر کو بھارتی فوجی قبضے سے آزاد نہیں کرا لیتے مگر تم لوگوں کا اب اس گاؤں میں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ دشمن اب زیادہ طاقت کے ساتھ یہاں حملہ کرے گا اور وہ ایک بھی گھر سلامت نہیں چھوڑے گا تم لوگ بھی کشمیر کی جنگ آزادی میں ہمارے ساتھ برابر کے شریک ہو۔ تمہیں بھی مصیبتیں جھیلنی ہیں تمہارے بچوں کو شہادت کے جام پینے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ تم جتنی جلدی ہو سکے اس گاؤں کو چھوڑ کر یہاں سے دور دراز علاقوں میں بکھر جاؤ۔ یہ وادی ہماری ہے۔ یہ زمین ہماری ہے۔ یہ زمین ہمیں کہیں بھی پناہ دے دے گی۔ مگر تم لوگ اب اس گاؤں میں نہیں رہو گے۔ ہم یہاں تمہاری حفاظت کے لئے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ ہمیں دشمن سے جنگ کرنے کسی دوسرے محاذ پر بھی جانا ہے۔ ہم تو اپنی موت کو ساتھ لئے لئے پھرتے ہیں مگر تمہیں زندہ رہنا ہے۔ اس وادئ جنت نظیر کے کھیتوں کو لہلہاتا رکھنا ہے۔ ضروری سامان اٹھاؤ اور ابھی اس گاؤں سے ہجرت کر جاؤ۔ اگر میدان جنگ تمہارے گاؤں میں نہ ہوتا تو ہم تمہیں کبھی یہاں سے ہجرت کرنے کے لئے نہ کہتے مگر اس میدان جنگ میں دشمن کی لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔ اب یہاں سے تم لوگوں کا کوچ کر جانا ہی بہتر ہے۔ خدا تمہارا نگہبان ہو۔ ہماری کامیابی اور آزادئ کشمیر کی فتح کی دعا کرنا ——— نعرۂ تکبیر!"

گاؤں کے سب جوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں نے ایک آواز ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور تیزی سے اپنے اپنے ضروری سامان کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد گاؤں کے سارے پندرہ سولہ مکان خالی ہو چکے تھے اور گاؤں کے لوگ پہاڑیوں میں غائب ہو گئے تھے۔ غفار نے اسد بٹ کے قریب آ کر کہا۔

"اب ہمیں بھی اپنے کسی دوسرے محاذ پر جنگ کرنے کے لئے نکل جانا چاہیے۔"

اسد بٹ نے جہانگیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جہانگیر راکٹ لانچر خچر پر لادو۔ ہم ڈوگرہ ٹینک رجمنٹ کے گیریزن پر شب خون ماریں گے۔"

اور مجاہدین خچر پر راکٹ لانچر اور راکٹ وغیرہ لاد کر ڈوگرہ گیریزن کی طرف چل پڑے۔

سارا دن وہ مقبوضہ کشمیر کی دشوار گزار پہاڑیوں میں خاص خاص خفیہ پہاڑی راستوں پر سفر کرتے رہے شام ہو رہی تھی کہ وہ ڈوگرہ ٹینک رجمنٹ کے گیریزن کے عقب میں پہنچ گئے۔ یہاں جنگلی جھاڑیوں اور چھتنارے دار درختوں کی بھرمار تھی۔ وہ ان درختوں میں ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گئے۔ غفار نے کہا۔

"ہمیں اپنے آدمی کو بھیج کر ڈوگرہ ٹینکوں کی پوزیشنیں معلوم کرنی ہوں گی۔"

اسد بٹ بولا۔ "یہ کام میں کروں گا"۔

جہانگیر اور دوسرے مجاہد نے بھی اپنے آپ کو پیش کیا مگر اسد بٹ نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کر دیا کہ وہ اس علاقے سے پوری طرح واقف ہے اور ایک خفیہ پہاڑی راستے سے دشمن کے گیریزن میں داخل ہو گا۔ احد نے کہا۔

"تمہیں یہ کام شام ہونے سے پہلے پہلے ختم کرنا ہو گا اسد۔ بہتر ہے کہ تم اس وقت نکل جاؤ۔"

اسد بٹ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی سے تیار تھا چنانچہ اس نے ایک پستول اور چاقو اپنے پاس رکھا اور جاسوس مشن پر نکل کھڑا ہوا۔ دشمن کا یہ گیریزن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہاں صرف دو بٹالین فوج تھی اور تھوڑے سے ٹینک تھے۔ اسد بٹ کو یہ معلوم کرنا تھا کہ دشمن رات کے وقت ان ٹینکوں کو کس جگہ کیموفلاج کرتا ہے۔ دشمن کو اس بات کا خطرہ تھا کہ کشمیری کمانڈو رات کے اندھیرے میں اس کے ٹینک تباہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے دن کے وقت تو یہ ٹینک اپنی پوزیشنوں پر ہوتے مگر رات کا اندھیرا ہوتے ہی انہیں خاص جگہوں پر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

اسد بٹ ان چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں سے اچھی طرح واقف تھا وہ ایک خطرناک کھائی کے کنارے کنارے پگ ڈنڈی پر سے گزر کر اس ٹیلے کے پہلو میں آ گیا جہاں سے ایک

بے حد تنگ راستہ ڈوگرہ گیریزن کے عقب میں جا نکلتا تھا۔ یہ تنگ سا راستہ خاردار جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا مگر یہ دلیر کشمیری کمانڈو اپنے لمبے چاقو کی مدد سے راستہ صاف کرتا درے میں سے گزر گیا۔ جونہی وہ ٹیلے کی دوسری طرف کھلی جگہ پر آیا اسے گیریزن کے گرد لگائی گئی خاردار باڑ نظر آئی۔ اس وقت شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا اور گیریزن میں جگہ جگہ کھمبوں پر بجلی کے بلب روشن ہو گئے تھے۔ یہ بجلی ڈوگرہ بٹالین کے اپنے جنریٹر پیدا کرتے تھے۔ اسد بٹ ایک جگہ گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ کر گیریزن کے اندر کھڑے فوجی ٹرکوں اور جیپوں کو دیکھنے لگا۔ اسے ٹینک کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ڈوگرہ فوجی ادھر ادھر دکھائی دیتے تھے۔ چھ سات فوجی ہاتھوں میں مگ لئے لنگر کی طرف جا رہے تھے جہاں کھانا تقسیم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اسد بٹ کی نگاہیں ٹینکوں کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ یہ ٹینک دشمن نے شروع شام ہی میں کہیں چھپا دیئے ہیں تو پھر انہیں شب خون مار کر ہٹ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ضروری تھا کہ یہ کشمیری مجاہد اپنی آنکھوں سے ٹینکوں کو اپنے اپنے ٹھکانوں پر کیموفلاج ہوتا دیکھے۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک ٹینک انجن کے سٹارٹ ہونے اور پھر اس کے چلنے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اسد بٹ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ ایک دیو ہیکل سیاہ رنگ کا ٹینک درختوں کے پیچھے اپنے مورچے سے نکل کر آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو مزید ٹینک سٹارٹ ہو کر رینگتے ہوئے آ رہے تھے۔

یہ تینوں ٹینک خاردار باڑے سے کچھ فاصلے پر تھوڑی تھوڑی جگہ چھوڑ کر چنار کے گھنے درختوں میں آ کر رک گئے۔ ان پر سبز رنگ کے جال پھیلا دیئے گئے۔ ایک ایک فوجی وہاں گارڈ ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔

اس طرح کوئی پندرہ بیس قدموں کے فاصلے پر تین مزید ٹینک درختوں کے نیچے لا کر کھڑے کر دیئے گئے۔ وہاں بھی ایک ایک ڈوگرہ سپاہی گارڈ ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔ اسد بٹ وہیں چھپا رہا۔ یہاں تک کہ شام کا اندھیرا رات کی سیاہی میں گھل مل گیا۔ گیریزن کی بارکوں میں فوجیوں کی آوازیں ڈوبنے لگیں۔ اس کا خیال تھا کہ شاید مزید ٹینک وہاں آئیں گے مگر کافی دیر وہاں چھپے رہنے کے بعد بھی مزید کوئی ٹینک نہ آیا تو وہ سمجھ گیا کہ گیریزن میں صرف چھ ٹینک ہی ہیں۔ اب وہ واپس مڑا۔ وہ رینگتا ہوا پیچھے چلا اور تنگ

درے سے گزر کر اپنے مجاہدین کے پاس واپس آ گیا۔ وہ لوگ ایک جگہ چھپے اس کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اسد بٹ نے انہیں بتایا کہ دشمن کے پاس گیریزن میں صرف چھ ٹینک ہیں۔ اس نے ٹینکوں کی پوزیشنیں بھی بیان کر دیں۔ غفار بولا۔

"یہاں بھارتی فوج کا ایمونیشن ڈپو بھی ضرور ہو گا۔"

اسد بٹ نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"مجھے وہاں کوئی ڈپو دکھائی نہیں دیا۔ ہو سکتا ہے وہ گیریزن کے باہر کسی پہاڑی میں ہو لیکن اس وقت ہمارا مشن ان ٹینکوں کو تباہ کرنا ہے اور ہمیں صرف اس مشن کو سامنے رکھنا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے آپس میں ڈیوٹیاں بانٹ لیں۔ اسد بٹ نے کہا۔

"ہم میں سے تین سب سے پہلے ایک ایک ٹینک کو ہٹ کریں گے۔ اس کے بعد کام مشکل ہو گا اور ہمیں دوسرے تین ٹینکوں کو تباہ کرنے کے لئے پندرہ بیس قدموں کا فاصلہ بھاگ کر طے کرنا ہو گا۔ اس وقت تک دشمن ہوشیار ہو چکا ہو گا اور اس نے اندھا دھند فائر کھول دیا ہو گا لیکن ہمیں ہر حالت میں باقی کے تین ٹینکوں کو بھی ہٹ کرنا ہو گا کسی کو کوئی بات پوچھنی ہو تو پوچھ لے۔"

غفار نے کہا۔ "ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تم جس طرح کہو گے ہم اسی طرح کریں گے۔"

جہانگیر اور احد بٹ نے بھی غفار کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اسد بٹ نے اپنی جیکٹ کی زپ اوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہمیں اسلحہ چیک کر لینا چاہیے۔ رات کے ٹھیک بارہ بجے ہم اپنے مشن پر چل پڑیں گے۔"

سب مجاہد اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئے۔ راکٹ لانچروں میں لانچر چڑھا کر انہوں نے اپنے اپنے تھیلے میں رکھ لئے تھے۔ ہر ایک کے پاس چار چار ہینڈ گرنیڈ بھی تھے۔ کمانڈو چاقو اور پستول تو ہر کمانڈو کے پاس ہر وقت موجود رہتا تھا۔ برین گنیں انہوں نے

اپنے کاندھوں پر ڈال رکھی تھیں۔ گیارہ بجے رات تک وہ اپنے مشن کی تفصیلات پر غور کرتے رہے پھر انہوں نے دو دو نفل ادا کئے اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے مشن کی کامیابی کے لئے دعا مانگی۔ غفار نے قران مجید کی ایک آیت تلاوت کی جس میں جہاد کا ذکر تھا۔ اس کے بعد انہوں نے تھیلے خچر پر رکھے اور اپنے ٹارگٹ کی طرف کوچ کر گئے۔

جس وقت وہ ڈوگرہ گیریزن کے عقب میں خاص دشوار گزار تنگ درے کے پاس پہنچے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ رات بڑی تاریک تھی۔ یہاں انہوں نے خچر کو واپس بھگا دیا اور تھیلے اپنے اپنے کاندھوں پر رکھ لئے۔

اسد بٹ نے سر جوڑ کر انہیں سرگوشیوں میں سمجھایا کہ درے کے پار دوسری طرف دشمن کے گیریزن کی خاردار دیوار ہے اور اب ہم صرف اشاروں میں بات کریں گے۔ پھر وہ تنگ پہاڑی درے میں داخل ہو گئے۔ اسد بٹ نے پہلے ہی سے خاردار جھاڑیوں کو کاٹ کر وہاں راستہ بنا دیا ہوا تھا۔ آگے آگے اسد بٹ تھا پیچھے غفار اور احد بٹ اور جہانگیر چلے آ رہے تھے۔

گیریزن کی روشنیاں درے سے نکلتے ہی نظر آ گئیں۔ وہ سب وہیں بیٹھ گئے۔ گھاس شبنم کی وجہ سے گیلی ہو رہی تھی۔ گیریزن کی بارکوں کے باہر بلب روشن تھے۔ اسد بٹ نے اشارے سے انہیں وہ درخت دکھائے جن کے نیچے دشمن کے ٹینک کھڑے تھے۔ درخت سیاہ بڑے بڑے دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اسد بٹ نے سرگوشی میں کہا۔

"دشمن کی گن پوسٹیں ہمارے دائیں بائیں اور اوپر بھی ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنے اپنے ٹارگٹ کی طرف اکیلے جائیں گے اور اپنی اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق اپنے حکم سے فائر کریں گے اور ٹارگٹ تباہ کریں گے۔"

وہ رینگنے لگا۔ تینوں کشمیری مجاہد بھی اس کے پیچھے پیچھے رینگتے خاردار باڑ کے قریب پہنچ کر رک گئے، اسد بٹ نے جیب سے پلاس نکال کر تار کو دو تین جگہ سے بڑی احتیاط سے کاٹ کر ایک آدمی کے گزرنے کا راستہ بنا دیا۔ باری باری چاروں کشمیری مجاہد خاردار باڑ میں سے گزر گئے۔ وہ زمین پر سینے کے بل لیٹے تھے، صرف گردنیں اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ اسد بٹ نے سب کو ایک بار پھر اشارے سے ٹینکوں والے درخت دکھائے۔ وہ

اپنے اپنے ٹارگٹ کی طرف رینگتے رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ اسد بھی اپنے ٹارگٹ کی طرف رینگنے لگا۔ وہ گھاس میں رینگتا درخت کے قریب آ گیا۔ یہاں دور بارک کے باہر جلتے بلب کی ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی جس میں اسے ڈوگرہ سپاہی ادھر ادھر ٹہلتا نظر آیا۔ درخت کے نیچے بہت بڑا ٹینک اسے دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی ہاتھی جنگل میں درخت کے نیچے سو رہا ہو۔

اسد کو معلوم تھا کہ اس کے دوسرے ساتھی بھی اپنے اپنے ٹارگٹ کے سامنے پہنچ گئے ہوں گے اور اب کسی بھی وقت ٹینک شکن راکٹ کے دھماکے شروع ہونے والے تھے اور اس کے بعد وہاں چھوٹی سی قیامت برپا ہونے والی تھی۔ یقینی بات تھی کہ دشمن لائیٹ راؤنڈ فائر کرے گا جس سے سارا علاقہ دن کی طرح روشن ہو جائے گا۔ اب دیر کرنے کے لئے وقت نہیں تھا۔ سوچنے کے لئے بھی وقت نہیں تھا۔ اسد بٹ نے لانچر سیدھا کیا۔ خود گھٹنوں کے بل نیل ڈاؤن ہو کر راکٹ کو اپنے کاندھے پر رکھ کر درخت کے نیچے کھڑے ٹینک کے بہت بڑے سیاہ دھبے کا نشانہ لیا اور اللہ کا نام لے کر راکٹ فائر کر دیا۔ ایک شراٹے کی آواز کے ساتھ راکٹ اپنے لانچر سے نکلا اور سیدھا ٹینک میں جا کر لگا۔ شعلہ اور دھماکہ ایک ساتھ بلند ہوا اور ٹینک پھٹ گیا اور اس میں آگ لگ گئی۔

اسی لمحے آس پاس بھی راکٹوں کے دھماکوں کی گرج سنائی دی۔ دوسرے مجاہدوں نے بھی اپنے اپنے ٹارگٹ ہٹ کر دیئے تھے۔ درختوں کے نیچے شعلے بلند ہو رہے تھے گیریزن میں شور مچا ہوا تھا۔ چاروں طرف سے مشین گن کے فائر آنے لگے تھے۔ ڈوگرے فوجی ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ویری لائیٹ راؤنڈ فضا میں اوپر جا کر پھٹے اور چاروں طرف ان کی روشنی پھیل گئی۔ اسد بٹ کو اب ان کی پروا نہیں تھی۔ اسے اپنی جان کی بھی پروا نہیں تھی۔ وہ دوسرے ٹینک کی طرف دوڑا۔ سامنے آ کر گھٹنوں کے بل جھکا اور لانچر سے راکٹ فائر کر دیا۔ یہ ٹینک بھی شعلوں میں بدل گیا۔ اس نے اپنے حصے کے دونوں ٹینک اڑا دیئے تھے۔ اب اسے واپس نکل جانا تھا۔ یہی طے ہوا تھا کہ اپنا اپنا ٹارگٹ اڑانے کے بعد وہ وہاں سے اپنی عقل کے مطابق نکل جائیں گے اور پہاڑی جنگل میں ایک خاص جگہ پر ملیں گے۔ غفار، احد بٹ اور جہانگیر اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد وہاں سے نکل گئے تھے۔

اسد بٹ بھی رینگتا ہوا واپس مڑا تو ایک وری لائیٹ راؤنڈ فائر ہوا۔ وہ فضا میں جا کر پھٹا۔ اس کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی پھر وہ آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔ اس کی روشنی میں اسد بٹ کی نگاہ ایک طرف اٹھی تو اسے وہاں زمین ایک بہت بڑی قبر کی طرح ابھری ہوئی نظر آئی۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ ایمونیشن ڈمپ ہے۔ اس نے ہینڈ گرنیڈ ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ خالی لانچر اور برین گن سلنگ کے ساتھ اس کے کاندھے پر پڑی تھی۔ وہ ایمونیشن ڈمپ کی طرف رینگنے لگا۔ ایمونیشن ڈمپ کو باہر سے چار انچ دہانے کی توپ کا گولہ بھی گرے تو مشکل ہی سے اڑا سکتا ہے کیونکہ ایمونیشن زمین کے اندر کافی گہرائی میں ہوتا ہے۔ اس کے اندر جانے کا ایک راستہ ہوتا ہے جو پہاڑی غار کی طرح بنایا جاتا ہے۔ اس کے اندر کوئی ماہر سے ماہر کمانڈو بھی اتنی آسانی سے داخل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں روشنی کافی کی گئی ہوتی ہے اور پھر زبردست گارڈ موجود ہوتی ہے۔ مگر اسد بٹ نے دشمن کے گولہ بارود کے گودام کو اڑا کر شہید ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ موت کے فرشتے کو بھی حیرت زدہ کئے ایمونیشن ڈمپ کی طرف تیزی سے رینگتا گیا۔ اسے ڈمپ کے چھوٹے سے ٹیلے کی بائیں جانب سے روشنی آتی دکھائی دینے لگی۔ یہ ڈمپ کا دروازہ ہی ہو سکتا تھا۔

وہ اس کی طرف بڑھا۔ گریزن میں چاروں طرف فائر ہو رہا تھا۔ مشین گن کی گولیاں شور مچاتی اڑ رہی تھیں۔ روشنی کے راونڈ فائر ہو رہے تھے۔ وہاں دن کا سماں پیدا ہو گیا ہوا تھا۔ گھاس کا ایک ایک تنکا نظر آنے لگا تھا۔ اچانک گولیوں کی بوچھاڑ اسد بٹ کے قریب سے زمین کو ادھیڑتی ہوئی گزر گئی۔ اسے کسی گن پوسٹ نے دیکھ لیا تھا۔ اسد بٹ اٹھ کر ایمونیشن ڈمپ کی طرف دوڑا مگر یہ اس سے غلطی ہو گئی تھی۔ وہ جوش میں تھا۔ اچانک گن پوسٹ پر لگی مشین گن کا برسٹ اسد بٹ کے پہلو میں آ کر لگا اور اس کے پیٹ کو کاٹتا ہوا نکل گیا۔ وہ گر پڑا۔ خون کے پرنالے بہنے لگے۔ اسد بٹ کو کوئی درد نہیں ہوا۔ اسے لگا جیسے گولیاں اسے نہیں لگیں۔ وہ اٹھا۔ اس نے دوڑتے ہوئے گرنیڈ کا سیفٹی پن کھینچ دیا اور اسے ڈمپ کے دروازے کی طرف پھینکا۔ ڈوگرہ گارڈز نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ زمین پر لیٹ گئے اور اسد بٹ پر فائر کھول دیا۔ بیک وقت مشین گنوں کے تین چار برسٹ اسد کو آ کر لگے اور اس کا جسم چھلنی ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے

نور کی مہتابیاں سی پھوٹنے لگیں۔ وہ زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس کا چھلنی جسم خون میں نہلا گیا تھا۔ نور کی روشنیاں اس کے چاروں طرف اتر رہی تھیں پھر ان روشنیوں نے جیسے اسد بٹ کو اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ خود روشنی بن کر اوپر کو اٹھنے لگا۔

اسد بٹ شہید ہو چکا تھا۔

میں یہ سارا ایمان افروز منظر دیکھ رہا تھا۔ سبز پوش کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔ پھر اس کی پاکیزہ شفیق اور دل کو گرما دینے والی آواز سنائی دی۔

"اسد بٹ کے خون نے کشمیر کی زمین پر اپنے خون سے آنے والوں کے لئے نشان بنا دیئے ہیں۔ یہی وہ نشان ہیں جن پر چلتے ہوئے مقبوضہ کشمیر کے مسلمان مجاہد کلمہ حق کا ورد کرتے ہوئے اپنی سرزمین پر قابض دشمن کو ایک دن عبرت ناک شکست دیں گے اور وادی پر ان کی آزادی کا اسلامی پرچم لہرانے لگے۔ تم اخبار نویس ہو۔ اب تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ تمہارا کام واپس جا کر شروع ہو گا۔ واپس جاؤ اور اپنے اخبار میں ان شہیدوں کے بارے میں کچھ نہ لکھو۔ تم شہیدوں کے بارے میں کیا لکھ سکتے ہو۔ دنیا کی کوئی زبان ان شہیدوں کے جذبوں کو قلمبند نہیں کر سکتی۔ اگر ہو سکے تو اسد بٹ کے خون میں رچی ہوئی تھوڑی سی مٹی اپنے ساتھ لے جاؤ اور جب تمہیں شہیدوں کے خون میں رچی اس مٹی سے تکبیر کی آواز سنائی دے گی۔ تم اس میں سے اسلام کا ایک درخشاں، جگمگاتا، روشن اور آنکھوں کو نور کی تجلیوں سے منور کر دینے والا سورج طلوع ہوتا دیکھو گے، پھر تمہیں محسوس ہو گا کہ تمہاری مٹھی میں مٹی نہیں ہے بلکہ کائنات کے ازلی اور ابدی نور کے ذرات ہیں جن میں تخلیق کائنات کی بجلیاں کوند رہی ہیں اور تم پر ایک بار پھر یہ راز بھی کھل جائے گا کہ ہم سبز پوش اس خطے پر ان مسلمان مجاہدوں ان راہ حق کے شہیدوں کی زیارت کرنے کیوں آتے تھے ——————"

میں شہید کی طرف بڑھا اور میں نے اس کے خون میں رچی ہوئی مٹی اٹھائی تو مجھے چاروں طرف سے کلام پاک کی تلاوت کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور ساری فضا جنت کی خوشبوؤں سے معطر ہو گئی۔ میں قبلہ رو ہو کر سجدے میں گر پڑا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔